خطبات

پروفیسر عبداللہ ناصر رحمانی حفظہ اللہ

عالمِ اسلام کے معروف مذہبی سکالر اور عالمِ ربانی
کے پُرتاثیر، حکیمانہ اور اصلاحی خطبات

ترتیب، تسہیل وتخریج
قاری طارق جاوید عارفی
حافظ شبیر صدیق

دار السلام
DARUSSALAM

مضامین

عرضِ ناشر

اسلام اللہ رب العزت کا پسندیدہ آفاقی دین ہے جو عالم گیر انسانیت کے لیے ایسی کامل زندگی پیدا کرنی چاہتا ہے جس میں دنیا اور آخرت دونوں کی سعادتیں جمع ہو جائیں۔ یہ سعادتیں صرف دینِ حق کی صحیح تعلیمات، ایمان کی مضبوطی اور پاکیزہ اعمال کی بدولت نصیب ہوتی ہیں۔ اسلام کی اصل تعلیمات کیا ہیں؟ اللہ کی ذاتِ بابرکات پر ایمان کس طرح مضبوط ہوتا ہے؟ اور اعمالِ صالحہ کس طرح ظہور میں آتے ہیں؟ یہ وہ بنیادی موضوعات ہیں جو فضیلۃ الشیخ پروفیسر عبداللہ ناصر رحمانی ﷾ کے فکر ونظر کا خصوصی مرکز ومحور ہیں۔

مولانا موصوف جلیل القدر عالم دین اور محدث ہیں، عظیم الشان خطیب اور درد مند داعی الی اللہ ہیں۔ عرب وعجم کے علمی اور عوامی حلقوں میں یکساں مقبول ہیں۔ ان کے تمام مواعظ وارشادات قرآن وسنت کے علوم عالیہ کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ وہ میٹھے لہجے میں بولتے ہیں اور جوں جوں بولتے جاتے ہیں اُن کی یہ تڑپ اور طلب بیدار ہوتی چلی جاتی ہے کہ دین حنیف کی تعلیمات سامعین کے دلوں میں اُتر جائیں اور حُسنِ عمل کے برگ وبار لائیں۔ ''خطبات پروفیسر عبداللہ ناصر رحمانی ﷾'' کے عنوان سے زیر نظر کتاب انھی کے مواعظ عالیہ کا مجموعہ ہے، جو مدیر دارالسلام لاہور حافظ

عبدالعظیم اسد کی سعی جمیل سے منظر عام پر آرہی ہے۔ محترم قاری طارق جاوید عارفی صاحب نے اس کی ترتیب وتصحیح اور تسہیل وتخریج کی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ تقریر اور تحریر کے اسلوب جداگانہ ہوتے ہیں۔ پروفیسر عبداللہ ناصر رحمانی ﷾ کی یہ تقریریں سی ڈیز کی شکل میں محفوظ تھیں۔ حافظ شبیر صدیق صاحب نے انھیں قرطاس پر منتقل کیا اور اس کے ایک حصے کی تخریج بھی کی۔ مولانا سلیم اللہ زمان نے اس پر نظر ثانی فرمائی اور اسلوب کو مزید نکھارا۔ مولانا صداقت اکرام نے پروف پڑھے۔

اس کتاب کے موضوعات ہی سے اس کی زبردست اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ محرم کی شرعی حیثیت، ماہِ صفر کی بدعقیدگی، عید جشن میلاد النبی ﷺ کی شرعی حیثیت، مشکل حالات میں سنت رسول ﷺ کا اتباع، خواتین پر اسلام کے احسانات، حصول علم کے لیے سلف صالحین کا ذوق وشوق، رمضان المبارک کی فضیلت۔ یہ اور اسی طرح کے دیگر اہم عنوانات خود بول رہے ہیں کہ یہ کتاب کس قدر ضروری دینی مضامین کا گلدستہ ہے۔ ہم نے جہاں تہاں ان مواعظ کی زبان کو سادہ اور عام فہم بنا دیا ہے۔ اسے معمولی اُردو خوان بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

دینی مدارس کے علاوہ یہ کتاب ہائی اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ و طالبات کو خاص طور پر نہایت توجہ اور احترام سے پڑھنی چاہیے۔ ان شاء اللہ اس کا مطالعہ ہر پڑھنے والے کے قدموں کو صراط مستقیم پر گامزن کر دے گا۔

خادم کتاب وسنت

عبدالمالک مجاہد

ستمبر 2017ء

مینجنگ ڈائریکٹر دارالسلام انٹرنیشنل

فضیلۃ الشیخ پروفیسر عبداللہ ناصر رحمانی ﷾ کی زندگی اور کمالاتِ فائقہ پر ایک نظر

اسلام نے جس طرح رنگ ونسل اور علاقائی تعصب کا صنم کدہ توڑا اسی طرح خاندانی فخر ومباہات کا بت بھی پاش پاش کر دیا۔ قرآن کریم نے ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ کا اعلان کر کے ہمیشہ کے لیے بتا دیا کہ شخصی عظمت وفضیلت کا اصل معیار تقویٰ وپرہیزگاری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے، فضیلۃ الشیخ پروفیسر عبداللہ ناصر رحمانی اپنی شخصی تکریم کے لیے خاندانی نسبت یا کسی اور خارجی سہارے کے محتاج نہیں۔ انھوں نے دینی علوم کی گہری معرفت اور اپنے ذاتی محاسن کی بدولت اپنے لیے اتنی اونچی جگہ بنا لی کہ خود ان کی ذات ان کے خاندانی وقار کو چار چاند لگانے کا ذریعہ بن گئی۔ ان کے خاندان کا شرف یہ ہے کہ یہ خاندان موروثی نہیں بلکہ شعوری مسلمان ہے۔ ذرا ان کا نسب نامہ دیکھیے:

عبداللہ بن عبدالرشید بن رحیم بخش بن قائم دین بن محمد بوٹا بن دسندی سنگھ۔

یعنی ان کے بزرگوں میں سے ایک صاحب بوٹا سنگھ مشرف بہ اسلام ہو کر محمد بوٹا

بن گئے۔ اس طرح پروفیسر عبداللہ ناصر رحمانی کے خانوادے کو تقلیدی اسلام کی بجائے تحقیقی اسلام کی متاع بے بہا نصیب ہوئی۔

پروفیسر عبداللہ ناصر رحمانی حفظہ اللہ 28 دسمبر 1956/1955ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ وہ خاندانی اعتبار سے ورک برادری سے تعلق رکھتے ہیں، جو پنجاب کی معروف جاٹ برادری ہے۔ جہاں تک ان کی نسبت رحمانی کا تعلق ہے، یہ ان کے والد گرامی سے منسوب ہے۔ انھوں نے رحمٰن کی طرف نسبت کرتے ہوئے خود کو رحمانی کہلوایا۔

پروفیسر عبداللہ ناصر رحمانی حفظہ اللہ نے ابتدائی تعلیم کراچی سے حاصل کی، پھر دینی تعلیم کا نو سالہ کورس درس نظامی مکمل کیا اور الشهادة العالية کی سند عالیہ حاصل کی۔ انٹرمیڈیٹ پرائیویٹ طور پر کیا اور جامعہ کراچی سے مولوی فاضل ہونے کا اعزاز امتیازی نمبروں سے حاصل کیا۔ جامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامية سے 1401-1402ھ میں بیچلر تک تعلیم پائی۔ وفاق المدارس السلفیہ سے 1405ھ میں ماسٹر کی سند حاصل کی۔

پروفیسر عبداللہ ناصر حفظہ اللہ نو(9) بھائی بہن ہیں۔ 6 بھائی اور 3 بہنیں ہیں۔

پروفیسر صاحب حفظہ اللہ کی اولاد میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ✳ بڑے بیٹے سفیان صاحب ہیں۔ انھوں نے قرآن کریم کے سات پارے حفظ کیے ہیں اور چودہ جماعتیں پڑھی ہیں۔ ✳ دوسرے صاحبزادے سلمان صاحب ہیں۔ انھوں نے قرآن کریم حفظ کر رکھا ہے۔ ✳ تیسرے فرزند عثمان صاحب ہیں۔ یہ پائلٹ ہیں۔ ✳ چوتھے فرزند بدیع الدین صاحب ہیں۔ یہ 1996ء میں پیدا ہوئے اور 2006ء میں المعهد

السلفي للتعليم والتربية میں مولانا قاری محمد صہیب صاحب سے قرآن کریم حفظ کیا۔ اسی جامعہ میں علوم اسلامیہ (درس نظامی) کے آخری سال میں پڑھ رہے ہیں اور اپنے والد گرامی کی علمی وراثت کے حقیقی جانشین ہیں۔ وباللہ التوفیق!

پروفیسر عبداللہ ناصر رحمانی حفظہ اللہ کے اساتذۂ کرام کی تفصیل جمیل:

① آپ کے ابتدائی اساتذہ میں شیخ ہارون الرشید رحمہ اللہ ہیں۔ ② استاذ الاساتذہ، محدث العصر، مولانا حاکم علی محدث دهلوی رحمہ اللہ۔ یہ شیخ جامع المعقول والمنقول کے لقب سے مشہور ہیں۔ ③ مولانا عبد العزیز فیصل آبادی رحمہ اللہ۔ ④ مولانا کریم الدین سلفی رحمہ اللہ۔ ⑤ مولانا عبد الجبار جہلم والے رحمہ اللہ (خطیب موتی مسجد)۔ ⑥ مولانا عبداللہ مسعود بلتستانی رحمہ اللہ۔ ⑦ مولانا عبدالرشید لداخی رحمہ اللہ۔ ⑧ مولانا یوسف یعقوب حفظہ اللہ۔

❀ علاوہ ازیں آپ نے ریاض یونیورسٹی میں بہت سے علمائے کرام سے علمی استفادہ کیا۔ ان میں سے مشہور یہ ہیں:

① محدث العصر العلامہ عبد العزیز بن عبد اللہ بن باز رحمہ اللہ۔ ② محدث العصر الفقیہ العلامہ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ۔ ③ شیخ عبدالرؤف۔ ④ ملا عبدالقادر (اردن)۔ ⑤ مولانا عبدالخالق قدوسی رحمہ اللہ سے بھی آپ نے علمی استفادہ کیا۔

وہ شیوخ جن سے آپ نے اجازہ لیا ہے:

① شیخ العرب والعجم محدث دیار سندھ علامہ سید ابو محمد بدیع الدین شاہ راشدی رحمہ اللہ (ت: 1996ء)۔ ② مولانا محمد حیات لاشاری رحمہ اللہ (ت: 2006ء)۔ ③ محدث العصر

مولانا سلطان محمود جلال پوری ﷫ (ت: 1996ء)۔ ④ مولانا عبدالرؤف جھنڈا نگری ﷫ نیپال (ت: 1999ء)۔ ⑤ مولانا معین الدین لکھوی ﷫ (ت: 2011ء)۔ ⑥ محدث العصر قاری عبدالخالق رحمانی ﷫ (ت: 2006ء)۔ ⑦ سعودی عرب کے شیخ عبداللہ۔

⑧ قراءۃً وسماعاً محدث العصر شیخ الحدیث مولانا حاکم علی ﷫ سے بھی اجازہ ہے۔

⑨ شیخ عطیہ (محمد سالم) ﷫ سے بھی اجازہ ہے۔

جماعتی و دعوتی سرگرمیاں

اس وقت آپ جمعیت اہل حدیث سندھ کے امیر ہیں۔ ملک اور بیرون ملک دعوتی و اصلاحی پروگراموں میں بھر پور شرکت کرتے ہیں۔ ماہنامہ رسالہ ''دعوت اہلحدیث'' سندھی اور اردو زبان میں آپ ہی کے زیرنگرانی شائع ہوتا ہے، نیز ایک عظیم اسلامی، علمی اور تربیتی دانش گاہ ''المعہد السلفی للتعلیم و التربیہ'' بھی آپ کے زیر اہتمام کام کررہی ہے۔

تدریسی سرگرمیاں

① جامعہ ابی بکر الاسلامیہ میں 1402ھ سے 1405ھ تک حدیث اور اصول حدیث پڑھاتے رہے۔ ② جامعہ دار الحدیث رحمانیہ میں 1406ھ سے 1416ھ تک حدیث اور اصول حدیث کا درس دیا۔ ③ حال میں المعہد السلفی للتعلیم و التربیۃ میں حدیث، اصول حدیث اور عقیدے کا درس دے رہے ہیں۔

تالیفات:

① المنهج الأسعد في ترتيب مسند الإمام أحمد، چار جلدوں میں ریاض سے شائع ہوئی ہے۔ ② منهج القرآن في تربية الرجال، یہ اردو میں شائع ہوئی ہے۔ ③ منهج الحافظ ابن حجر العسقلاني في كتابه فتح الباري، یہ عربی زبان میں طبع ہوئی ہے۔ ④ منهج المحدثين في خدمة السنة، یہ بھی عربی زبان میں ہے۔ ⑤ التوحيد (فضيلته وأهميته) یہ اردو میں ہے۔ ⑥ شرح حديث جبريل، یہ اردو زبان میں ہے۔ ⑦ شرح حديث أبي ذر (يا عبادي.......)، یہ اردو میں ہے۔ ⑧ کتاب الصوم، اردو میں ہے۔ ⑨ حكم تعيين القاضي الكافر في الدولة الاسلامية، بھی اردو زبان میں ہے۔

پروفیسر صاحب نے جن کتب کا اردو میں ترجمہ کیا، وہ یہ ہیں:

① ''تيسير العزيز الحميد شرح كتاب التوحيد'' اس کا ترجمہ دو جلدوں میں ہے۔ ② ''شرح العقيدة الواسطية'' کا اردو ترجمہ کیا۔ یہ کتاب امام ابن تیمیہ ﷫ کی تصنیف ہے۔ اس کی شرح شیخ صالح الفوزان کی ہے اور ترجمہ پروفیسر صاحب نے کیا ہے۔ ③ ''القواعد المثلى في الأسماء والصفات'' کا ترجمہ کیا۔ یہ کتاب شیخ ابن عثیمین ﷫ کی تصنیف ہے۔ ④ کتاب ''شرح مقدمة ابن أبي زيد القيرواني باسم قطف الجنى الداني للشيخ عبد المحسن بن حمد العباد'' ⑤ شیخ صالح الفوزان کی کتاب ''شرح لمعة الاعتقاد'' ⑥ شیخ صالح الفوزان ہی کی کتاب ''الولاء والبراء'' اور ⑦ شیخ صالح المنجد کی کتاب ''المحرمات''۔

دعوت وتبلیغ کے لیے جن ممالک کا دورہ کیا:

① مملکت سعودی عرب۔ ② کویت۔ ③ متحدۂ عرب امارات۔

④ بحرین۔ ⑤ مصر۔ ⑥ بنگلا دیش۔

ماہِ محرم کی شرعی حیثیت

ماہِ محرم کی شرعی حیثیت

خطبہ مسنونہ، امابعد: محرم کے مہینے کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس کی شرعی حیثیت یہ ہے کہ اللہ کے بنائے ہوئے بارہ مہینوں میں سے ایک مہینہ ہے ﴿اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا﴾ اللہ تعالیٰ نے سال کے بارہ مہینے بنائے ہیں، ان میں سے ایک مہینہ محرم کا بھی ہے۔ اور اس کی مزید شرعی حیثیت یہ ہے کہ یہ حرمت والا مہینہ ہے۔ فرمایا: ﴿مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ﴾ [1] ان بارہ مہینوں میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں: ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب۔ [2] حرمت سے مراد یہ ہے کہ یہ مہینے بڑے محترم ہیں۔ مسلمانوں کو ان کا احترام ملحوظ رکھنا چاہیے۔ ان مہینوں میں کفار کے ساتھ بھی جنگ نہ کرو چہ جائیکہ آپس میں۔ فتنے برپا نہ کرو، شرانگیزی نہ کرو۔ ان کی حرمت کا احترام رکھو۔ محرم کے مہینے کی مزید شرعی حیثیت یہ ہے، نبی علیہ السلام کی ایک حدیث ہے: «وَ أَفْضَلُ الصِّيَامِ بَعْدَ شَهْرِ رَمَضَانَ صِيَامُ شَهْرِ اللّٰهِ الْمُحَرَّمِ» ”رمضان کے روزوں کے بعد سب سے افضل روزے اللہ تعالیٰ کے مہینے محرم کے روزے ہیں۔“ [3] اس حدیث میں محرم کی دو فضیلتیں سامنے آتی ہیں: ایک یہ کہ اللہ رب العزت نے محرم

[1] التوبة 36:9. [2] صحيح البخاري، حديث: 3197. [3] صحيح مسلم، حديث: 1163.

کے مہینے کو اپنا مہینہ قرار دیا ہے: «شَهْرُ اللّٰه» اللہ کا مہینہ ہے۔ یہ نسبت اس مہینے کے شرف کی دلیل ہے۔ باقی شرف کی جو وجوہات ہیں ان کا ذکر نہیں ہے۔ اس مہینے کو «شَهْرُ اللّٰهِ» قرار دینا زبردست فضیلت ہے۔ جیسے زمین کی ساری مساجد اللہ کے گھر ہیں لیکن جب بیت اللہ کہا جائے تو خانہ کعبہ مراد ہوتا ہے۔ نسبت، تشریف کی نسبت ہے۔ ساری اونٹنیاں اللہ کی مخلوق ہیں، لیکن صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو قرآن نے ناقة اللّٰه کہا، کہ اللہ کی اونٹنی ہے۔ یہ نسبت، نسبتِ تشریف کہلاتی ہے۔ ایک چیز کے شرف اور اس کی عظمت کے اظہار کے لیے۔ تو محرم کے مہینے کو بھی «شَهْرُ اللّٰه» کہا گیا ہے، حالانکہ سارے مہینے اللہ کے ہیں اور اس کو خاص طور پر «شَهْرُ اللّٰه» کہنا اس کی عظمت اور شرف کی دلیل ہے۔ دوسری فضیلت اس حدیث میں یہ وارد ہے کہ محرم کا روزہ رمضان کے روزوں کے بعد سب سے افضل روزہ ہے۔ یہ روزہ کیا ہے؟ اس کی تاریخ کیا ہے؟ یہ سب کچھ کتب احادیث میں وارد ہے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ محرم کی دس تاریخ کا روزہ پہلے فرض تھا، پھر جب اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزے فرض قرار دے دیے تو محرم کی دس تاریخ کے روزے کی فرضیت منسوخ ہوگئی۔ مگر اس روزے کا استحباب اور اس کی فضیلت اور اس کا مسنون ہونا برقرار اور قائم رکھا گیا ہے۔ اس روزے کی فضیلت یہ ہے کہ فرمایا: «أَحْتَسِبُ عَلَى اللّٰهِ أَنْ يُّكَفِّرَ السَّنَةَ الْمَاضِيَةَ» ایک روزہ گزشتہ سال کے تمام گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔ نبی علیہ السلام کی پوری حدیث یہ ہے: «ثَلَاثَةٌ مِّنْ كُلِّ شَهْرٍ وَ رَمَضَانُ إِلٰى رَمَضَانَ فَهٰذَا صِيَامُ الدَّهْرِ كُلِّهٖ وَصِيَامُ يَوْمِ عَرَفَةَ أَحْتَسِبُ عَلَى اللّٰهِ أَنْ يُّكَفِّرَ السَّنَةَ الَّتِي قَبْلَهٗ وَالسَّنَةَ الَّتِى بَعْدَهٗ وَصِيَامُ يَوْمِ عَاشُورَاءَ أَحْتَسِبُ عَلَى اللّٰهِ أَنْ يُّكَفِّرَ السَّنَةَ الَّتِي

قبلہ» [1] أو كما قال ﷺ ”رمضان کے روزے اور ہر مہینے کے تین روزے زمانے بھر کے روزے ہیں: «ذٰلِكَ صِيَامُ الدَّهْرِ» جس کو اللہ رب العزت رمضان کے روزوں کی اور ہر مہینے چاند کی تیرہ، چودہ اور پندرہ تاریخ کے روزوں کی توفیق دے دے، گویا وہ شخص زمانے بھر کے روزے رکھ رہا ہے۔ اور یوم عرفہ کا روزہ دو سال کے گناہوں کا کفارہ ہے۔ ایک گزشتہ سال دوسرا آئندہ سال۔ اور محرم کا روزہ گزشتہ سال کے گناہوں کا کفارہ ہے۔“

تاریخ اس کی یہ ہے: نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے مدینہ منورہ میں یہودیوں کو دیکھا، اہل کتاب کو دیکھا کہ وہ بھی یہ روزہ رکھتے ہیں۔ آپ نے پوچھا: تم روزہ کیوں رکھتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا: «هٰذَا يَوْمٌ نَجَّى اللّٰهُ بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنْ عَدُوِّهِمْ» [2] یہ وہ دن ہے جس دن اللہ رب العزت نے بنی اسرائیل کو، موسیٰ علیہ السلام کی جماعت کو فرعون کی غلامی اور چنگل سے آزادی عطا فرمائی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے جو مقاصد ہیں وہ دو تھے: ایک پوری قوم کو توحید کا پیغام دینا جو ہر نبی کی نبوت کا مقصد ہے اور دوسرا بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے آزادی دلوانا۔ آزادی کا حصول بھی ایک شرعی مقصد ہوتا ہے۔ اس کے لیے موسیٰ علیہ السلام نے ایک طویل جدوجہد کی، بالآخر فرعون غرق ہوا، اس کی قوم ہلاک ہوئی اور اللہ رب العزت نے بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم اور چنگل سے آزادی عطا فرمادی۔ یہودیوں نے کہا: «فَصَامَهُ مُوسٰى شُكْرًا» موسیٰ علیہ السلام نے بھی اس دن اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے روزہ رکھا تھا۔ ہم چونکہ موسیٰ علیہ السلام کے امتی ہیں تو ہم بھی اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے روزہ رکھتے ہیں۔ تب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

[1] صحيح مسلم، حديث: 1162. [2] صحيح البخاري، حديث: 2004.

«فَنَحْنُ أَحَقُّ وَأَوْلٰى بِمُوسٰى مِنْكُمْ» [1] بھلا تمھارا موسیٰ سے کیا تعلق ہے؟ تعلق تو ہمارا ہے۔ اس کی اساس توحید خالص، اللہ رب العزت کی ربوبیت اور اس کی الوہیت ہے۔ تمھارا کیا واسطہ اور تعلق ہے! تمھارا کوئی تعلق نہیں۔ دین میں تعلق کی اساس قومیت نہیں ہے۔ تعلق کی اساس اللہ کا دین ہے۔ اللہ کی توحید ہے۔ «اَلْحُبُّ فِي اللّٰهِ وَالْبُغْضُ فِي اللّٰهِ» محبت اللہ کے لیے ہے اور بغض بھی اللہ کے لیے ہے۔ اور تعلق کی بنیادیں خالق اور مالک کی توحید ہے۔ فرمایا کہ روزہ ہم رکھیں گے تاکہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یکجہتی کا اظہار ہو۔ ان سے محبت کا اظہار ہو۔ تب رسول اللہ ﷺ نے اس روزے کی مشروعیت کا اعلان فرمادیا۔ لیکن چونکہ یہودی بھی رکھ رہے ہیں اور اسلام کی جو اعتقادی بنیادیں ہیں، ان میں سے ایک بنیاد یہ ہے کہ کسی مسئلے میں یہود کے ساتھ تشبہ نہ ہو۔ کوئی مسئلہ ایسا نہ ہو کہ جس سے یہ ظاہر ہو رہا ہو کہ تم یہودیوں کی مشابہت اختیار کر رہے ہو، ان کا تشبہ اختیار کر رہے ہو۔ اب یہ الگ مسئلہ پیدا ہوگیا۔ یہودی بھی رکھیں، ہم بھی رکھیں یہ تو سیدھا سیدھا تشبہ بنتا ہے۔ اس کا ازالہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یوں فرمایا کہ تم نو اور دس کے دو روزے رکھو تاکہ ان کی مخالفت ہو۔ [2] وہ ایک رکھتے ہیں، ہم دو رکھیں گے یہود کی مخالفت کے لیے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہود بڑی قابل نفرت قوم ہے۔ بڑی مبغوض اور حقیر قوم ہے۔ جو قوم حقارت کے قابل ہو، ٹھکرائے جانے کے قابل ہو۔ ایسی قوم سے کسی مسئلے میں یکجہتی کا اظہار، اس سے تشبہ اور مماثلت جائز نہیں ہے۔ فرمایا کہ «وَإِذَا لَقِيْتُمُوهُمْ فِي الطَّرِيقِ فَاضْطَرُّوهُمْ إِلٰى أَضْيَقِ الطَّرِيقِ» [3] ”جب تم کسی یہودی کے پاس سے گزرو تو

[1] صحيح مسلم، حديث: 1130. [2] جامع الترمذي، حديث: 755. [3] صحيح مسلم، حديث: 2167، و سنن أبي داود، حديث: 5205.

اپنے بازو پھیلا لو اور کوشش کرو کہ ان کا راستہ تنگ کرو۔" حالانکہ بازوؤں کو پھیلانا کبر کی ایک علامت ہے لیکن یہودیوں جیسی مبغوض قوم کے لیے کبر نہیں ہے۔ یہ اسلام کی رفعت اور اس قوم کی تحقیر ہے۔ وہ قوم جس سے انسان ہی نہیں بلکہ درخت، پتھر اور جمادات بھی نفرت کرتے ہیں۔ چنانچہ قرب قیامت جب عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے اور چن چن کر یہودیوں کو قتل کریں گے، اس وقت یہودی پتھروں اور درختوں کی آڑ میں چھپنے کی کوشش کریں گے، تب پتھر اور درخت پکاریں گے: «يَا مُسْلِمُ! هٰذَا يَهُودِيٌّ وَّرَائِي تَعَالَ! فَاقْتُلْهُ» [1] "اے مسلمان! میرے پیچھے ایک یہودی چھپا ہوا ہے میری طرف آؤ، اسے قتل کردو۔"

ایسی قوم جس سے پتھر، جمادات، مٹی اور درخت بھی نفرت کریں، وہ قوم کسی محبت کے قابل نہیں ہے کہ اس قوم کو اپنے سروں پہ بٹھایا جائے اور اس سے دوستی کی پینگیں بڑھائی جائیں اور پھر وہ اس طرح ہمارے سروں پر سوار ہوجائیں کہ جب چاہیں ہمارے علاقوں میں داخل ہوں اور ہمارے فوجیوں کو شہید کر جائیں اور ہم اس پر کوئی ایکشن نہ لیں اور کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہ کریں، سوائے چند مصنوعی باتوں کے جن میں کسی حقیقت کا رنگ نہ ہو۔ یہ ایک عجیب معاملہ ہے۔ یہ قوم کسی مداہنت اور کسی اچھے سلوک کے لائق نہیں ہے۔ جس قوم سے پوری کائنات نفرت کا اظہار کرتی ہے، اس قوم کی نفرت ہی ہمارے دلوں میں موجود ہو یہ توحید کے تقاضوں میں سے ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے یہود سے مخالفت کے لیے دو روزے مشروع قرار دے دیے۔

نو اور دس محرم کا روزہ، چنانچہ یہ بیشتر احادیث میں مذکور بھی ہے۔ اور اس کی نبی علیہ الصلاۃ والسلام

[1] صحيح البخاري، حديث:3593، و صحيح مسلم، حديث:2921.

نے تلقین فرمائی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے معمول سے یہ ثابت بھی ہے۔ یہ ہے وہ شرعی حیثیت جو اس محرم کے مہینے کی ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جونہی محرم کا چاند نمودار ہوتا ہے تو شیطان دو قوموں کو گمراہی کی طرف آمادہ کرتا ہے، بلکہ دو قوموں کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ دو قوموں میں دین کے خلاف نظریات اور فکر اور الحاد داخل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ ایک وہ قوم ہے جو حزن و ملال اور غم و اندوہ کی خاطر ان دنوں میں ماتم کرتی ہے، سینہ کوبی کرتی ہے، رخسار پیٹتی ہے، گریبان چاک کرتی ہے، اپنے آپ کو زخمی کرتی ہے۔ یہ پوری کی پوری شیطان کی وہ ایک تدبیر ہے جو اس قوم پر آزماتا ہے اور خوب خوب اس قوم کو اللہ کے دین سے دور کرتا ہے۔ دوسری وہ قوم ہے جو اس مہینے کی آمد سے خوشیوں کا اظہار کرتی ہے۔ یہ خوارج ہیں اور خوارج میں سے خاص طور پر ایک ناصبی طبقہ۔ ان کے دل نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے خاندان کے بغض سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ ان دنوں میں خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ دسترخوان وسیع کرتے ہیں، طرح طرح کے پکوان تیار کرواتے ہیں، بچوں کو نئے کپڑے پہنواتے ہیں اور جس طرح عید کے موقع پر عیدی تقسیم ہوتی ہے، اسی طرح ان دنوں میں بچوں پر اپنا مال وسعت کے ساتھ خرچ کرتے ہیں اور یہ دونوں قومیں درحقیقت شیطان کے زیر اثر ہیں۔ ان کو شیطان اس مہینے کی آمد سے پوری طرح ورغلاتا ہے۔ باقی معاملہ کیا ہے؟ معاملہ یہ ہے کہ 61 ہجری میں دس محرم کو ایک سانحہ رونما ہوا جس میں نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے نواسے کو ان کے خاندان کے بہت سے افراد کے ساتھ شہید کردیا گیا۔ ہم اس سانحے کی اساس یا اس کی تاریخی حیثیت پر بات نہیں کرتے لیکن ایک شرعی حیثیت ضرور سمجھانا

چاہتے ہیں۔ اس سانحے کے تعلق سے ہمارا شرعی کردار کیا ہونا چاہیے؟

دس محرم 61 ہجری کو نبی ﷺ کے نواسے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے خاندان کے بہت سے افراد کو شہید کردیا گیا اور یہ ایک سانحہ ہے۔ ایک ایسا سانحہ جو غم و اندوہ سے بھرپور ہے۔ بچوں کی شہادت، خواتین کی شہادت، یقیناً ایک بڑا المیہ ہے۔ اور یہ تاریخ سے ثابت ہے۔ اگرچہ اس حوالے سے لوگ تقریباً ننانوے فیصد جھوٹے قصے روایت کرتے ہیں۔ فلاں راوی نے کہا، فلاں راوی نے کہا، یہ جملہ استعمال کرکے ٹکا ٹکا کے جھوٹ بولتے ہیں۔ وہ راوی کون ہے؟ کہاں بیٹھا ہوا تھا؟ اور کہاں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور تاریخ مرتب کررہا تھا؟ کوئی یہ ثابت نہیں کرسکتا، لیکن محض راوی کے نام پر، راوی کی گردن پر یہ سارا جھوٹ ڈال دیا جاتا ہے۔ اس کا صداقت اور صحت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ امر واقع یہی ہے کہ اس دن جناب حسین رضی اللہ عنہ اور بہت سے آپ کے اہل بیت کو شہید کیا گیا۔ شرعی حیثیت کیا ہے؟ بتائیے! اللہ رب العزت کسی کو شہادت کی موت عطا فرمادے، شہادت کا تمغہ اس کے سینے پر سجادے، یہ شر ہے یا خیر ہے؟ اگر یہ شر ہے تو خوب روو، اگر یہ خیر ہے تو رونے کا کیا جواز ہے؟ ایک شخص شہادت کا تمغہ سجا کر اللہ کا قرب حاصل کرچکا ہے۔ اور شہید کا درجہ اس امت میں تیسرا درجہ ہے۔ پہلا درجہ انبیاء کا ہے، دوسرا صدیقین کا ہے اور تیسرا شہداء کا ہے۔ ایک عظیم منصب پر وہ فائز ہوگئے اور ایک انتہائی سعادت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ مقام تو ان کے لیے باعث سعادت ہے، باعث خیر ہے۔ ایک شخص کو خیر اور سعادت ملے اور اس پر آپ صدیوں روئیں، کیا اس کا جواز ہے؟ اور کیا اس کی شرعی یا عقلی حیثیت ہے یا کوئی اخلاقی حیثیت ہے؟ یہ تو اس شخص کے لیے مقام فرحت ہے۔ ایک

وقتی المیہ اور سانحہ بن جاتا ہے لیکن ابدالآباد کی سعادت کتنی بڑی خیر ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے اپنے پیغمبر کے دونوں نواسوں حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو ایک عظیم سعادت سے ہمکنار کیا تھا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «أَنَّ الْحَسَنَ وَالْحُسَيْنَ سَيِّدَا شَبَابِ أَهْلِ الْجَنَّةِ» ”حسن و حسین رضی اللہ عنہما جنت کے نوجوانوں کے سردار ہوں گے۔“[1] بڑا عظیم رتبہ ہے یہ۔ جنتی ہونے کی نوید تو مل ہی گئی ساتھ یہ بھی فرمایا جنت کے نوجوانوں کے سردار ہوں گے۔ یہ بڑا عظیم رتبہ اور مقام ہے۔

میرے دوستو اور بھائیو! عظیم رتبے اور مقام، یہ قربانیوں سے حاصل ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پہلے امتحانوں کی چکی میں پیستا ہے، اپنے بندوں کے صبر کو آزماتا ہے۔ اور جب وہ سرخرو ہوجائیں تو ان کو وہ عظیم مقام عطا فرمادیتا ہے۔ حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو ابتدائی زندگی میں کسی تکلیف کا سامنا نہیں تھا۔ صحابہ جانتے تھے یہ پیغمبر ﷺ کے نواسے ہیں، پیغمبر ﷺ کے بیٹے ہیں اور پیغمبر ﷺ ان سے محبت کرتے ہیں، چنانچہ سارے صحابہ ان سے محبت کرتے تھے۔ اور وہ کسی امتحان میں نہ ڈالے گئے۔ ایک دفعہ نبی ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے، حسن رضی اللہ عنہ اپنے گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے مسجد میں آگئے اور پیغمبر ﷺ نے ان کو اٹھا لیا اور فرمایا: «إِنَّ ابْنِي هٰذَا سَيِّدٌ وَلَعَلَّ اللّٰهَ أَنْ يُّصْلِحَ بِهٖ بَيْنَ فِئَتَيْنِ عَظِيمَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ» ”میرا یہ بیٹا سردار ہوگا اور اللہ رب العزت میرے اس بیٹے کے ذریعے مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں میں صلح کرادے گا۔“[2] اس صلح کا سارا کریڈٹ میرے اس نواسے کو جائے گا اور سہرا میرے اس بیٹے کے سر بندھے گا۔ اللہ اکبر!

[1] جامع الترمذي، حديث:3781. [2] صحيح البخاري، حديث:2704.

صحابہ کرام ؓ اس حدیث کو سنتے ہیں، منبر پر سنتے ہیں، اس سے صحابہ کرام دو باتیں سمجھے: ایک حسن ؓ کا مقام، ان کا سردار ہونا، یہ سرداری اللہ کے پیغمبر ﷺ کے فرمان سے عطا ہوئی۔ دوسرا یہ کہ حسن ؓ طویل العمر ہوں گے۔ بچپن میں فوت نہیں ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کے سارے بیٹوں کو بچپن میں وفات دے دی تھی۔ جو آپ کا بڑا بیٹا ابراہیم فوت ہوا، اس کی عمر ڈیڑھ سال تھی۔ باقی سب اس سے چھوٹی عمر میں فوت ہوئے۔ صحابہ کرام جو یہ حدیث سنتے ہیں وہ پیغمبر ؑ کے ہر فرمان پر ایمان لاتے تھے، یہ بات سمجھ گئے کہ یہ بیٹا طویل العمر ہوگا۔ سرداروں کے منصب پر فائز ہوگا اور دو گروہوں میں صلح کا سبب بنے گا، یعنی بڑا ہو کر فوت ہوگا۔ اس بات پر سبھی صحابہ ایمان لے آئے تھے، چنانچہ 41 ہجری کے بعد کے واقعات میں جناب علی بن ابی طالب ؓ کی شہادت کے بعد جب اہل مدینہ نے جناب حسن ؓ کی بیعت کرلی، اہل شام نے جناب امیر معاویہ ؓ کی بیعت کرلی تو اس وقت ایک عظیم جھگڑے کی بنیاد قائم ہو چکی تھی کہ قتل و غارت گری ہو اور دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہو۔ جناب حسن ؓ یہ ساری چیزیں بھانپ گئے اور اپنی اس امارت سے مستعفی ہو گئے تاکہ جھگڑا نہ ہو، چنانچہ جھگڑا تھم گیا اور اللہ رب العزت نے دو جماعتوں میں صلح کرا دی۔ اس میں سارا کردار سیدنا حسن ؓ کا تھا کہ خود ہٹ گئے، مستعفی ہوگئے اور جناب امیر معاویہ ؓ کی امارت کو قبول کر لیا، ان کی خلافت کے تحت آ گئے اور یوں ایک بہت بڑے جھگڑے کی جڑ ختم ہوگئی اور فساد کا خاتمہ ہوگیا۔ دو گروہوں میں صلح ہوگئی اور معاملہ پرسکون ہو گیا۔ حسن ؓ سردار تھے، یعنی مستعفی ہونے کے باوجود سردار ہیں۔ صرف دنیا کے سردار نہیں بلکہ جنت کے نوجوانوں کے بھی سردار ہوں گے۔ یہ ایک

عجیب ابتلا (آزمائش) تھی اللہ رب العزت کی طرف سے جس میں جناب حسن ؓ پورا اترے۔ بظاہر ایک تکلیف دہ معاملہ تھا مگر صبر کیا اور تنازل اختیار کر کے (اپنے منصب سے نیچے اتر کر) مسلمانوں کو جھگڑے سے بچالیا اور یہ ان کی سرداری پر منتج ہوئی۔

صحابہ کرام کو حسن و حسین ؓ کے چہرے میں اللہ کے پیغمبر کی شبیہ دکھائی دیتی تھی۔ ان کے چہروں میں اللہ کے پیغمبر نظر آتے تھے۔ صحابہ تو ان کو ٹوٹ ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔ صحیح بخاری کی حدیث ہے، ابوبکر صدیق ؓ کا دورِ خلافت ہے۔ ابوبکر صدیق ؓ حسن کو اٹھالیتے ہیں اور ساتھ ساتھ ایک جملہ کہتے ہیں: «بِأَبِي شَبِيهٌ بِالنَّبِيِّ وَلَيْسَ شَبِيهٌ بِعَلِيٍّ، بِأَبِي! شَبِيهٌ بِالنَّبِيِّ وَلَيْسَ شَبِيهٌ بِعَلِيٍّ» ''یہ بیٹا تو نبی کے مشابہ ہے، علی کے مشابہ نہیں ہے۔''[1] تو نبی علیہ الصلاۃ والسلام کا چہرہ ان دو بچوں کے چہروں میں نظر آتا تھا۔ ان سے کیوں ان کی مخاصمت ہوتی۔ بہت محبت ملی اور بڑی محبت کی فضا میں ان دونوں کو نشوونما ملی۔ بظاہر یہ ہے کہ رتبہ بڑا عظیم تھا لیکن آزمائش نہیں تھی۔ حسن ؓ کی آزمائش ہوگئی، چنانچہ 40 ہجری کے واقعات کے بعد انھوں نے منصب امارت سے تنازل اختیار کر کے اور صبر کر کے اس آزمائش میں اپنے آپ کو سرخرو ثابت کرلیا۔

سیدنا حسین ؓ بھی اسی محبت کی فضا میں پروان چڑھے تھے۔ صحابہ ان سے کیوں کسی اختلاف کا اظہار کرتے۔ صحابہ ان سے کیوں مخالفت کرتے؟ باقی حسین ؓ، جن کو اہل کوفہ نے خطوط لکھے: ہم آپ کے وفادار ہیں، آپ آجائیں، آپ تشریف لائیں ہم آپ کے ہاتھوں پر بیعت کریں گے۔ بڑے خطوط آئے۔ کبار صحابہ نے سمجھایا کہ اہل کوفہ

[1] صحيح البخاري، حديث: 3750.

سے کبھی وفا کی امید نہ رکھی جائے۔ یہ انتہائی وقت پر آ کر غدر کرتے ہیں اور دھوکے دیتے ہیں۔ آپ نہ جائیں، بالکل نہ جائیں۔ بہت سمجھایا لیکن وہ نہ مانے بالآخر جانے پر تیار ہو گئے۔ ہم اس تاریخ کا اعادہ نہیں کرتے لیکن بہرکیف 61 ہجری میں دس محرم کو یہ خوفناک اور خطرناک سانحہ پیش آیا۔ نبی علیہ السلام کے نواسے کو شہید کر دیا گیا۔ تو یوں آپ اور آپ کے اہل بیت شہادت کے رتبے پر فائز ہو گئے۔ اور یہ کلفت اور تکلیف کا راستہ مشاہیر وصالحین کی زندگی کا مقدر ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «أَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً الْأَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ» سخت ترین تکلیفیں نبیوں پر آتی ہیں اور نبیوں کے بعد جو انبیاء کے قریبی ہوتے ہیں، شہداء ہیں، صالحین ہیں، ان پر آتی ہیں اور پھر درجہ بہ درجہ یہ تکلیفیں آتی رہتی ہیں۔ فرمایا کہ ایک شخص آزمایا جاتا ہے، جھنجھوڑا جاتا ہے «بِقَدْرِ دِينِهِ» اپنے دین کے بقدر، جتنا اس کا دین ہے اتنا اس کا امتحان ہوتا ہے۔ فرمایا «إِنْ كَانَ فِي دِينِهِ صَلَابَةٌ زِيدَ فِي ابْتِلَائِهِ» اگر اس کے دین میں سختی ہو، شدت ہو، اس کا عقیدہ پہاڑ کی طرح ٹھوس ہو اور اس کا عمل انتہائی مضبوط ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی آزمائشوں کو بڑھا دیتا ہے۔ اسے خوب جھنجوڑتا ہے، اسے خوب آزماتا ہے۔[1] تبھی تو اللہ پاک کا فرمان ہے: ﴿أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ تم کیا سمجھتے ہو جنت میں ایسے ہی داخل ہو جاؤ گے۔ ذرا بیٹھ کے سوچو کہ تم نے جنت کو پانے کے لیے کیا کیا ہے؟ کیا تمھارے پاس محنتیں ہیں؟ کیا قربانیاں ہیں؟ کیا ابتلاآت ہیں؟ سوچو ذرا۔ فرمایا کہ ہر گز نہیں، اس وقت تک نہیں جاسکتے جب تک تمھارے بیچ سابقہ قوموں کی مثالیں نہ

[1] مسند أحمد: 172/1، و السلسلة الصحيحة: 142/1.

آجائیں، یعنی انبیاء اور ان کی امتوں کی مثالیں جن کو جھنجوڑا گیا، فاقوں پر مجبور کیا گیا، ان کو قتل کیا گیا، زخموں سے چُور کیا گیا اور حتی کہ اس قدر ستایا اور آزمایا گیا کہ وقت کا نبی جو اپنے وقت کا صابرِ اعظم ہوتا ہے اور اس کے صحابہ اور اس کے امتی جن کا مقام انبیاء کے بعد ہوتا ہے، وہ بھی چلا اٹھے: ﴿مَتَى نَصْرُ اللَّهِ﴾ یا اللہ! تیری مدد کب آئے گی؟ ﴿أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ﴾ تم صبر کرو، اللہ کی مدد قریب ہے۔ ضرور یہ مدد آئے گی۔[1]

وَأَقُولُ قَوْلِي هٰذَا وَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِي وَلَكُمْ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

[1] البقرة 2:214.

شانِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

شان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

خطبہ مسنونہ:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ (الحشر 59:8-10)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تعلق سے منہجی باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ پہلا مسئلہ صحابی کی تعریف ہے۔ صحابی کی سب سے جامع تعریف حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بیان فرمائی ہے۔ صحابی وہ شخص ہے: «لَقِيَ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ مُؤْمِنًا بِهِ» جو رسول اللہ ﷺ سے ایمان لانے کی حالت میں ملا ہو۔ «مَاتَ عَلَى الْإِسْلَامِ» اس کا انتقال بھی اسلام پر ہوا ہو۔ آخر دم

تک اسلام پر قائم رہا ہو۔ تعریف میں صحابیت کے ثبوت کے لیے چار شرائط ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ صحابی کی ملاقات نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے ثابت ہو۔ وہ ملاقات خواہ چھوٹی ہو یا بڑی ہو۔ خواہ پوری زندگی کا ساتھ ہو جیسے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یا چند لمحات کا دیدار ہو جیسے وہ شخص جو نجد کی سرزمین سے آیا تھا۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے ایک سوال کیا: «أَخْبِرْنِي بِعَمَلٍ إِذَا عَمِلْتُهُ دَخَلْتُ الْجَنَّةَ» یارسول اللہ! وہ کون سا عمل ہے جس کے کرنے سے میں جنت میں داخل ہوسکتا ہوں۔ اس کا کہنا یہ تھا: «أَتَيْتُ مِنْ أَهْلِي وَمَالِي وَ عَشِيرَتِي» میں یہ سوال پوچھنے کے لیے اپنے اہل و عیال، اپنی تجارتیں، اپنی قوم برادری سب کچھ چھوڑ کر آرہا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارکان اسلام کی تعلیم دی۔ اس نے بات کو سمجھا اور واپس جانے کے لیے مڑا تاکہ اپنی قوم کو جا کر دعوت دے۔ اتفاق سے اس کی اونٹنی کا پاؤں ایک بل میں داخل ہوا، توازن بگڑ گیا اور وہ شخص گردن کے بل نیچے گرا۔ وہیں شہید ہوگیا۔ یہ اس کی نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے ساتھ مختصر صحبت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے اپنے قریب منگوایا۔ صحابہ اٹھا کر لائے۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے اپنا چہرۂ مبارک اس کے قریب کیا، پھر پیچھے ہٹا لیا۔ فرمایا کہ «إِنِّي رَأَيْتُ مَلَكَيْنِ يَدُسَّانِ فِي فِيهِ مِنْ ثِمَارِ الْجَنَّةِ» ”میں نے اللہ کے دو فرشتے دیکھے، وہ اس کے منہ میں جنت کے پھل ڈال رہے تھے۔“ «فَعَلِمْتُ أَنَّهُ مَاتَ جَائِعًا» اس سے مجھے یہ اندازہ ہوا، یہ شخص بھوکا اور پیاسا سفر کررہا تھا۔ کھانے اور پینے کی کوئی ہوش نہیں تھی۔ ایک ہی ہدف تھا، ایک ہی نصب العین تھا۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام تک جلدی پہنچ جاؤں، اپنا سوال پیش کروں اور جواب حاصل کر کے عمل شروع کردوں۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام اس کو دفن کر رہے ہیں اور ساتھ فرما رہے ہیں کہ «عَمِلَ قَلِيلًا وَّ أُجِرَ كَثِيرًا» اسے عمل کرنے کا

موقع نہیں ملا لیکن اجر و ثواب بے تحاشہ پا گیا ہے۔ [1] تو اس کی جو صحبت ہے نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے ساتھ بڑی مختصر ہے۔ چونکہ بحالت ایمان یہ دیدار حاصل ہوگیا، یہ بھی صحابی ہے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی صحابی ہیں، یہ بھی صحابی ہے۔ پہلی شرط لقا کی، یعنی ملاقات کی ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ یہ لقا بحالت ایمان ہو۔ چنانچہ کافر اور یہودی آپ سے ملتے تھے، ایمان نہیں لائے، وہ صحابی نہیں ہوسکتے۔ منافقین آپ سے ملتے تھے، ایمان نہیں لائے۔ کیونکہ ایمان وہ معتبر اور مسلّم ہے جو ظاہراً و باطناً ہو۔ منافقین کا اسلام ظاہراً تھا، حقیقتاً اور باطناً نہیں تھا۔ اللہ پاک کا فرمان ہے: ﴿وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ﴾ [2] منافقین جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم ایمان لا چکے ہیں، مسلمان ہیں اور جب اپنے شیاطین کے پاس جاتے ہیں، کفار کے پاس جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں۔ ہم تو اوپر اوپر سے اسلام کا اظہار کرتے ہیں۔ تو منافق صحابی نہیں ہوسکتا۔ یہ دوسری شرط ہے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ آپ ﷺ پر ایمان لائے۔ ایسے لوگ بھی آپ کو ملے جو ایمان دار تو تھے لیکن نبی علیہ الصلاۃ والسلام پر ایمان نہیں لائے تھے۔ ان کا ایمان اپنے نبی پر تھا جیسے بحیرا راہب۔ عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا ہوا تھا۔ عیسائی تھا۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام پر ایمان نہیں لاسکا۔ آپ ﷺ سے حمایت کا ذکر کیا۔ مدد کا ذکر کیا، آپ کی حقانیت کا ذکر کیا۔ ایمان نہیں لایا، اس لیے بحیرا راہب صحابی قرار نہیں پاسکتا۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ اسی ایمان پر اس کا انتقال ہو۔ کچھ لوگ ایمان لائے تھے لیکن

[1] مسند أحمد: 359/4. [2] البقرة 14:2.

مرتد ہوگئے۔ جیسے عبیداللہ بن جحش ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا سابقہ شوہر ہے۔ اسلام لایا اور حبشہ کے مہاجرین کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت بھی کی، لیکن حبشہ جا کر نصرانی ہوگیا۔ مرتد ہوگیا۔ یہ صحابی قرار نہیں پائے گا۔ یہ ایمان تو لایا، بحالت ایمان نبی علیہ الصلاۃ والسلام کا دیدار کیا، لیکن پھر اسلام کو چھوڑ دیا، بغاوت اور ارتداد اختیار کیا۔ یہ مسلمان نہیں ہوسکتا۔ جیسے عبداللہ ابن خطل ہے۔ اسلام لایا تھا، بعد میں مرتد ہوگیا بلکہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی ہجو کرتا تھا، مذمت کرتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر سب کو امان دے دی لیکن فرمایا کہ عبداللہ کے جرائم بڑے سنگین ہیں، اس کو قتل کردو۔ اس نے سوچا کہ میرے لیے جائے پناہ اللہ کا گھر ہے۔ اللہ کے گھر میں داخل ہوگیا اور بیت اللہ کے پردے کو پکڑ لیا۔ یہاں مجھے کون مارے گا؟ صحابہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے پاس آئے اور کہا: «عَبْدُ اللّٰهِ مُتَعَلِّقٌ بِأَسْتَارِ الْكَعْبَةِ» کہ عبداللہ تو خانہ کعبہ کے غلاف کو پکڑے بیٹھا ہے، کیا کریں؟ فرمایا: اسے وہیں قتل کردو۔[1] اس کے جرائم اس قدر سنگین ہیں کہ یہ کسی معافی کا مستحق نہیں۔ اس کو وہیں قتل کردیا گیا۔ یہ اسلام لایا، لیکن بعد میں مرتد ہوگیا۔ صحابی کی تعریف جس میں چار چیزیں جمع ہوں۔ ایک بحالت ایمان نبی علیہ الصلاۃ والسلام کا دیدار اور آپ کے ساتھ ایمان اور اس ایمان پر وہ تاحیات قائم رہا ہو۔ یقیناً جس شخص میں یہ چار چیزیں آجائیں، وہ صحابی ہے۔ اور وہ بڑی فضیلت کا حامل اور بڑے اونچے مقام کا مستحق ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «لَاتَسُبُّوا أَصْحَابِي» میرے کسی صحابی کو گالیاں نہ دینا۔ ان پر طعنہ زنی یا تنقید نہ کرنا۔ «فَوَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ أَنْفَقَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا مَا بَلَغَ مُدَّ أَحَدِهِمْ وَلَا نَصِيفَهُ»[2] اس

[1] الرحيق المختوم، ص: 406. [2] صحيح البخاري، حديث: 3673، و صحيح مسلم، حديث: 2541.

ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم لوگ احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرو، میرا ایک صحابی صرف ایک پاؤ کھجوریں خرچ کردے تو اللہ تعالیٰ ایک پاؤ کھجوریں خرچ کرنے پر جو اجر اور ثواب میرے صحابی کو دے گا، احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرنے پر تمھیں نہیں دے گا۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ کو نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی زیارت کا اور نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے دیدار کا جو شرف حاصل تھا، اس بنا پر ان کا درجہ، ان کا مقام بڑا اونچا ہے۔ ورنہ عمل سب کررہے ہیں، نماز ہم بھی پڑھ رہے ہیں۔ روزے ہم بھی رکھ رہے ہیں۔ حج ہم بھی کرتے ہیں۔ عمل وہی ہیں۔ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایک درجہ ممتاز حاصل ہے اور وہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی لقا، آپ کے دیدار کا شرف ہے۔ صحیح بخاری میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے: «يَغْزُو فِئَامٌ مِّنَ النَّاسِ» ایک وقت آئے گا کہ لوگوں کا ایک گروہ اللہ کی راہ میں جہاد و قتال کرے گا۔ «فَيُقَالُ لَهُمْ» اس گروہ سے پوچھا جائے گا: «هَلْ فِيكُمْ مَّنْ صَحِبَ رَسُولَ اللّٰهِ؟» کیا تم میں کوئی شخص ایسا ہے جس کو اللہ کے پیغمبر کی صحبت کا شرف حاصل ہو۔ «فَيُقَالُ: نَعَمْ» کہا جائے گا: ہاں! اس لشکر میں ایسے لوگ موجود ہیں جنھیں نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی صحبت کا شرف حاصل ہے۔ «فَيُفْتَحُ لَهُمْ» اللہ تعالیٰ اس لشکر کو فتح دے دے گا۔ اس لشکر کی فتح کی وجہ ایسے لوگوں کا موجود ہونا ہے جو نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے صحابی تھے۔ فرمایا کہ «ثُمَّ يَغْزُو فِئَامٌ مِّنَ النَّاسِ» پھر ایک اور گروہ قتال اور جہاد کرے گا۔ «فَيُقَالُ لَهُمْ» وہاں بھی پوچھا جائے گا: «هَلْ فِيكُمْ مَّنْ رَّأَى مَنْ صَحِبَ رَسُولَ اللّٰهِ؟» کیا تم میں ایسا شخص ہے جس نے اللہ کے پیغمبر کے کسی صحابی کو دیکھا ہو؟ «فَيُقَالُ: نَعَمْ» کہا جائے گا: ہاں۔ ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے پیغمبر علیہ السلام کو تو نہیں دیکھا،

لیکن پیغمبر علیہ السلام کے صحابہ کو دیکھا ہے۔ «فَيُفْتَحُ لَهُمْ» رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ اس لشکر کو بھی فتح دے دے گا۔ کس چیز کی برکت سے؟ کہ اس جماعت میں ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے پیغمبر علیہ السلام کے صحابہ کا دیدار کیا ہے۔ فرمایا کہ «ثُمَّ يَغْزُو فِئَامٌ مِّنَ النَّاسِ» پھر لوگوں کی ایک اور جماعت اللہ کی راہ میں جہاد کرے گی۔ «فَيُسْأَلُ» وہاں بھی پوچھا جائے گا: «هَلْ فِيكُمْ مَّنْ رَأَى مَنْ صَحِبَ مَنْ صَحِبَ رَسُولَ اللّٰهِ؟» کیا تم میں کوئی ایسا شخص ہے جس نے اس شخص کو دیکھا ہو جس شخص نے اللہ کے پیغمبر کے کسی صحابی کو دیکھا ہو؟ یعنی تبع تابعی۔ «فَيُقَالُ: نَعَمْ» کہا جائے گا: ہاں ایسے افراد موجود ہیں۔ «فَيُفْتَحُ لَهُمْ» ان کی بھی اللہ تعالیٰ مدد کرے گا اور ان کو فتح عطا فرمادے گا۔ [1] ان کی فتح ایسے لوگوں کی موجودگی کی برکت سے ہوگی جنھوں نے کسی صحابی کا دیدار کیا۔ یہ صحابہ کی شان، ان کا مقام اور رفعتِ درجہ ہے کہ اس کی موجودگی فتح کا، اللہ کی رضا کا، اس کی رحمت کا اور اس کی مدد کا باعث ہے۔

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «اَلنُّجُومُ أَمَنَةٌ لِّلسَّمَاءِ» آسمان کے ستارے آسمان کی امان ہیں۔ آسمان کے محافظ ہیں۔ تارے اللہ کے فوجی ہیں۔ ایک دور تھا کہ یہ جنّ آسمانوں کی طرف جاتے اور فرشتوں کی باتیں سن کر آسمانوں کے فیصلے اچکنے کی کوشش کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے جب محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا فیصلہ فرمالیا، اس نے طے کرلیا کہ اب آسمانوں کی خبریں زمین پر پہنچیں گی صرف ایک ہی شخصیت کے ذریعے سے اور وہ شخصیت محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے۔ باقی سارے راستے بند کردیے۔ ستاروں کو اللہ تعالیٰ نے یہ تاثیر دے دی کہ اب اگر کوئی جن آئے تو آگ

[1] صحيح البخاري، حديث:2897، و صحيح مسلم، حديث:2532.

کا شعلہ بن کر ان کو جلادیں، چنانچہ یہ ستارے اللہ تعالیٰ کی خبروں کے محافظ بن گئے۔ فرمایا کہ ستارے آسمانوں کی امان ہیں۔ «وَأَنَا أَمَنَةٌ لِّأَصْحَابِي» اور میں، یعنی محمد رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کے لیے امان ہوں۔ جب تک میں زندہ ہوں، موجود ہوں، محافظ اور امان ہوں اپنے صحابہ کے لیے۔ کتنا پیارا تعلق ہے! فرمایا کہ «وَ أَصْحَابِي أَمَنَةٌ لِّأُمَّتِي» اور میرے صحابہ میری امت کے لیے امان ہیں۔ «فَإِذَا ذَهَبَ أَصْحَابِي» جب میرے صحابہ چلے جائیں گے، فوت ہوجائیں گے اور یہ زمین صحابہ کے وجود سے خالی ہوجائے گی۔ «أَتٰى أُمَّتِي مَا يُوعَدُونَ» میری امت کو وہ سارے فتنے، فسادات لاحق ہوں گے جن کا اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے۔ [1] لیکن جب تک صحابہ زندہ ہیں، میری امت کو فتنے لاحق نہیں ہوں گے۔ یہ کون سے فتنے مراد ہیں؟ یہ بدعات، خرافات، شرک اور مختلف قسم کے انتشار کے فتنے، جہمیہ، کرامیہ، رافضہ، مرجئہ، قدریہ، جبریہ، معتزلہ گمراہ فرقے پیدا ہوں گے۔ عجیب وغریب ان کے عقائد۔ فرمایا کہ میرے صحابہ کا وجود امت کے لیے امان ہے، امت کے لیے برکت ہے۔ جب صحابہ چلے جائیں گے، وہ فتنے میری امت کو لاحق ہوں گے جن کا اللہ نے وعدہ کیا ہے لیکن صحابہ کے جانے کے بعد۔

یہ تمام حدیثیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فضیلت اور ان کے رفعتِ درجہ کی اساس ہیں، بہت بڑی نشانی ہے کہ یہ جماعت کتنی مقدس اور کتنی محترم جماعت ہے۔ ان کے قلوب بالکل صاف ستھرے اور نظیف ہیں۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: «إِنَّ اللّٰهَ نَظَرَ إِلٰى قُلُوبِ الْعِبَادِ فَوَجَدَ قَلْبَ مُحَمَّدٍ مِّنْ خَيْرِ قُلُوبِ الْعِبَادِ فَاصْطَفَاهُ

[1] صحيح مسلم، حديث:2531.

لِرِسَالَتِهِ ثُمَّ نَظَرَ إِلَى قُلُوبِ الْعِبَادِ فَوَجَدَ قُلُوبَ أَصْحَابِهِ مِنْ خَيْرِ قُلُوبِ الْعِبَادِ فَاصْطَفَاهُمْ لِصُحْبَةِ نَبِيِّهِ» [1] جب اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا فیصلہ فرمایا تو پہلے پوری کائنات میں موجود لوگوں کے دلوں کو دیکھا۔ ان کے دلوں میں جھانکا کہ کس کا دل میری نبوت کے قابل ہے؟ کس کا دل صاف ستھرا، نظیف، مخلص اور مصفّٰی ہے۔ سب کے دلوں کو دیکھا۔ تو اللہ نے کیا پایا؟ «فَوَجَدَ قَلْبَ مُحَمَّدٍ» محمد ﷺ کے دل کو پایا۔ «مِنْ خَيْرِ قُلُوبِ الْعِبَادِ» پوری کائنات میں سب سے پاکیزہ اور مصفّٰی دل اپنے پیغمبر محمد ﷺ کا پایا۔ «فَاصْطَفَاهُ لِرِسَالَتِهِ» اللہ نے اس شخصیت کو اپنی رسالت کے لیے چن لیا۔ «ثُمَّ نَظَرَ إِلَى قُلُوبِ الْعِبَادِ» پھر اپنے بندوں کے دلوں کو دیکھا «فَوَجَدَ قُلُوبَ أَصْحَابِهِ مِنْ خَيْرِ قُلُوبِ الْعِبَادِ» تو اللہ نے دیکھا کہ پیغمبر کے صحابہ کے دل تمام لوگوں کے دلوں سے مصفّٰی ہیں، صاف ستھرے ہیں، پاکیزہ ہیں، نظیف ہیں، طاہر ہیں، مطہر ہیں اور بالکل مخلص ہیں۔ «فَاصْطَفَاهُمْ لِصُحْبَةِ نَبِيِّهِ» تو اللہ نے ان لوگوں کو اپنے پیغمبر کی صحبت کے لیے چن لیا، اپنے پیغمبر کی رفاقت کے لیے اور اپنے پیغمبر کی معیت کے لیے۔ اب تک میں نے دو باتیں سمجھائی ہیں: ① صحابی کی تعریف ② صحابی کا مقام اور صحابی کی فضیلت۔

تیسری منہجی بات یہ ہے کہ صحابہ کرام پر جرح کرنا، ان پر تنقید کرنا یا ان میں سے کسی ایک کو سب و شتم کا نشانہ بنانا، گالی گلوچ کرنا، اس کو علماء نے کفر قرار دیا ہے۔ ابوزرعہ الرازی بڑی چوٹی کے محدث ہیں، فرمایا کرتے تھے: «إِذَا رَأَيْتَ الرَّجُلَ يَنْتَقِصُ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَاعْلَمْ أَنَّهُ زِنْدِيقٌ» جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ

[1] مسند أحمد: 1/379.

نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے کسی صحابی کو گالی دے رہا ہے، ان پر تنقید کر رہا ہے، ان کی تنقیص شان کر رہا ہے، ان کی شان میں کمی پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ «فَاعْلَمْ أَنَّهُ زِنْدِيقٌ» تو جان لو کہ وہ شخص زندیق ہے۔ اس میں کفر ہے، وہ زنادقہ میں سے ہے۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ فرمایا: پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کی صحبت کا شرف اور ان کا وہ مقام جو اللہ نے بیان کیا قرآن اور حدیث میں، اس کا انکار ہے۔ قرآن و حدیث کا انکار کفر ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ بات دین پر حملہ ہے۔ یہ صحابہ کی تنقیص شان نہیں بلکہ دین کی تنقیص شان ہے۔ کیوں؟ فرماتے ہیں کہ ہم یہ بات جانتے ہیں کہ «أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ حَقٌّ» کہ اللہ کے پیغمبر حق ہیں۔ «وَ أَنَّ الْقُرْآنَ حَقٌّ» اور قرآن بھی حق ہے۔ اور پیغمبر علیہ السلام کی سنتوں اور قرآن پاک کو ہماری طرف منتقل کرنے والا کون ہے؟ یہ قرآن و حدیث ہمیں اس طرح نہیں ملا کہ اللہ نے ہمارے گھروں میں اتار دیا ہو یا پہنچا دیا ہو۔ بلکہ قرآن و حدیث کو اللہ کے پیغمبر سے لینے والے پیغمبر کے صحابہ ہیں۔ تو صحابہ کرام اس دین کو سب سے پہلے لینے والے اور آگے پہنچانے والے ہیں۔ تو اگر یہ پہلی جماعت ہی مجروح قرار دی جائے تو یہ جرح اس جماعت پر نہیں بلکہ دین پر ہے۔ کیونکہ خبر لانے والے کو دیکھا جاتا ہے کہ خبر لانے والا کون ہے؟ اگر وہ ضعیف اور کمزور ہے، تو اس کی خبر بھی کمزور اور ضعیف ہے۔ لہٰذا اگر صحابہ کرام اس لعن طعن کا محل ہیں، نشانہ ہیں تو پھر انھوں نے جو قرآن و حدیث ہم تک پہنچایا اس پر بھی یہ شبہ وارد ہو رہا ہے، اس کی بھی تنقیص لازم آ رہی ہے۔ یہ حملہ صحابہ پر نہیں بلکہ یہ حملہ دین پر ہے۔ یہ قرآن پر ہے، یہ حدیث پر ہے کیونکہ قرآن و حدیث کے ناقلین تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ «وَالْجَرْحُ بِهِمْ أَوْلَى» ثابت یہ ہوا کہ جو لوگ صحابہ پر جرح کرتے ہیں، وہ

خود جرح کے مستحق ہیں۔ ان کا یہ وار صحابہ پر نہیں بلکہ اللہ کے دین پر ہے۔ اور جو اللہ کے دین پر وار کرے گا وہ مجرم ہے، وہ عاصی ہے، وہ باغی ہے اور وہ خود جرح کا مستحق ہے۔[1] یہ قول ابوزرعہ الرازی کا ہے جو بڑی چوٹی کے محدث، بلا کے حافظ تھے، ان کے بارے میں ایک چھوٹا سا واقعہ ہے۔ ان کے ایک شاگرد نے ایک دفعہ جذبات میں آ کر کہہ دیا کہ میرے شیخ ابوزرعہ الرازی کو اگر ایک لاکھ حدیثیں زبانی یاد نہ ہوں تو میری بیوی کو طلاق۔ یہ عجیب بات کہہ دی۔ اب معاملہ ان تک پہنچا کہ آپ کو ایک لاکھ حدیثیں یاد ہیں یا نہیں؟ اگر یاد ہیں تو بیوی محفوظ ہے، اگر یاد نہیں تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ انھوں نے پوچھنے والوں سے کہا کہ «أَحْفَظُ مِأَةَ أَلْفِ حَدِيثٍ كَمَا يَحْفَظُ أَحَدُكُمْ قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ» کہ مجھے ایک لاکھ حدیثیں اس طرح یاد ہیں جیسے تم میں سے کسی کو قل ھو اللہ احد یاد ہوتی ہے۔[2] «سَنَدًا وَ مَتْنًا» اتنے بڑے محدث، بلا کا ان کا حافظہ۔ یہ قول ایک بڑا تاریخی قول ہے۔ صحابہ کی تنقیصِ شان کرنے والا درحقیقت مجرم ہے جو اس دین پر حملے کر رہا ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی ان احادیث کی روشنی میں تعظیم کے اور محبت کے مستحق ہیں۔ ان کی تعظیم اور ان سے محبت یہ دین کی تعظیم اور محبت ہے۔ ان کا احترام دین کا احترام ہے۔ ان کی محبت اللہ اور اس کے رسول کی محبت ہے۔

امام اہل السنۃ اور بڑی چوٹی کے محدث امام احمد بن حنبل کا قول ہے۔ جو امام بخاری جیسے محدث کے استاد ہیں۔ فرمایا کرتے تھے: «مَنْ سَبَّ أَصْحَابَ رَسُولِ اللّٰهِ هُوَ مُبْتَدِعٌ رَافِضِيٌّ» جو اللہ کے پیغمبر کے کسی صحابی کو گالی دے، ان پر جرح

[1] اعتقاد أهل السنة في الصحابة، ص: 29. [2] سير أعلام النبلاء: 69/13، و معاني الأخيار لأبي محمد الحنفي: 320/3.

کرے، وہ بدعتی اور رافضی ہے۔ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ ہمارا چار طرح کا تعلق ہونا چاہیے۔ یہ چاروں باتیں نوٹ کرلو۔ یہ چاروں باتیں منہج اہل السنہ ہیں۔ ہمارے عقیدے کا حصہ ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ① **حُبُّهُمْ سُنَّةٌ**: ان سے محبت کرنا اللہ کے پیغمبر ﷺ کی سنت ہے۔ اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا فرمان: «اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِي أَصْحَابِي لَا تَتَّخِذُوهُمْ غَرْضًا بَعْدِي فَمَنْ أَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّي أَحَبَّهُمْ وَ مَنْ أَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِي أَبْغَضَهُمْ»[1] میرے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈر کر رہنا۔ میرے صحابہ کے بارے میں اللہ کا خوف پیدا کرلو۔ «لَا تَتَّخِذُوهُمْ غَرْضًا بَعْدِي» اور میرے بعد میرے صحابہ پر تنقید نہ کرنا، ان پر جرح نہ کرنا، انھیں سب وشتم نہ کرنا۔ «فَمَنْ أَحَبَّهُمْ» جو ان سے محبت کرے گا۔ «فَبِحُبِّي أَحَبَّهُمْ» اس نے صحابہ سے اس لیے محبت کی کہ اسے مجھ سے محبت ہے۔ کس سے؟ محمد رسول اللہ ﷺ سے۔ جو صحابہ سے محبت کرے گا، اس لیے کرے گا کہ اسے مجھ سے محبت ہے۔ «فَمَنْ أَحَبَّنِي فَقَدْ أَحَبَّ اللّٰهَ» اور جس شخص نے مجھ سے محبت کرلی، اس نے اللہ سے محبت کرلی۔ یہ صحابہ کی محبت اللہ کے پیغمبر کی محبت ہے اور اللہ کے پیغمبر کی محبت، اللہ کی محبت ہے۔ «وَمَنْ أَبْغَضَهُمْ» جو شخص ان سے بغض رکھے گا۔ «فَبِبُغْضِي أَبْغَضَهُمْ» اس نے صحابہ سے اس لیے بغض رکھا کہ اسے مجھ سے بغض ہے۔ «وَمَنْ أَبْغَضَنِي فَقَدْ أَبْغَضَ اللّٰهَ» اور جو شخص مجھ سے بغض رکھے گا، اس نے اللہ سے بغض رکھا۔ صحابہ کا بغض میرا بغض ہے اور میرا بغض اللہ کا بغض ہے۔ صحابہ سے عداوت، میری عداوت ہے اور میری عداوت اللہ کی عداوت ہے۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔ یہ جماعت

[1] جامع الترمذي، حديث: 3862.

محبت کے قابل ہے۔ اس جماعت سے محبت اللہ کے پیغمبر کی محبت ہے اور اللہ کے پیغمبر کی محبت اللہ کی محبت ہے۔ اس جماعت کا بغض اللہ کے پیغمبر کا بغض ہے اور اللہ کے پیغمبر کا بغض اللہ کا بغض ہے۔ اور فعلاً اس قوم میں یہ سارے بغض موجود ہیں۔ ان کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ جبریل امین درحقیقت وحی لے کر آئے تھے علی رضی اللہ عنہ کے پاس، ان سے غلطی ہوگئی اور وہ محمد ﷺ کے پاس آگئے۔ یہ بغض ہے یا نہیں؟ محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ بغض دلوں میں چھپا ہوا ہے۔ اور پھر یہ بغض جبریل علیہ السلام کے ساتھ بھی ہے۔ اور بھیجنے والے پروردگار کے ساتھ بھی ہے۔ سب پر تنقید لازم آرہی ہے کہ اللہ نے کس کا انتخاب کیا جس کے پاس تمیز ہی نہیں تھی کہ وحی کس کے پاس لے کر جانی ہے۔ وحی بھی غلط اور وحی کا محل بھی غلط۔ بھیجنے والا بھی غلط اور لانے والا بھی غلط۔ یہ بغض کی ایک لمبی داستان ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ «حُبُّهُمْ سُنَّةٌ» صحابہ کی محبت سنت ہے۔ صحیح بخاری میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے: «آيَةُ الْإِيمَانِ حُبُّ الْأَنْصَارِ وَآيَةُ النِّفَاقِ بُغْضُ الْأَنْصَارِ» کہ انصار صحابہ کی محبت ایمان کی نشانی ہے اور انصار صحابہ کا بغض نفاق کی نشانی ہے۔[1] جو شخص انصار صحابہ سے محبت کرے گا تو وہ اس کے ایمان کی دلیل ہے اور جو شخص انصار صحابہ سے بغض رکھے گا، وہ منافق ہے۔ یہ حدیث بھی صحابہ سے محبت کی ایک بڑی قوی دلیل ہے۔ فرمایا کہ «حُبُّهُمْ سُنَّةٌ» صحابہ سے محبت کرنا سنت ہے۔ اور دوسری چیز: «وَالدُّعَاءُ لَهُمْ قُرْبَةٌ» اور صحابہ کے لیے دعا مانگنا اللہ کی قربت ہے۔ تو اللہ رب العزت ایسے لوگوں سے محبت کرے گا جو صحابہ کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔ ان کا نام آجائے تو رضی اللہ عنہم کہتے ہیں۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین کہتے ہیں۔ یا اللہ! ان

[1] صحيح البخاري، حديث: 17 و صحيح مسلم، حديث: 74.

سے راضی ہو جا۔ اپنی رضا عطا فرما دے۔ تو ان کے لیے دعائیں مانگنا اللہ کی رضا کی، رحمت کی، ان کا نام لے کر رضی اللہ عنہم کہنا، یہ اللہ کی قربت ہے۔ وہ لوگ اللہ کی محبت اور اس کے قرب کے مستحق ہیں جو صحابہ کا نام لے کر ان کے لیے دعائیں مانگتے ہیں۔ اور یہ بھی ایک منہج ہے اہل السنہ کا کہ جب بھی صحابہ کا نام لو ان کے لیے دعا ضرور کرو۔ رضی اللہ عنھم ضرور کہو۔ اگر ان کا نام لکھو تو کتابت میں وہ دعا بھی لکھو۔ بعض لوگ صرف ''ر'' اور ''رض'' (ؓ) لکھ دیتے ہیں اور اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ صحابی کا نام لکھا اور آگے را اور ضاد لکھ دیا۔ یہ درست نہیں، یہ غلط ہے۔ یہ اغیار کی سازش ہے۔ پوری دعا لکھو رضی اللہ عنہم۔ جب صحابہ کا نام آئے رضوان اللہ علیہم اجمعین، رضی اللہ عنہم کہو، اللہ ان سب سے راضی ہو جائے۔ فرمایا کہ ان کے لیے دعا کرنا قرب ہے، اللہ کی محبت کی نشانی ہے۔ اور تیسری چیز کیا ہے؟ «وَالْاِقْتِدَاءُ بِهِمْ وَسِيلَةٌ» ان کی اقتدا وسیلہ ہے۔ کس چیز کا؟ جنت کے حصول کا، کامیابی کا، دنیا اور آخرت کی کامیابی کا وسیلہ ہے۔ ان کی پیروی ذریعہ اور واسطہ ہے اللہ کی رضا کا، جنت کے حصول کا اور دنیا اور آخرت کی کامیابی کا۔ صحابہ کے تعلق سے سب سے اہم نکتہ اور سب سے اہم منہجی بات یہ ہے کہ صحابہ کرام کی اقتدا کی جائے۔ اس پر قرآن شاہد عدل ہے۔ سورۂ بقرہ میں منافقین کے ذکر میں فرمایا کہ ﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ﴾[1] جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جیسے لوگ ایمان لائے۔ اس میں کون ایمان لائے تھے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایمان لائے تھے۔ تم بھی ایمان لاؤ، کیسے؟ جیسے یہ لوگ ایمان لائے۔ ویسے تم بھی ایمان لاؤ۔ اس کا معنی کیا ہے؟ کہ صحابہ کا ایمان مثالی ایمان تھا۔ اگر ان کے ایمان میں کوئی جھول

[1] البقرة 2:13.

ہوتا، کوئی قباحت ہوتی، کسی بھی دور میں ان کے ایمان میں کوئی اضطراب ہوتا تو وہ قرآن جو قیامت تک منبر ومحراب پر پڑھا جائے گا، اس قرآن میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کے ایمان کو مثالی ایمان کیوں قرار دیا؟ کہ جیسے یہ لوگ ایمان لائے ویسے تم ایمان لاؤ۔ تمھارا ایمان ان جیسا ہونا چاہیے۔ تو صحابہ کا ایمان مثالی ایمان تھا۔ ہمارا یہ فرض منصبی ہے کہ ہم ایمان لائیں اور ہمارے ایمان کی کیفیت، ہمارے ایمان کا طریقہ، ہمارے ایمان کی صفت بالکل صحابہ کرام جیسی ہو، ان کا ایمان امت کے لیے مثال، نمونہ اور آئیڈیل ہے۔ اور یہ صحابہ کی سیرت کا سب سے بڑا منہج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جابجا اس بات کو ذکر کیا۔ فرمایا کہ ﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۝﴾ [1] کہ جو لوگ رسول ﷺ کی نافرمانی کریں گے، ﴿مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى﴾ ہدایت کے واضح ہونے کے بعد، ہدایت کیسے واضح ہوئی اور کس کے ذریعے واضح ہوئی؟ آگے فرمایا: ﴿وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ اور وہ مومنین کے راستے کے علاوہ کسی اور راستے کی اتباع کریں۔ رسول کا ذکر، مومنین کا ذکر۔ رسول کی نافرمانی کریں اور مومنین کے راستے کو چھوڑ کر کسی اور کے راستے کا تعین کرلیں تو رسول کے دور میں مومنین کون تھے؟ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے۔ اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے صحابہ کے ایمان کو مثالی ایمان قرار دیا۔ تو اگر رسول کی نافرمانی کریں اور صحابہ کے راستے کو چھوڑ کر کسی اور کی راہ کو اپنائیں تو ﴿نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۝﴾ جس راہ پر وہ چلیں اس راہ کو ہم ان کے لیے دراز کردیں گے، ڈھیل دے دیں گے،

[1] النساء 4:115.

رسی چھوڑ دیں گے کہ چلو کہاں تک چلتے ہو۔ جو چاہو کرتے پھرو لیکن ایک وقت آئے گا ﴿نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ﴾ ان کو اٹھا کر جہنم میں ڈال دیں گے۔ اس آیت کریمہ میں بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایمان کو، ان کے طریقے کو، ان کے منہج کو مثال بنا کر پیش کیا۔ ایک اور مقام ملاحظہ ہو۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْھُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ [1] دو گروہوں کا ذکر کیا۔ ایک مہاجرین کا، ایک انصار کا۔ جنھوں نے مکہ چھوڑا اور مدینے آئے اور جنھوں نے مدینے میں مہاجرین کا استقبال کیا۔ اپنے گھروں کے دروازے کھول دیے اور ایثار کی عظیم مثالیں قائم کردیں۔ یہ دو گروہ ہیں۔ یہ دونوں صحابہ کے گروہ ہیں۔ صحابہ کی جماعتیں ہیں۔ فرمایا کہ یہ دو جماعتیں اور تیسری جماعت کون سی؟ ﴿وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْھُمْ﴾ تیسری جماعت ان لوگوں کی ہے جو ان کے نقش قدم کے پیروکار بنیں۔ ان کی اتباع کریں، ان کے منہج کو اپنائیں، ان جیسا ایمان لائیں، ان جیسا عمل کریں، ان جیسا عقیدہ ہو، ان جیسا منہج ہو، ان جیسے اخلاق ہوں، ان جیسا کردار ہو، ان جیسی معیشت ہو، ان جیسی تجارت ہو۔ فرمایا کہ تیسرا گروہ یہ ہے جو ان کا پیروکار بنے۔ کیا ہے ان کا حکم؟ ﴿رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ اللہ ان سے راضی ہے اور یہ اللہ سے راضی ہیں۔ اللہ ان سے راضی کیوں ہے؟ انھوں نے عظیم قربانیاں دیں۔ انصار کا منہج، مہاجرین کا اور ان کا اتباع کرنے والوں کا منہج عظیم الشان ہے۔ لہٰذا اللہ ان سے راضی ہے اور یہ اللہ سے راضی ہیں۔ یہ اللہ سے راضی کیسے ہوں گے؟ کہ جب یہ اللہ کے پاس جائیں گے اللہ ان کو اتنا دے گا، اتنا نوازے گا کہ یہ خوش ہوجائیں گے۔ دنیا کے دکھ بھول جائیں گے۔

[1] التوبة 9:100.

دنیا کے سپنے بھول جائیں گے۔ یہ طعنے، سب وشتم اور یہ خون ریزیاں سب بھول جائیں گے اور اللہ کے دیے ہوئے انعامات پر خوش اور راضی ہوجائیں گے۔ تو اس مقام پر اللہ کی رضا صرف تین جماعتوں کے بیچ میں منحصر ہے۔ ایک انصار کی جماعت، دوسری مہاجرین کی اور تیسری ان کی جو ان کے نقش قدم کے پیروکار ہیں۔

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان، ان کا عقیدہ اور منہج، ان کی سیاست اور خلق، ان کی معیشت اور معاشرت یہ سب کے سب مثال ہیں پوری امت کے لیے۔ لہٰذا امت کا کوئی فرد امریکہ میں ہو، افریقہ میں ہو، ایشیا میں ہو، عربی ہو، عجمی ہو، مشرق میں ہو، مغرب میں ہو، شمال میں ہو، جنوب میں ہو، اگر وہ صحابہ کے منہج کا پیروکار ہے تو اللہ کی رضا کا مستحق ہے اور اگر وہ صحابہ کے منہج کا پیروکار نہیں ہے تو اللہ کے غضب اور اس کی لعنتوں کا مستحق ہے۔ یہ آیت کریمہ اس اہم نکتے کی نشان دہی کر رہی ہے۔

ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا: ﴿فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾ [1] کہ یہ لوگ اگر ایمان لائیں، کیسا؟ جیسا تم ایمان لائے ہو، مخاطب صحابہ ہیں۔ ان کا ایمان اگر ویسا ہو جیسا تمھارا ہے، یعنی صحابہ کا ﴿فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾ پھر یہ میری فہرست میں ہدایت یافتہ ہیں۔ میری لسٹ میں ہدایت یافتہ وہ ہے جس کا ایمان صحابہ کے ایمان جیسا ہو۔ تو اس اہم منہجی نکتے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ان تمام آیتوں کی تفسیر اور تشریح رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث ہے۔ یہ حدیث اگر آج ہم پلے باندھ لیں تو سارے اختلافات ختم ہوسکتے ہیں۔ منہج حق واضح ہوتا ہے۔ جنت کا پروگرام سمٹ کر ہمارے سامنے آسکتا ہے۔ بلکہ جنت ہمارے سامنے کھڑی ہے۔ اگر یہ حدیث

[1] البقرة 2:137.

ہم سمجھ لیں جو حدیثِ فِرَق کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت میں فرقوں کے وجود کی نشان دہی کی۔ اس میں فرمایا کہ یہودیوں کے اکہتر فرقے تھے۔ عیسائیوں کے بہتر فرقے تھے اور میری امت کے تہتر فرقے ہوں گے۔ فرمایا: «كُلُّهُمْ فِي النَّارِ» سارے جہنمی ہیں۔ «إِلَّا مِلَّةً وَّاحِدَةً» سوائے ایک کے۔ تہتر میں سے بہتر جہنمی ہیں صرف ایک جنتی ہے۔ صحابہ نے پوچھا: «مَنْ هِيَ يَارَسُولَ اللّٰهِ!» یارسول اللہ! وہ کون ہیں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «مَا أَنَا عَلَيْهِ وَ أَصْحَابِي» [1] کہ وہ لوگ ہیں جو اس چیز پر قائم ہوں جس پر آج میں اور میرے صحابہ قائم ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ حدیث قاطع النزاع ہے۔ اگر پوری کائنات کے سامنے یہ ایک ہی حدیث ہوتی اور اس کو اخلاص سے لوگ سمجھ لیتے تو یہ ایک ہی حدیث تمام فرقوں کی نفی کر دیتی ہے اور منہج حق واضح کر دیتی ہے۔ حق وہ ہے جو صحابہ کے پاس تھا۔ حق وہ ہے جس پر صحابہ قائم تھے۔ اب آپ حنفی ہیں، شافعی ہیں، مالکی ہیں، حنبلی ہیں، یہ سارے ائمہ صحابہ کے دور میں تھے؟ نہیں، یہ بعد کی پیداوار ہیں۔ پھر ہم انھیں کیوں پکڑے بیٹھے ہیں؟ یہ حنفی، شافعی، مالکی اور سہروردی، نقشبندی، جعفری، یہ سارے وجود بعد کے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: طائفہ منصورہ، جنت کی جماعت، ناجی گروہ، ناجی فرقہ وہ ہے جو اس چیز پر قائم ہوجائے جس پر آج میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں۔ اور صحابہ کی سیرت وکردار ہمارے سامنے ایک کھلی کتاب کی مانند ہے۔ اس میں کوئی جھول نہیں۔ قرآن وحدیث واضح ہے اور صحابہ کا منہج بھی واضح ہے۔ ان کا منہج قرآن وحدیث کے مطابق ہے۔ اب کوئی صحابی حنفی تھا؟ کوئی شافعی تھا؟ کوئی مالکی تھا؟

[1] جامع الترمذي، حديث:2640 و2641، و سنن أبي داود، حديث:4596.

کوئی جعفری تھا؟ کوئی نقشبندی تھا؟ کوئی سہروردی تھا؟ یہ ساری باتیں صدیوں بعد پیدا ہوئیں۔ صحابہ ان سے مبرا تھے، پاک تھے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اصحابِ فِرَق آج صرف اس ایک حدیث پر غور کرلیں جو قرآن کی ان ساری آیتوں کی تفسیر ہے، سارے اختلافات، نزاعات، فرقے، سب ختم ہو جائیں گے اور جنت کا پروگرام نکھر کا ہمارے سامنے آجائے گا۔ سبحان اللہ! رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «أُعْطِيتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ» اللہ نے مجھے جوامع الکلم دیے ہیں۔ جوامع الکلم کا معنی یہ ہے کہ بعض اوقات ایک لفظ بول کر، جنت کا پورا پروگرام سمجھا سکتے تھے۔ یہ اللہ نے مجھے قدرت دی ہے۔ ایک ہی جملے میں ہدایت کا، حق کا، کامیابی کا، دنیا اور آخرت کی فلاح کا، جنت کے حصول کا، اللہ کی رضا کے حصول کا پورا پروگرام واضح کرسکتا ہوں اور واضح کردیا۔ منہج حق کیا ہے؟ طائفہ منصورہ کون ہے؟ کامیاب گروہ کون ہے؟ کامیاب جماعت کون ہے؟ فرمایا کہ وہ لوگ ہیں جو اس چیز پر قائم ہوں جس پر آج میں اور میرے صحابہ ہیں۔ وہ چاہے مشرق کا باسی ہو، مغرب کا ہو، شمال کا ہو، جنوب کا ہو، عربی ہو، عجمی ہو، گورا ہو، کالا ہو، آجر ہو، اجیر ہو، حر ہو، عبد ہو، کوئی بھی ہو، اس چیز کو تھام لے جس کو آج میں نے اور میرے صحابہ نے تھاما ہوا ہے، وہ کامیاب ہے۔ اب صحابہ کے دور میں کون سے فرقے تھے؟ کون سی درگاہیں تھیں؟ کون سی خرافات تھیں؟ کون سی بدعات تھیں؟ یہ ماتم اور یہ سینہ کوبی اور یہ ساری بدعات وخرافات اس دور میں تھیں؟ تو یہ ایک حدیث قاطع النزاع ہے۔ صحابہ کی رفعت، بلندیٔ درجہ کہ ان کے ایمان کو مثالی ایمان قرار دیا۔ اور رہتی دنیا تک ایک فارمولا، ایک کلیہ چھوڑ دیا گیا۔ جو اس چیز پر قائم ہے جس پر صحابہ قائم تھے، وہ جنتی گروہ ہے باقی سارے جہنمی ہیں۔

اللہ کا خوف کرو اور اس حدیث کو سامنے رکھو۔ اس حدیث کی روشنی میں اپنے عقیدے کا، کردار کا، منہج کا تعین کرو کہ صحابہ کا کردار کیا تھا؟ ان کا عقیدہ کیا تھا؟ روش کیا تھی؟ ان کی سیرت کا ملخص اور نچوڑ کیا ہے؟ اسے سامنے رکھو۔ یہ کامیابی کا بڑا اقرب اور قوی ترین راستہ ہے۔ صحابہ کی سیرتوں میں یہ سب سے اہم منہجی نکتہ ہے، یعنی بالکل ویسے بن جائیں جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے۔ اس لیے بعض سلف صالحین کے بارے میں کئی محدثین کا قول ہے کہ جب ہم ان کو دیکھتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم نے اللہ کے پیغمبر کے کسی صحابی کو دیکھ لیا۔ کون لوگ ہیں یہ؟ یہ وہ لوگ ہیں جو منہج اصحابِ رسول کو سمجھتے ہیں اور ویسا بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ صحابہ کرام اپنی پوری زندگی جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے پیروکار رہے۔ جو ان پر جرح کرتا ہے، ان پر تنقید کرتا ہے وہ خود جرح کا مستحق ہے۔ ان روافض کے واصل جہنم ہونے کے لیے ایک ہی حدیث کافی ہے۔

نبی علیہ الصلاۃ والسلام سفر میں تھے۔ اذان ہوگئی اور جماعت قائم ہونے والی ہے۔ صحابہ نے سوچا کہ اگر ہم وضو میں دیر لگائیں گے تو تکبیر تحریمہ ہم سے چھوٹ جائے گی۔ انھوں نے جلدی جلدی وضو کیا تاکہ تکبیر تحریمہ، تکبیر اولیٰ ہم سے مس نہ ہو جائے۔ جلدی وضو کرکے پہنچ گئے۔ ان کا وضو مکمل تھا۔ لیکن بعض کی ایڑیوں میں کچھ خشک نشان نظر آرہا تھا۔ حدیث میں ہے خشکی کی چمک دکھائی دی۔ ایک کی، دوسرے کی، تیسرے کی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «وَيْلٌ لِّلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ» [1] جن کی ایڑیوں میں خشکی ہے ان کے لیے جہنم کی ویل ہے۔ ویل جہنم کا طبقہ۔ جس کا معنی یہ کہ ہمیں وضو بڑے احتیاط سے کرنا چاہیے کہ کوئی حصہ خشک نہ رہ جائے۔ چاہے وہ ایک ناخن کے برابر ہی

[1] سنن أبي داود، حديث: 97، و سنن ابن ماجه، حديث: 450.

خشک کیوں نہ ہو۔ فرمایا کہ ان کے لیے جہنم کی ویل ہے۔ اب ان صحابہ سے تو سہواً یہ خشکی رہ گئی۔ انھوں نے جا کر ہاتھ گیلے کر کے اس خشکی کو ختم کر دیا اور ایڑیاں گیلی کر لیں۔ وضو مکمل ہو گیا۔ لیکن یہ رافضی قوم جان بوجھ کے پاؤں نہیں دھوتی۔ ان کا تو عقیدہ یہ ہے کہ پاؤں پر مسح کریں۔ جب مسح کرو گے تو سارا پاؤں خشک رہ جائے گا۔ ایڑیاں غلطی سے خشک رہنے والوں کے لیے وعید تھی کہ ان کے لیے جہنم کی ویل ہے اور جن کا پوری زندگی وضو مسح پر قائم ہو، انھوں نے کبھی پاؤں نہ دھویا ہو، ان کے لیے پھر کیسی ویل ہوگی اور کیسی وعید ہوگی؟

نبی ﷺ کا ایک اور فرمان ہے جو اسی فرمان سے مربوط ہے: «إِنَّ أُمَّتِي يَأْتُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ غُرًّا مُّحَجَّلِينَ مِنْ أَثَرِ الْوُضُوءِ» [1] میری امت قیامت کے دن آئے گی۔ ان کو یہ شرف حاصل ہوگا کہ ان کے وضو کے اعضاء چمک رہے ہوں گے۔ وضو میں پاؤں کو دھونا فرض ہے قرآن کہتا ہے۔ اب جنھوں نے ساری زندگی پاؤں پر مسح کیا ہو، ان کے اعضاء کیا چمکیں گے؟ وہ تو اس خوشخبری سے محروم ہیں۔ ان کے عقیدے کو چھوڑ دو، منہج کو چھوڑ دو، اس قوم کے واصل جہنم ہونے کے لیے یہ ایک ہی حدیث کافی ہے۔ صحابہ پر تنقید کرنے والا اور صحابہ پر جرح کرنے والا درحقیقت دنیا اور آخرت دونوں جہانوں کی وعیدوں کا مستحق ہے۔ اس لیے میں نے گزشتہ جمعے کہا تھا کہ جس سینے میں صحابہ کا بغض ہے وہ سینے قیامت تک پٹتے ہی رہیں گے۔ پیٹنے والے دوسرے نہیں خود اپنے ہاتھ ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے پیٹتے رہیں گے، ان کا قصور کیا ہے؟ قصور یہ ہے کہ ان سینوں میں صحابہ کا بغض ہے۔ صحابہ کی عداوت ہے۔ اس لیے

[1] صحیح مسلم، حدیث:246 و صحیح البخاري، حدیث: 136.

یہ سینے پٹتے ہی رہیں گے تو صحابہ کے تعلق سے یہ کچھ منہجی باتیں ہیں۔

ہاں صحابہ کی زندگی میں کچھ مشاجرات، کچھ تنازعات تھے۔ آپس میں جنگیں اور لڑائیاں ہوئیں، تنازعات کھڑے ہوئے، اس بارے میں امت کا موقف کیا ہونا چاہیے؟ منہج کیا کہتا ہے؟ «اَلسُّكُوتُ فِيمَا تَشَاجَرَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللّٰهِ» اس میں خاموشی اختیار کریں۔ اس میں لچھے دار بحثیں کرنے کی بجائے خاموشی اختیار کریں۔ ﴿تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ﴾ [1] یہ گروہ گزر چکا۔ انھوں نے جو عمل کیے وہ ان کے لیے۔ ان صحابہ کرام کے عمل کو برا نہیں کہہ سکتے۔ ان کے اختلافات کی ایک بنیاد تھی اور وہ ان کا اپنا اجتہاد تھا۔ ایک موقف درست سمجھا اس پر ڈٹ گئے، پھر اس موقف کی خاطر لڑائی اور قتال بھی ہوا۔ یہ ان کا اپنا اجتہاد تھا۔ اس اجتہاد کے تعلق سے رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ وَإِذَا حَكَمَ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ» [2] کوئی اجتہاد کرنے والا اجتہاد کرے اور درست کر جائے اس کے لیے دو اجر ہیں اور اگر وہ اجتہاد کرنے میں غلطی کر جائے اس کے لیے ایک اجر ہے۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان جو تنازعات اور بعض خصومات ہوئے وہ ان کے اجتہادی مسائل تھے۔ اس میں غلطی بھی ہو سکتی ہے اور درستی بھی ہو سکتی ہے۔ جو اجتہاد درست کر گئے ان کے لیے دو اجر ہیں اور جو اجتہاد غلط کر گئے ان کے لیے ایک اجر ہے۔ اور بدعت کوئی نہیں کیونکہ سارے معاملات ان کے اجتہاد پر قائم ہیں اور اجتہاد کے بارے میں نبی علیہ السلام نے خود فرما دیا کہ اجتہاد درست بھی ہو سکتا ہے غلط بھی ہو سکتا ہے۔ درست اجتہاد پر دہرا اجر ہے۔ ایک اجر اجتہاد کرنے

[1] البقرۃ 2:141. [2] صحیح البخاري، حدیث:7352 و صحیح مسلم، حدیث: 1716.

کا دوسرا درست کرنے کا اور غلط اجتہاد پر اکہرا اجر ہے کہ اجتہاد کیا، کوشش کی غلطی ہوگئی، اللہ غلطی کو معاف کردے گا اور کوشش اور اجتہاد کا ایک اجر عطا فرمادے گا۔ ان تنازعات کے بارے میں جو صحابہ کرام کے مابین قائم ہوئے، امت کا یہ موقف ہونا چاہیے۔ قرآن حکیم نے صحابہ کی تین قسمیں بیان کیں۔ اور تینوں قسموں کے بارے میں حکم لگایا۔ اب صحابہ تین قسم کے ہیں۔ فرمایا کہ: ﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيٰرِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ [1] کہ فقراء مہاجرین، ہجرت کرنے والے، اللہ اس بات کا اعتراف کررہا ہے کہ انھوں نے دین اور ایمان کی خاطر اپنے گھر بار اور اپنے مال چھوڑ دیے بلکہ بعض نے اپنے خونی رشتے توڑ دیے۔ بیوی مسلمان ہے شوہر مسلمان نہیں ہے، بیوی شوہر کو چھوڑ کر آگئی۔ بھائی مسلمان ہے دوسرا کافر ہے، بھائی بھائی کو چھوڑ کر آگیا۔ بیٹا باپ کو چھوڑ کر آگیا، باپ بیٹے کو چھوڑ کر آگیا۔ اسلام کی خاطر اپنے رشتے توڑ دیے۔ اپنے مال چھوڑ دیے۔ اپنے گھر بار چھوڑ دیے۔ قوم برادری چھوڑ دی، اللہ اعتراف کررہا ہے۔ فرمایا کہ ﴿وَيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ پھر وہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مددگار ہیں۔ دین اور اللہ کی وحی کے مددگار تھے۔ قرآن و حدیث کے مددگار تھے اور ان کی شان بیان کی اور آخر میں فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ﴾ [2] یہ لوگ سچے ہیں۔ ان کی صداقت کا اللہ تعالیٰ نے اقرار کیا۔ ان کی صداقت کا اعتراف کیا کہ یہ لوگ سچے ہیں۔ یہ گواہی قیامت تک کے لیے محفوظ ہے۔ یہ ہیں مہاجرین صحابہ۔

دوسرے لوگ کون ہیں؟ انصار۔ فرمایا کہ ﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ

[1] الحشر 59:8. [2] الحشر 59:8.

قَبْلِهِمْ﴾ [1] دوسری جماعت وہ ہے ان مہاجرین کے مدینہ آنے سے پہلے ایمان اور دار، یعنی مدینہ میں جگہ پکڑ چکے تھے۔ ایمان قبول کرچکے تھے اور مدینہ میں جگہ پکڑ چکے تھے۔ مدینہ اپنا وطن بنا چکے تھے۔ اس گھر کی سکونت اختیار کرنا اپنے لیے عزت اور افتخار کا باعث بنا چکے تھے اور اللہ کے پیغمبر کے لیے کوشش کررہے تھے کہ ہجرت کرکے مدینے آجائیں۔ ان کے آنے سے پہلے ایمان کو اپنے دلوں میں جگہ دے چکے تھے۔ یہ قرآن کہتا ہے۔ اور یہ آنے والوں سے محبت کرتے تھے۔ ان مہاجرین پر انھوں نے ایثار کیا اور پوری زندگی انھیں اپنے اوپر ترجیح دی۔ ان کو کھلایا، پلایا، تجارتوں میں شریک کیا حتیٰ کہ اگر کسی کی دو بیویاں ہیں تو اپنے مہاجر بھائی کی خاطر ایک بیوی کو طلاق دینے پر تیار ہوگیا کہ اس سے نکاح کرلے۔ ایثار کی عجیب مثالیں۔ پوری زندگی قربانیاں دیں۔ خالی صفحہ اللہ کے پیغمبر کو دے دیا۔ آپ مدینے آجائیں۔ شرطیں جو چاہیں تحریر کریں۔ لیکن آپ مدینے آجائیں۔ پھر پوری زندگی اللہ کے پیغمبر کا دفاع کیا۔ اللہ کے پیغمبر کی حفاظت کی، صحابہ کرام پر جانیں قربان کردیں۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ سب سے زیادہ قربانیاں انصار صحابہ نے پیش کیں۔ جنگ احد میں ستر صحابہ شہید ہوئے، اکثر انصاری تھے ایک دو کے علاوہ۔ اور پھر بئر معونہ کے موقع پر ستر قراء صحابہ شہید ہوئے، وہ سب انصاری تھے۔ جنگ یمامہ میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں ستر صحابی شہید ہوئے۔ سب کے سب انصاری تھے۔ فرماتے ہیں کہ دین اسلام پر سب سے زیادہ قربانیاں پیش کرنے والے انصار صحابہ تھے۔ اپنے اوپر ترجیح دی۔ مہاجرین سے محبت کی۔ ان کی مدد کی، ان کو کھلایا اور پلایا۔ یہ انصار صحابہ کی سیرت کا اعجاز ہے۔

[1] الحشر 59:9.

اور پوری زندگی اللہ کے نبی سے جب بھی طلب کیا دین طلب کیا۔ دنیا کبھی طلب نہیں کی۔ صرف ایک موقع آیا دنیا کی طلب کے لیے پہنچے۔ انصار کی ایک جماعت دنیا کی طلب کے لیے اللہ کے پیغمبر کے پاس گئی۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے چہروں کو دیکھا، ان کے چہروں پر حاجت پڑھ لی کہ یہ آج کچھ مانگنے آئے ہیں۔ ان کے چہروں پر کچھ سوال ہے۔ بڑا خوش ہوئے فرمایا کہ جو سوال کرو گے پورا ہوگا۔ جو حاجت پیش کرو گے عطا ہوگی۔ جب انصار نے نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے اتنی بڑی گارنٹی سنی تو دنیا کا موضوع بھول گئے۔ وہ موضوع کیا تھا کہ اللہ کے نبی دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مدینے شہر سے پانی کے چشمے جاری کردے، پانی دور ہے، پانی لانے میں ہمیں تکلیف ہوتی ہے۔ مدینے شہر سے پانی کے چشمے جاری ہوجائیں تاکہ ہمارے باغ قریب سے سیراب ہوجائیں۔ یہ سوال کرنے آئے تھے۔ لیکن نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی زبان سے اتنی بڑی گارنٹی سنی تو دنیا کا یہ معاملہ بھول گئے اور کیا سوال کیا؟ یارسول اللہ! ہماری ایک ہی حاجت ہے، ایک ہی طلب ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ دعا کردیں کہ اللہ ہمارے گناہوں کو معاف کردے۔ یہ انصار صحابہ ہیں۔ اللہ کے نبی ﷺ نے دعا کردی: «اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْأَنْصَارِ وَلِأَبْنَاءِ الْأَنْصَارِ وَأَبْنَاءِ أَبْنَاءِ الْأَنْصَارِ» یا اللہ! انصار کو معاف کردے، انصار کے بیٹوں کو معاف کردے، انصار کے پوتوں کو معاف کردے۔ انصار نے کہا: «وَلِمَوَالِينَا» یارسول اللہ! ہمارے غلاموں کے لیے بھی دعا کردیں۔ فرمایا کہ «وَلِمَوَالِي الْأَنْصَارِ» [1] یا اللہ! انصار کے غلاموں کو بھی معاف کردے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «آيَةُ الْإِيمَانِ حُبُّ الْأَنْصَارِ» [2] انصار کی محبت ایمان کی نشانی ہے۔ اسی لیے جب نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے

[1] صحیح مسلم، حدیث:2506. [2] صحیح البخاري، حدیث: 17.

انتقال کی گھڑی آگئی، انصاری صحابہ مسجد میں جمع ہوگئے، اکٹھے ہوگئے اور اللہ کے نبی کو دیکھ کر آنے والوں سے پوچھتے کہ پیغمبر علیہ السلام کا کیا حال ہے؟ اور انصار صحابہ مسجد میں جمع ہوکر رو رہے ہیں۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کو اطلاع دی گئی کہ انصار صحابہ سے مسجد بھری ہوئی ہے۔ اور سب کے سب پریشانی میں رو رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو بڑی نقاہت تھی۔ بڑی کمزوری تھی۔ لہٰذا آپ نے غسل فرما کر فرمایا کہ مجھے سہارا دے کر مسجد میں پہنچا دو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک دفعہ پوچھا: آج کیا دن ہے؟ لوگوں نے کہا: جمعرات۔ رو پڑے۔ کہا: کیوں روتے ہو؟ کہا کہ «وَمَا يَوْمُ الْخَمِيسِ؟» تمھیں کیا معلوم جمعرات کیا ہے؟ «اِشْتَدَّ بِرَسُولِ اللّٰهِ ﷺ وَجَعُهُ» آج کے دن اللہ کے پیغمبر کا مرض سخت ہوگیا۔ وہ آخری بار جب ہم نے اللہ کے پیغمبر کو منبر پر چڑھتے ہوئے دیکھا۔ سرخ پٹی آپ کے سر پر لپٹی ہوئی ہے۔ اور آپ منبر پر آکر بیٹھ گئے۔ آکر چند جملے ارشاد فرمائے، خطبہ دیا، فرمایا کہ «أُوصِيكُمْ بِالْأَنْصَارِ فَإِنَّهُمْ كَرِشِي وَعَيْبَتِي» میں تمھیں وصیت کرنے آیا ہوں کہ انصار کا خیال رکھنا، اچھے سلوک سے پیش آنا۔ ان کا خیال رکھنا۔ «فَإِنَّهُمْ كَرِشِي وَعَيْبَتِي» یہ دنیا میں میرے بڑے باوفا اور رازدار ساتھی تھے۔ میرے دل کے ساتھی تھے۔ بڑے باوفا ساتھی تھے۔ «قَدْ قَضَوُا الَّذِي عَلَيْهِمْ وَبَقِيَ الَّذِي لَهُمْ» [1] جو ان کے فرائض تھے انھوں نے خوب ادا کردیے، ان کے حقوق باقی رہ گئے ہیں، وہ تم ادا کرو۔ ان کی حق تلفی نہ کرنا، اپنے فرائض سارے ادا کردیے، اللہ کے پیغمبر کی مدد کردی، صحابہ پر ایثار کردیا، پوری زندگی قربانیاں دیتے گئے، فرائض ادا ہوگئے، حقوق تم ادا کرنا۔ یہ انصار کی جماعت بڑی رازدان جماعت

[1] صحیح البخاري، حدیث:3799.

ہے، یہ میرے دل کی ساتھی ہے۔ اسی لیے ایک موقع پر جب ایک انصاری نے سبقت لسانی میں اور تیزی میں آکر کہہ دیا کہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے حنین کا مال غنیمت اپنی قوم کو دے دیا، ہمیں چھوڑ دیا۔ ہماری تلواروں میں آگے تک حنین کے کفار کا خون لگا ہوا ہے۔ جہاد ہم نے کیا، ان کو قتل ہم نے کیا اور مال غنیمت ہم نے اکٹھا کیا، مال غنیمت اللہ کے پیغمبر نے اپنی قوم کو دے دیا۔ مکہ کے نومسلموں کو دے دیا۔ یہ ایک نوجوان کی زبان سے جملہ نکلا۔ بڑا پریشان کن۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کو بڑا افسوس ہوا۔ ایک قبے میں انصار صحابہ کو جمع کرلیا۔ اور جمع کر کے فرمایا کہ یہ تم نے کیا بات کہہ دی؟ انھوں نے کہا: یارسول اللہ! ہم نے نہیں کہی۔ یہ ایک نوجوان کی بات ہے۔ یہ پورے انصار کی بات نہیں ہے۔ یہ اس کی ذاتی بات ہے جو سبقتِ زبان میں ادا ہوگئی۔ اور وہ پشیمان ہے، نادم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَلَمْ أَجِدْكُمْ ضُلَّالًا فَهَدَاكُمُ اللّٰهُ بِي» میرے سوال کا جواب دو کہ جب میں تمھارے پاس آیا، کیا تم گمراہ نہیں تھے؟ تمھیں اللہ نے میرے ذریعے ہدایت دی۔ «وَكُنْتُمْ عَالَةً فَأَغْنَاكُمُ اللّٰهُ بِي» تم فقیر تھے، تمھیں اللہ نے میرے ذریعے غنی اور مال دار کردیا۔ جنگیں ہوئیں، فتوحات ہوئیں، غنیمت کے مال آئے، تقسیم ہوئے اور تم مالا مال ہوگئے۔ انصار افسوس بھی کر رہے ہیں اور ساتھ ساتھ کہہ رہے ہیں: «اَللّٰهُ وَ رَسُولُهُ أَمَنُّ» اللہ اور رسول کے بڑے احسانات ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہاں، تم ایک بات کہہ سکتے ہو کہ آپ بھی تو ہمارے پاس آئے تھے دھتکارے ہوئے، آپ کی قوم نے آپ کو نکال دیا، ہم نے آپ کو جگہ دی، ہم نے آپ کی عزت کی، ہم نے آپ کو کھلایا اور پلایا۔ تم یہ کہہ سکتے ہو، لیکن اے انصار! میں تم سے ایک بات کہنے والا ہوں جو تم سے چھپائے رکھی۔ بات یہ ہے کہ «أَلَا تَرْضَوْنَ

أَنْ يَذْهَبَ النَّاسُ بِالشَّاةِ وَالْبَعِيرِ وَتَذْهَبُونَ بِالنَّبِيِّ ﷺ إِلَى رِحَالِكُمْ» تمھیں یہ بات خوش نہ کرے گی کہ یہ لوگ اپنے گھروں میں جائیں، بکریاں لے کر، اونٹ لے کر، گائے لے کر، چاندی اور سونا لے کر اور تم لوگ اپنے گھروں میں جاؤ اللہ کے پیغمبر کو لے کر؟ «لَوْ سَلَكَ النَّاسُ وَادِيًا وَّ شِعْبًا لَسَلَكْتُ وَادِيَ الْأَنْصَارِ وَشِعْبَهَا» اگر لوگ ایک راہ پر چلیں اور انصار دوسری راہ پر چلیں تو میں سب کو چھوڑ کر انصار کے پیچھے جاؤں گا اور انصار کی راہ پر چلوں گا۔ فرمایا کہ «اَلْأَنْصَارُ شِعَارٌ وَّالنَّاسُ دِثَارٌ» باقی لوگ میرے اوپر کے کپڑے کی مانند ہیں اور انصار میرے لیے اندر کے کپڑے کی مانند ہیں جو بدن کے ساتھ چپٹا ہو۔ [1] یہ انصار صحابہ کا ایمان ہے۔ یہ ان کا عقیدہ، ان کا منہج، ان کا ایثار ہے۔

تو اللہ تعالیٰ نے تمام جماعتوں کی تعریف کی۔ مہاجرین بھی آگئے۔ انصار بھی آگئے اور کچھ صحابہ وہ تھے جو بعد میں آئے۔ اللہ پاک نے ارشاد فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ﴾ [2] جو لوگ بعد میں آئے، وہ کیا کہتے ہیں: اے اللہ! ہمارے ان بھائیوں کو معاف کردے جو ہم سے ایمان میں سبقت لے گئے، یعنی ایمان دار یہ بھی ہیں لیکن وہ لوگ ایمان میں سبقت لے گئے۔ ان کو بھی معاف کردے۔ تو یہ تینوں جماعتیں صحابہ کی۔ یہ صحابہ یا انصار ہیں یا مہاجرین ہیں یا بعد میں آنے والے۔ اللہ نے تینوں کا ذکر کیا۔ ایمان کے ساتھ ذکر کیا۔ ان کے لیے گواہیاں دیں صداقت کی اور کامیابی کی۔ جو ان پر تبرا کرے گا۔ آج کل محرم کے دن ہیں باطنی طور پر بڑا تبرا کیا جارہا ہے۔ سب وشتم کیا جارہا ہے، حقیقت میں وہ لوگ خود جرح کے قابل ہیں۔

[1] صحيح البخاري، حديث:4330، و صحيح مسلم، حديث:1061. [2] الحشر 10:59.

یہ کچھ منہجی نکتے تھے جو صحابہ کی سیرتوں کے بارے میں میں نے عرض کر دیے اور سب سے بڑی بات یہ واضح ہوتی ہے کہ آج بحمد اللہ منہج حق اور مسلک حق جماعت اہلحدیث کے پاس ہے کیونکہ صحابہ کے منہج کے پیروکار صرف اہلحدیث ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نہ کسی امام کی پیروی کی، نہ کسی کی تقلید کی۔ نہ کوئی درگاہ تھی، نہ کوئی خانقاہ۔ ایک اللہ کے پیغمبر کی شخصیت تھی جن کی اطاعت کرتے تھے۔ ایک ہاتھ میں قرآن اور ایک ہاتھ میں اللہ کے پیغمبر کی حدیث۔ بحمد اللہ اس منہج کے ہم پیروکار ہیں، اس منہج کے ہم حاملین ہیں۔ اللہ کے پیغمبر کی جماعت کا تسلسل آج جماعت اہلحدیث ہے۔ اللہ تعالیٰ اس جماعت کو قائم و دائم رکھے۔ اس دعوت کو قائم و دائم رکھے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں منہج صافی، عقیدۂ صافیہ اور جنت کا راستہ اپنانے کی توفیق عطا فرمادے۔ وہ ذاتی غلطیاں جو ہم میں پائی جاتی ہیں، اللہ تعالیٰ ان سے رجوع کرنے اور توبہ تائب ہونے کی توفیق عطا فرما دے۔

«وَأَقُولُ قَوْلِي هٰذَا وَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِي وَلَكُمْ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ»

ماہِ صفر کی بدعقیدگی

ماہِ صفر کی بدعقیدگی

خطبہ مسنونہ:

﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ۝﴾

''اگر تم شکر کرو اور ایمان لے آؤ تو اللہ تمھیں عذاب دے کر کیا کرے گا؟ اور اللہ بڑا قدر دان، خوب جاننے والا ہے۔''[1]

گناہوں کی مختلف اقسام ہیں۔ اور سب سے خطرناک قسم وہ ہے جس کا تعلق عقیدے کے ساتھ ہے۔ کج شکری اور بدعقیدگی سب سے بڑا گناہ ہے۔ کسی معاشرے میں اگر زنا عام ہوجائے تو اس کے مفاسد ہیں، لیکن اگر شرک عام ہوجائے تو اس کے مفاسد اس سے زیادہ ہیں۔ اس لیے عقیدے کی استقامت پر زور دیا گیا ہے اور جنت کے داخلے کو عقیدے کی سلامتی کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے۔ پیارے پیغمبر محمد رسول اللہ ﷺ نے انسانی جسم کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کا ذکر کیا ہے کہ اگر وہ درست ہے تو سب کچھ درست ہے، اگر وہ فاسد ہے تو ہر چیز فاسد ہے۔ «أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ»[2] وہ ٹکڑا انسان کا دل ہے۔ اور یہ دل عقیدے کا مرکز ہے۔ اخلاص کا مرکز ہے۔ اس کی اصلاح

[1] النسآء 4:147. [2] صحیح البخاري، حدیث: 52.

پر ہر چیز کی اصلاح قائم ہے اور اس کے فساد پر ہر چیز کا فساد قائم ہے۔

ایک بدعقیدگی جس کا تعلق اس صفر کے مہینے سے ہے، بہت ہی زیادہ مجرمانہ ہے، گویا اللہ رب العزت کو چیلنج کرنے کے مترادف ہے۔ صفر کے مہینے کو کچھ لوگ منحوس تصور کرتے ہیں۔ صفر کا مہینہ بھی بقیہ مہینوں کی طرح اور اس مہینے کے تمام دن بھی بقیہ دنوں کی طرح اللہ کی مخلوق ہیں۔ اللہ رب العزت کی کسی مخلوق کو منحوس قرار دینا بدعقیدگی بھی ہے اور خالق و مالک کو چیلنج کرنا بھی ہے۔ انسان بڑا بدنصیب ہے کہ اپنے نقصانات کو، اپنی بربادیوں کو اپنے اعمال کے ساتھ نہیں دنوں کے ساتھ جوڑتا ہے، مہینوں کے ساتھ جوڑتا ہے۔ جو بگاڑ اور فساد برپا ہوتا ہے اس کا تعلق دنوں اور مہینوں سے نہیں ہے بلکہ انسانوں کے اعمال سے ہے۔ حدیثِ قدسی ہے، اللہ پاک فرماتا ہے: «يُؤْذِينِي ابْنُ آدَمَ» ''ابن آدم مجھے بڑی تکلیف دیتا ہے۔'' اس تکلیف کا معنی یہ نہیں ہے کہ اللہ کو نقصان پہنچاتا ہے۔ یہ ساری کائنات اگر کفر کی اساس پر قائم ہوجائے اور اللہ رب العزت کی شان میں گستاخیاں شروع کردے، گالیاں شروع کردے تو اس کی شانِ ربوبیت اور الوہیت میں ایک ذرے کی کمی نہیں کرسکتی۔ اور پوری دنیا اگر عابد اور زاہد بن جائے اور ہر وقت اللہ رب العزت کی حمد وثنا میں محو رہے تو اس کی شان میں ایک ذرے کا اضافہ بھی نہیں کرسکتی۔ تو اللہ رب العزت کو ایذا پہنچانا یہ اللہ کے غضب کو دعوت دینا ہے۔ ابن آدم مجھے تکلیف دیتا ہے، «يَسُبُّ الدَّهْرَ» زمانے کو گالیاں دیتا ہے۔ دنوں کو برا بھلا کہتا ہے۔ فلاں دن منحوس ہے، فلاں دن شر ہے۔ «وَأَنَا الدَّهْرُ» حالانکہ زمانہ میں ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے زمانہ ہونے کا معنی کیا ہے؟ وہ حدیث میں خود آگے بیان ہورہا ہے: «أُقَلِّبُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ» ''رات اور دن کو میں پھیرتا ہوں۔''[1]

[1] صحیح البخاري، حدیث: 4826.

راتوں کا آنا، دنوں کا آنا، مہینوں کا تبدیل ہونا، یہ میرے امر سے ہے۔ زمانے کو برا بھلا کہنا میرے امر کو برا بھلا کہنا ہے۔ «أُقَلِّبُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ» راتوں اور دنوں کو میں پھیرتا ہوں۔ یہ معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے ''دہر'' ہونے کے کہ اللہ تعالیٰ «مُقَلِّبُ الدَّهْرِ» ہے۔ دہر کو پھیرتا ہے، زمانے کو چلاتا ہے۔ لیل ونہار کا نظام یہی دہر ہے تو اس دہر کو برا بھلا کہنا اللہ کو برا بھلا کہنا ہے۔ اس کی مماثل ایک اور حدیث ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «لَاتَسُبُّوا الرِّيحَ» ''ہوا کو گالی مت دو۔'' «فَإِنَّهَا تَأْتِي بِأَمْرِ اللّٰهِ» ''یہ اللہ کے امر سے آتی ہے۔'' ہوا نعمت ہے۔ اگر یہ آندھی کی شکل اختیار کرلے تو وہ اللہ کا امر ہے، اس کے کچھ اسباب ہیں۔ ان اسباب پر غور کرو۔ آندھی کو گالی مت دو۔ دریا کا پانی تمھارے لیے نعمت ہے۔ اس پر تمھاری زراعت کا انحصار ہے۔ وہی پانی اگر طغیانی میں آجائے تو پانی کو برا بھلا مت کہو، وہ تو اللہ کا امر ہے۔ اپنے اعمال پر اور اپنی حرکتوں پر غور کرو کہ ایسا کیوں ہوگیا؟ یہ طغیانی پیدا کیوں ہوئی؟ اس پر غور کرو۔ فرمایا کہ ہوا کو گالی مت دو۔ «فَإِنَّهَا تَأْتِي بِأَمْرِ اللّٰهِ» وہ اللہ کی مخلوق ہے اور اللہ کے امر سے آتی ہے۔ جب آندھی کے آثار دیکھو، بارش کے آثار دیکھو «فَاسْئَلُوا اللّٰهَ خَيْرَهَا فَاسْتَعِيذُوا بِهِ بِشَرِّهَا» [1] اللہ سے دعا کرو کہ یااللہ! جو اس میں خیر ہے، وہ ہمیں عطا فرمادے اور جو اس میں تیرے امر سے شر ہے، اس سے ہمیں محفوظ رکھنا۔ تو اللہ کی مخلوق کو گالی دینے کا کوئی جواز نہیں۔ صفر کا مہینہ اللہ کی مخلوق ہے، بقیہ ایام کی طرح اس کے ایام اللہ کے ایام ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے کسی دن کو، کسی مہینے کو نحس (منحوس) قرار دینا، بدعقیدگی ہے۔ اللہ رب العزت کو اس کی خلق (تخلیق) پر چیلنج ہے۔

[1] سنن أبي داود، حديث:4908، و ابن ماجه، حديث:3727.

اور میں نے عرض کیا، جس معاشرے میں بدعقیدگی کا رواج ہو، وہ معاشرہ کبھی فلاح کی بنیادوں پر قائم نہیں ہوسکتا۔ اگر عقیدے کی سلامتی حاصل ہو تو عمل کا بگاڑ قابلِ معافی ہوسکتا ہے۔ لیکن عقیدے کا بگاڑ قطعاً قابلِ معافی نہیں ہے۔ اس لیے اس تعلق سے اپنی اصلاح کرنا ضروری ہے۔ اور جو لوگ اس بدعقیدگی میں مبتلا ہیں درحقیقت وہ اللہ رب العزت کے نظام، اس کے امر اور اس کی خلق پر طعنہ زنی کرتے ہیں جو اللہ کے غضب کا موجب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ معاشرہ کامیابی اور کامرانی کی راہوں پر گامزن نہیں ہورہا بلکہ روز افزوں فتنوں میں اضافہ، عذاب میں اضافہ اور مفاسد میں اضافہ ہی ہورہا ہے، یہ سب اسی لیے ہے کہ ہم نے اپنے عقیدے سے بلکہ بدعقیدگی سے اپنے خالق اور مالک کو ناراض کردیا۔ صفر کا مہینہ اللہ کی خلق (تخلیق) ہے۔ اور ہم کہیں کہ یااللہ تیری یہ خلق منحوس ہے، یہ کتنی بڑی جسارت ہے!! بھلا وہ قوم اللہ رب العزت کی رحمت اور محبت کا استحقاق حاصل کرسکتی ہے؟ یہ تو سخت بربادی اور تباہی کا راستہ ہے اور رب کے عذاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ ابن آدم اس طرح اللہ رب العزت کو ایذا پہنچاتا ہے، یعنی اس کے غضب اور عذاب کو دعوت دیتا ہے۔ تو اس ساری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ تکالیف، سختیوں اور مفاسد کے حصول پر انسان اپنے اعمال پر غور کرے کہ مجھ میں کون سی بدعملی ہے، کون سے گناہ ہیں اور کون سے مفاسد ہیں، پھر اللہ سے توبہ اور استغفار کرے۔ ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ۝﴾ [1] اللہ تعالیٰ نے تو دو امانیں اپنے بندوں کو عطا فرمائیں۔ اے محمد ﷺ! جب تک آپ اس قوم میں موجود ہیں اللہ ان کو

[1] الأنفال 8:33.

عذاب نہیں دے گا، حالانکہ اس قوم اور معاشرے میں ابوجہل اور ابولہب جیسے لعین لوگ ہیں، مگر خالق اور مالک عذاب کو روکے ہوئے ہے کیونکہ آپ اس قوم کے اندر موجود ہیں۔ کتنی بڑی امان ہے! ابن قیم ؒ فرماتے ہیں: محمد ﷺ کا وجود کفار کے مابین امان ہے تو مومنین کے مابین کتنا امان ہوگا؟ کفار تو کفر کرنے والے بلکہ بڑا بھیانک کفر کرنے والے اور مسلسل پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کے خلاف صف آرا تھے۔ دین کے خلاف پلاننگ کرنے والے، اپنے مال خرچ کرنے والے، اپنے اشعار سے محمد ﷺ اور اسلام کی ہجو کرنے والے، مگر پھر بھی ذاتِ رسول اور وجود رسول ان کے لیے امان بن گیا۔ اللہ نے امان بنا دیا۔ لیکن جو قوم اللہ کے پیغمبر سے محبت کرے، ان پر ایمان لائے، ان کی اطاعت کرے، وہ قوم کتنی امان کی مستحق ہوگی! اور کس قدر اللہ رب العزت کی رحمت کی مستحق ہوگی!

اور فرمایا کہ اللہ رب العزت اس قوم کو بھی عذاب نہیں دے گا جو قوم استغفار کرتی رہے۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام اس آیت کو پڑھ کر بہت خوش ہوئے کہ میرے جانے کے بعد ایک امان قیامت تک باقی ہے۔ میرے جانے سے جو میرے وجود کی امان ہے وہ ختم ہو جائے گی، لیکن معنوی امان تو باقی ہے نا! نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی اطاعت، محبت، تعظیم، ایمان اگر کسی معاشرے میں موجود ہے، اطاعت کا صحیح حق ہے تو وہ معاشرہ اللہ رب العزت کی رحمت اور اس کی محبت کا مستحق ہے۔ لیکن ایک مستقل امان قیامت تک موجود ہے، وہ ہے استغفار۔ جب تک یہ قوم استغفار کرتی رہے گی اللہ تعالیٰ اس قوم کو عذاب نہیں دے گا۔ عذاب انفرادی بھی ہوتا ہے اور اجتماعی بھی۔ اللہ حفاظت فرمائے گا استغفار کی برکت سے۔ یہ مستقل امان ہے۔ استغفار کا معنی کیا ہے؟ اپنے گناہوں کو چیک کرنا، گناہوں کو یاد کرنا

اور پھر سچی توبہ کر لینا۔ اللہ رب العزت سے معافی مانگ لینا، صلح کر لینا۔

استغفار کی تکمیل تین چیزوں کے ساتھ ہے: گزرے گناہ پر شرمندگی ہو اور استغفار کے وقت اس گناہ کو چھوڑ چکا ہو اور آیندہ اس گناہ کو چھوڑنے کا عزم کرے۔ یہ تین چیزیں مکمل استغفار ہیں۔ ہاں آیندہ اگر ہو جائے تو انھی شرائط پر پھر استغفار کر لے۔ یہ گناہ آپ ستر بار کر لیں اور بار بار استغفار کرتے رہیں، لیکن شرطیں وہی ہوں اور اللہ رب العزت جو دلوں کے حال جانتا ہے، وہ آپ کے دل سے استغفار کی صداقت جان لے تو اللہ معاف کر دیتا ہے۔ اگر بندہ بار بار گناہ کرتا ہے اور بار بار استغفار کرتا ہے تو اللہ بار بار معاف کرتا ہے۔ وہ تو بندے کی توبہ سے خوش ہوتا ہے۔ بلکہ بعض بندوں کے استغفار کی صداقت کو جب اللہ پہچان لیتا ہے، صحیح بخاری کی حدیث کے مطابق اللہ فرماتا ہے: اب تم جو چاہو کرو، میں تمھیں معاف کر چکا ہوں۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے اس استغفار کی صداقت کی بنیاد پر اسے استقامت کی توفیق دے چکا ہے۔ جب یہ کہا جائے کہ تم جو چاہو کرو میں تمھیں معاف کر چکا ہوں، اس کا معنی یہ کہ اب تم جو کرو گے ٹھیک کرو گے۔ اب تم سے گناہوں کا صدور نہیں ہوگا۔ جیسے رسول اللہ ﷺ نے عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا: «مَاضَرَّ عُثْمَانَ مَاعَمِلَ بَعْدَالْيَوْمِ» ''عثمان آج کے بعد جو چاہے کرتا رہے اس کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔''[1] اس کے معنی یہ نہیں کہ کھلی چھوٹ دے دی گئی، اس کا معنی تزکیہ ہے۔ ایک سرٹیفکیٹ دے دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے آج کے بعد عثمان کو ہمیشہ صداقت، استقامت اور نیکی کی توفیق دینی ہے۔ اور یہ ایک بڑا تزکیہ ہے۔ یہ تزکیہ بعض لوگوں کو حاصل ہوا۔ اہل بدر کو حاصل ہوا۔

[1] جامع الترمذي، حديث:3701.

«اِطَّلَعَ عَلٰی أَهْلِ بَدْرٍ، فَقَالَ: اعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ» ”اللہ تعالیٰ نے اہل بدر پر جھانکا اور فرمایا کہ اے اہل بدر! تم جو چاہو عمل کرو، میں تمھیں معاف کر چکا ہوں۔“[1] یہ ایک عظیم الشان تزکیہ ہے جو عظیم الشان عمل پر حاصل ہوتا ہے اور قیامت تک حاصل ہوتا رہے گا۔ جب تک وحی کا دور تھا ہمیں علم ہوتا رہا، اب وحی بند ہو چکی لیکن وہ منہج باقی ہے۔ اس پر ہم چلتے رہیں، قائم رہیں تو یقیناً وہ بشارتیں حاصل ہوتی رہیں گی۔ تو یہ قوم اگر استغفار کرتی رہے، یعنی اپنے گناہوں کو بخشواتی رہے تو اللہ اس قوم کو عذاب نہیں دے گا، مستقل امان موجود ہے۔ اس کا معنی نزول عذاب کا سبب تمھاری معصیتیں ہیں اور دفعِ عذاب کا سبب استغفار ہے اور استغفار کا پہلا درجہ گناہوں کو چھوڑنا ہے۔ تو نحوست اللہ کے ایام میں نہیں ہے، تمھارے اعمال میں ہے۔ اپنے اعمال پر غور کرو۔ اور یہ بڑی بدعقیدگی ہے جس کا اس معاشرے میں رواج ہے۔ لوگ شادیاں نہیں کرتے یا کوئی بڑے اگریمنٹ نہیں کرتے کہ صفر کا مہینہ گزر جائے۔ یہ بدعقیدگی ہے۔ اور میں نے عرض کیا کہ ظاہری معصیتیں اتنا بڑا بگاڑ نہیں ہیں جتنا بڑا بگاڑ اعتقادی معصیتیں ہیں جو معنوی ہیں، جن کو ہم چھوٹا سمجھتے ہیں۔ شرکِ اصغر زنا سے بڑا گناہ ہے۔ شرک اصغر چوری سے بڑا گناہ ہے۔ شرک اصغر سود سے بڑا گناہ ہے۔ تو پھر ان معصیتوں سے جو بگاڑ پیدا ہوسکتا ہے اس سے زیادہ بگاڑ شرک اصغر سے ہوگا اور یہاں پر تو شرک اکبر کی صورتیں ہیں۔ قبروں پر مجاورتیں، قبروں پر طواف، قبروں پر سجدے، لوگوں کو مشکل کشا مانا جانا، قبروں پر چادریں چڑھانا، پھول نچھاور کرنا، دیے جلانا۔ یہ سب شرک اکبر کی صورتیں ہیں۔ پھر اس قوم کی اصلاح کیسے ہوسکتی

[1] صحيح البخاري، حديث:3007.

ہے؟ اور الٹا مذاق یہ کہ اللہ کے ایام کو منحوس کہنا۔ اپنے عمل کی طرف توجہ نہیں ہے، اپنی بداعمالیوں کی طرف، بدعقیدگیوں کی طرف غور نہیں ہے اور اپنے نقصانات کو اللہ کے ایام پر ڈال دینا کہ ماہِ صفر نعوذ باللہ منحوس ہے۔ یہ بہت بڑی جسارت ہے۔ اللہ کو اس کی خلق پر یہ چیلنج ہے۔ تم اپنے اعمال پر توجہ کرو، یہی ہر بگاڑ کا محور اور سبب ہے۔

﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ﴾ اللہ فرما رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھیں عذاب دے کر کیا کرے گا ﴿اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ﴾ بس دو باتیں ہیں: اگر تم شکر ادا کرتے رہو اور ایمان پر قائم رہو ﴿وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا﴾ اور اللہ رب العزت شاکر ہے، یعنی قدردان ہے۔ ﴿عَلِيْمًا﴾ خوب جاننے والا ہے۔[1] کبھی غور کیا اس آیت کریمہ پر؟ اللہ تعالیٰ یہاں اپنے بندوں کو کیا پیغام دے رہا ہے؟ اللہ تعالیٰ تمھیں عذاب دے کر کیا کرے گا؟ یہ عذاب عام ہے، دنیا کا بھی اور آخرت کا بھی۔ تم اپنی اصلاح کرلو، دو چیزوں کو اپنا محورِ حیات بنالو: ایک شکر اور ایک ایمان۔ ایمان صحتِ عقیدہ کا نام ہے، توحید خالص، سچا ایمان۔ ویسے ایمان کے چھ ارکان ہیں اور ہر رکن کے بارے میں بندے کی سوچ اور اس کا عقیدہ مثبت ہو۔ مثبت کا معنی کہ عقیدہ اللہ کی وحی کے مطابق ہو، قرآن و حدیث کے مطابق ہو۔

«وَالْإِيمَانُ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ»

”ایمان اللہ کو ماننے کا نام ہے۔ ایمان اللہ کے فرشتوں کو ماننے کا نام ہے۔ ایمان اللہ کی کتابوں کو ماننے کا نام ہے۔ ایمان اللہ کے رسولوں کو ماننے کا نام

[1] النسآء 4:147.

ہے۔ ایمان یوم آخرت اور تقدیر پر صحیح ایمان لانے کا نام ہے۔“ [1]

ان چھ ارکان کے بارے میں تمھاری سوچ، تمھارا عقیدہ بالکل مثبت ہو۔ وحیِ الٰہی کے مطابق ہو۔ یہ ایمان کی اساس ہے۔ اگر تمھیں یہ حاصل ہے اور ساتھ ساتھ شکر۔ شکر کی تکمیل تین چیزوں سے ہوتی ہے۔ ایک عقیدہ، دوسرا ذکر اور تیسرا عمل۔ اس عقیدے کا معنی یہ ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہے، ایک ذرے سے لے کر آسمانوں تک، یہ ماننا کہ یہ سب اللہ کی مخلوق ہے۔ اس خلق میں کسی کا حصہ نہیں ہے۔ نہ کوئی اللہ کا معاون ہے، نہ کوئی پارٹنر ہے، نہ کوئی شریک ہے۔ اللہ اکیلا ہی سب کا خالق اور مالک ہے۔ اس اکیلے کا تصرف اس پوری کائنات پر قائم ہے۔ یہ عقیدہ ہے جس کے معنی ہیں اللہ رب العزت کی نعمتوں کو اللہ کی طرف منسوب کر دینا۔ کسی ایک نعمت کو غیر اللہ کی طرف اگر منسوب کرو گے تو شکر کا معنی فوت ہوجائے گا، شکر ختم ہوجائے گا۔ بلکہ وہ بندہ دولتِ ایمان سے محروم ہوگا، وادیِ کفر میں داخل ہوجائے گا، جیسا کہ صحیح بخاری میں واضح حدیث موجود ہے۔ کچھ لوگوں نے بارش کو ستاروں کی طرف منسوب کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے آگاہ کر دیا کہ رات کی بارش نے کچھ بندوں کے ایمان تازہ کر دیے اور اسی بارش نے کچھ بندوں کو کافر بنا دیا۔

«فَأَمَّا مَنْ قَالَ: مُطِرْنَا بِفَضْلِ اللّٰهِ وَرَحْمَتِهِ فَذٰلِكَ مُؤْمِنٌ بِي كَافِرٌ بِالْكَوْكَبِ، وَأَمَّا مَنْ قَالَ: مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا وَكَذَا فَذٰلِكَ كَافِرٌ بِي مُؤْمِنٌ بِالْكَوْكَبِ» [2]

اللہ نے فرمایا کہ جن لوگوں نے بارش کو دیکھ کر کہا: یہ اللہ کی خلق ہے، اللہ کی عطا

[1] صحيح مسلم، حديث: 8. [2] صحيح البخاري، حديث: 1038.

اور اس کا فضل ہے، ان کا ایمان نکھر گیا، ان کے ایمان کی سلامتی اور مضبوطی ہم نے جان لی، وہ ایمان پر قائم ہیں۔ اور جن لوگوں نے اس بارش کو غیر اللہ کے نام الاٹ کر دیا، یہ فلاں ستارے کی تاثیر ہے، فلاں کی دین ہے، فلاں کی خلق ہے، وہ ایک ہی جملے سے کافر بن گئے اور اپنے ایمان سے محروم ہو گئے۔

تو شکر کا جو پہلا مقام ہے، وہ یہ ہے کہ اعتقاداً اس پوری کائنات کو اللہ کی خلق ماننا۔ دوسرا مقام اپنی زبان سے الحمدللہ کہنا سچے عقیدے کے ساتھ کہ ساری تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔ وہ اس عنایت اور عطا میں یکتا اور اکیلا ہے۔ کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ اگر ہم کہیں کہ فلاں بھی کچھ دیتا ہے، فلاں داتا ہے، گنج بخش ہے، فلاں اولاد دیتا ہے، فلاں شفا دیتا ہے تو پھر الحمدللہ کا معنی ختم ہوجائے گا۔ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، یہ ختم ہوجائے گا، پھر کچھ تعریفیں غیر اللہ کے نام کی بھی ہوں گی۔ اور یہ مقام شکر کے منافی ہے۔ تو زبان سے الحمدللہ کا اقرار ہو پوری معنویت کے ساتھ اور دل میں صحیح عقیدہ موجود ہو۔ اور شکر کی تکمیل کی تیسری صورت: عمل صالح کے ساتھ شکر کا معنی مکمل ہوگا۔ اس کی دلیل صحیح بخاری کی حدیث ہے۔ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے پوچھتی ہیں کہ یارسول اللہ! آپ راتوں کو اتنا لمبا قیام کرتے ہیں، ہمیں دیکھ کر ترس آتا ہے۔ امام الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کبھی کبھی نو نو پارے ایک رات میں پڑھ جاتے تھے۔ سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران اور سورۂ نساء آپ نے ایک رکعت میں پڑھی۔ آپ کے قدم سوج جاتے تھے۔ ہمیں دیکھ کر ترس آتا ہے۔ آپ تو اللہ رب العزت کے عبدِ مغفور ہیں۔ قدم قدم پر بشارتیں ہیں، خالق اور مالک کی محبتیں ہیں، اس کی رضا اور انعامات ہیں، پھر اس قدر مشقت کیوں؟ رسول اللہ ﷺ نے کیا جواب دیا؟

«أَفَلَا أَكُونُ عَبْدًا شَكُورًا»

’’میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟‘‘[1]

شکر گزار بندہ، معلوم ہوا شکر کے مقام کی تکمیل عمل صالح کے ساتھ ہے۔ اور اللہ پاک بڑا خوش ہوتا ہے: ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾[2] میں پہلے ہی تمھیں اس قدر دے چکا ہوں کہ تم شمار نہیں کر سکتے، لیکن شکر ادا کرو گے تو اور دوں گا۔ یہ مقام شکر ہے جس کی تکمیل ان تین چیزوں کے ساتھ ہے: اعتقاد کے ساتھ، زبان کے ذکر کے ساتھ اور عمل صالح کے ساتھ۔ فرمایا کہ اگر تم صحیح معنی میں مومن بن جاؤ، سچے عقیدے والے، سچے ایمان والے اور حق شکر ادا کرنے والے تو اللہ تمھیں عذاب کیوں دے گا؟ جب بھی عذاب آتا ہے وہ تمھاری کسی حرکت کے نتیجے میں آتا ہے۔ تم اپنے اعمال اور اپنے کردار کو بھول جاتے ہو۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نہیں بھولتے تھے۔ وہ زبان کے ایک لفظ کو یاد رکھتے، اس پر توبہ کرتے تھے۔ امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ نے حدیبیہ کے موقع پر غصے میں کچھ الفاظ کہہ دیے کہ یہ معاہدہ جو کیا گیا، اس میں ہماری اہانت اور کمزوری کے پہلو ہیں۔ یہ کچھ الفاظ زبان سے ادا ہو گئے۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے بھی کہے، ابوبکر صدیق سے بھی کہے۔ اور نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ عمر! تم یہ بات نہیں جانتے کہ میں اللہ کا سچا رسول ہوں؟ اس کے بعد ایک لفظ نہیں کہا اور خاموش ہو گئے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ مجھے آخر حیات تک یاد رہا «فَعَمِلْتُ لِذَلِكَ أَعْمَالًا»[3] اس جملے کی بخشش کے لیے میں نے بڑے عمل کیے۔ یا اللہ! مجھے میرا یہ جملہ معاف کر دے، میں نے بڑے عمل کیے، بڑی نیکیاں کیں۔ تو سلف صالحین بھولتے نہیں تھے۔

[1] صحيح البخاري، حديث: 1130. [2] ابراهيم 14:7. [3] إرواء الغليل 72/1:1.

جنگ بدر کے موقع پر ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک جملہ کہہ دیا۔ اس میں کچھ ماحول کا اثر تھا اور کچھ ان کے غم اور افسوس کا۔ ان کے والد بڑے مدبر اور زیرک تھے، لیکن ایمان نہیں لائے تھے۔ اور ان کو یقین تھا کہ میرے والد سمجھ دار ہیں، ایمان لے آئیں گے، لیکن جنگ بدر میں وہ کفار کے ساتھ قتل ہو گئے۔ ان کو غم تھا، باپ کے قتل کا نہیں بلکہ بلکہ کفر کی موت کا کہ میرے والد کو ایمان نصیب نہیں ہوا۔ اسی دوران میں نبی علیہ الصلاۃ والسلام کا اعلان تمام صحابہ تک پہنچایا گیا کہ میرے چچا عباس کفار کے ساتھ آئے ہیں، لیکن وہ ایمان لا چکے ہیں، ان کو کوئی قتل نہ کرے۔ ابوحذیفہ افسوس اور غم کی اپنی اسی کیفیت میں تھے۔ یہ الفاظ نکل گئے کہ ہمارے باپ تو قتل ہوں اور آپ کے چچا قتل نہ ہوں؟ نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے یہ الفاظ سن لیے، لیکن ان کو اس کیفیت پر محمول کرتے ہوئے آپ خاموش رہے۔ ابوحذیفہ پھر بڑے ملول اور بڑے رنجیدہ ہوئے، بڑی ملامتیں کیں اپنے آپ کو کہ میں نے یہ کیا کہہ دیا۔ گڑگڑاتے رہے، توبہ کرتے رہے اور پھر یہ کہا کہ یا اللہ! میں سمجھوں گا تو نے میری توبہ قبول کر لی کہ کسی میدان جہاد میں جاؤں اور میرے گلے پر تلوار چل جائے، جب تلوار چل رہی ہوگی تو میں سمجھوں گا میری توبہ قبول ہو گئی، اس کے سوا میں نہیں سمجھوں گا۔ ہر جہاد میں شریک ہوئے اسی نیت اور جذبے کے ساتھ، حتی کہ گلے پر تلوار چل گئی اور شہید ہو گئے۔ یہ صحابہ کرام چھوٹے چھوٹے جملے یاد رکھا کرتے تھے، توبہ کرتے تھے۔ تو اگر تم منہج استغفار کو اپنالو تو تم پر بھی وہ انعامات آئیں گے، وہ برکتیں آئیں گی جو اللہ عطا فرماتا ہے۔ لیکن جہاں معصیتوں کا رواج ہو اور بدعقیدگی کا دور دورہ ہو واقعتاً وہاں اللہ کا عذاب آتا ہے۔ اور یہ بڑی محرومی کی بات ہے کہ تم اس عذاب کو اللہ کے مہینوں پر ڈال دو، اللہ کے دنوں پر ڈال

دو اور اپنی بداعمالیوں اور بدعقیدگیوں پر توجہ نہ دو۔ تو فرمایا کہ اللہ رب العزت تمھیں عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تمھارا ایمان صحیح ہو اور تم شاکر بن جاؤ۔ اللہ قدر دان ہے۔ ﴿وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيمًا﴾ ”اللہ قدر دان اور علیم ہے۔“ [1]

یہ اللہ کی دو صفات ہیں: قدر دان ہونا اور علیم ہونا۔ دونوں صفات اگر الگ الگ ہوں تو ان میں کمال کا معنی ہے لیکن یہاں دونوں کے جمع ہونے سے تیسرا کمال حاصل ہوتا ہے کہ اللہ شاکر اور علیم ہے۔ ان دو صفات کو یکجا کیوں کیا گیا ہے؟ اللہ تعالیٰ بندوں کے اعمال کا قدر دان ہے لیکن ساتھ ساتھ یہ بات یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمھارے اعمال کا علیم ہے، جاننے والا ہے۔ تمھارے اعمال کو بڑی باریک بینی سے اور بڑی دقتِ نظر کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ صرف اعمال کے ظاہر کو نہیں دیکھتا بلکہ اعمال کے باطن کو بھی دیکھتا ہے۔ ایک بندہ نیکی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ یہ دیکھتا ہے کہ یہ عمل کر رہا ہے اتنا کافی نہیں۔ ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ہم عمل کے ظاہر کو جانتے ہیں، باطن کو نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ یہ دیکھتا ہے کہ عمل کا ظاہر میرے پیغمبر کی سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔ جس شخصیت کو میں نے پوری کائنات کے لیے آئیڈیل بنا کر بھیجا، اس کے منہج کے مطابق ہے یا نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ پھر یہ دیکھتا ہے کہ اس عمل کرنے والے کے دل میں اخلاص اور تقویٰ ہے یا نہیں۔ ﴿لَن يَنَالَ اللّٰهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمْ﴾ [2] ”اللہ رب العزت کو تمھاری قربانیوں کے گوشت اور خون نہیں پہنچتے بلکہ دلوں کا اخلاص پہنچتا ہے۔“ ﴿وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ﴾ [3] ”تمھیں حکم دیا گیا ہے کہ تم مخلص ہو جاؤ اور حنفاء

[1] النسآء 4:147. [2] الحج 22:37. [3] البیّنة 98:5.

ہو جاؤ۔“ اخلاص اور حنیفیت اپناؤ تمھیں یہ دو حکم دیے گئے ہیں۔ اخلاص کا معنی اللہ کے لیے خالص ہو جاؤ۔ کوئی ریاکاری نہ ہو، کوئی دکھلاوا نہ ہو، نمود و نمائش نہ ہو۔ اللہ کے لیے مخلص بن جاؤ۔ اور حنیفیت کا معنی سب سے کٹ جاؤ۔ اس عقیدہ صافیہ کے ساتھ جڑ جاؤ، اللہ کی طرف انابت ہو، چہرہ اللہ کے دین کی طرف ہو۔ توحید خالص کو سینے پر سجا لو۔ تمھارے تخیل کی زینت اللہ کا امر ہو، یعنی اس کے پیغمبر کی سنت ہو۔ یہ حنیفیت ہے، سب سے کٹ جاؤ۔ یہ مبتدع لوگ، مشکوک و مشبوہ لوگ (شک و شبہے والے لوگ) اور پھر یہ مشبوہ تحریکیں، تنظیمیں، جماعتیں جن کے عقیدے فاسد ہیں، نظریات باطل ہیں، جن کا ظاہر بدعت پر قائم ہے، جن کا باطن شرک کی غلاظتوں پر قائم ہے، ان سب سے کٹ جاؤ۔ ان کے ساتھ تعلق کی کوئی صورت نہیں سوائے تعلقِ دعوت کے۔ اور تعلقِ دعوت کے قواعد بھی ہمارے خود ساختہ نہیں، وہ قواعد بھی اللہ تعالیٰ نے بنا رکھے ہیں۔ ان قواعد پر قائم رہ کر ان کو دعوت دینی ہے باقی نہیں۔ یہ حنیفیت ہے، اخلاص ہے۔

تو اللہ رب العزت عمل کو دیکھتا ہے۔ عمل میں اپنے پیارے پیغمبر کی سنت کی مطابقت کو دیکھتا ہے۔ عمل کرنے والے کے دل میں اخلاص کو دیکھتا ہے، اللہ کی سچی انابت ہے یا نہیں اور عمل میں پھر اللہ رب العزت یہ دیکھتا ہے کہ عقیدہ کیسا ہے اس کا؟ توحید ہے یا نہیں۔ توحید کے بارے میں بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ عمل کی صحت کی دلیل ہے۔ یہ عمل تب قبول ہوگا جب توحید ہوگی۔ میرے خیال میں یہ بات غلط ہے۔ توحید صحت عمل کی دلیل نہیں ہے بلکہ توحید ہر انسان کی زندگی کے ایک ایک لمحے کی ضرورت ہے۔ یہ نہیں کہ صرف عمل کے وقت توحید ہو باقی اوقات میں توحید کا لحاظ نہیں کیا جائے گا، ایسا نہیں۔ عمل کی ضرورت ہے لیکن توحید ہر وقت، ہر لحظہ، ہر سانس،

ہر گھڑی، ہر ساعت اور ہر پل کی ضرورت ہے۔ ایک بندہ اگر کسی پل توحید کے منافی عقیدہ بنا بیٹھا، پھر کوئی عمل کرے، اس کا عمل چاہے لاکھوں کی تعداد میں ہو اور سنت کے مطابق ہو، اخلاص کی اساس پر ہو، زمین سے آسمان تک پہنچ جائے، اللہ پاک قبول نہیں کرے گا۔ تو توحید صحت عمل کی دلیل نہیں ہے، دلیل ہے لیکن ساتھ ساتھ یہ کہنا ضروری ہے کہ ہر انسان کی زندگی کے ایک ایک لحظہ، ایک ایک لمحہ، ایک ایک پل، ایک ایک سانس کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر انسان کی زندگی کا ہر عمل باطل ہے۔ تو اللہ تعالیٰ یہ دیکھتا ہے کہ عمل کرنے والا موحّد ہے یا نہیں، اس کے کسی عقیدے میں، کسی عمل میں شرک تو داخل نہیں ہے، پھر عمل کی قبولیت کے کچھ اور بھی محرکات ہیں۔ اللہ یہ بھی دیکھتا ہے، مثلاً: انسان کا مال۔ انسان کا مال اگر حرام کا ہو تو اس کی عبادتیں قبول نہیں ہوتیں۔ لباس حلال کا ہو، لیکن ایک درہم کے بقدر اس میں حرام کا ہو تو اس کی نمازیں قبول نہیں ہوتیں۔ تو اللہ پاک یہ بھی دیکھتا ہے کہ اس بندے کا مقصد کیا ہے؟ تجارت سودی تو نہیں ہے۔ اور پوری قوم سود کے پٹے میں جکڑی ہوئی ہے اور قصور ماہ صفر کا ہے۔ اس نحوست کو نہیں دیکھتے جو سود کی شکل میں اس معاشرے پر چھائی ہوئی ہے۔ جو اللہ کے ساتھ اعلانِ جنگ ہے۔

جب سود کھانے والا میدان محشر میں اللہ کے سامنے آئے گا، اللہ کہے گا: تجھے میں نے جنگ کا چیلنج کیا ہوا تھا، یہ ہتھیار پکڑ اور میرے ساتھ لڑ۔ کیا اس کے پلّے میں کچھ رہے گا؟ اور یہ قوم کہے کہ ماہ صفر منحوس ہے۔ تمھاری تجارتیں منحوس ہیں، تمھارے عمل اور عقیدے منحوس ہیں۔ تمھیں جو ضرر حاصل ہوتا ہے تمھاری بدعقیدگی پر حاصل ہوتا ہے۔ تمھاری بداعمالیوں پر حاصل ہوتا ہے۔

تو اللہ پاک یہ بھی دیکھتا ہے کہ عمل کرنے والا حرام کاروبار تو نہیں کر رہا۔ اس کا مقصد حرام پر تو قائم نہیں ہے۔ «الرَّجُلُ يُطِيلُ السَّفَرَ أَشْعَثَ أَغْبَرَ يَمُدُّ يَدَيْهِ إِلَى السَّمَاءِ وَيَقُولُ: يَارَبِّ! يَارَبِّ! وَ مَطْعَمُهُ حَرَامٌ وَّمَشْرَبُهُ حَرَامٌ وَّمَلْبَسُهُ حَرَامٌ وَّغُذِيَ بِالْحَرَامِ فَأَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ؟»[1] ایک شخص لمبا سفر کرکے جاتا ہے۔ لمبا سفر، سفرِ حج ہے۔ اس سے طویل سفر کوئی نہیں۔ اور دنیا کہاں کہاں سے حج کرنے پہنچتی ہے۔ یہ طویل ترین سفر ہے اور لمبے سفر سے اشارہ سفرِ حج کی طرف ہے «أَشْعَثَ أَغْبَرَ» اور اس کے پاؤں خاک آلود ہیں اور اس کا سر غبار سے بھرا پڑا ہے۔ «يَمُدُّ يَدَيْهِ» اور اپنے ہاتھوں کو پھیلائے ہوئے ہے۔ یہ کیفیت میدان عرفات میں ہوتی ہے جہاں سر خاک آلود ہوتا ہے اور پاؤں گرد وغبار سے بھرے ہوتے ہیں اور عرفہ کو حج کہا گیا ہے: «اَلْحَجُّ عَرَفَةُ» حج نام ہی عرفہ کا ہے۔[2]

عرفہ کے وقوف کو حج کہا گیا ہے۔ کتنا اہم یہ مقام ہے۔ لمبا سفر، عرفہ میں موجود، احرام باندھا ہوا ہے، پاؤں خاک آلود ہیں اور سر غبار آلود ہے۔ «يَمُدُّيَدَيْهِ» اپنے ہاتھوں کو پھیلائے ہوئے ہے اور یارب! یارب! یارب! کہہ رہا ہے۔ یااللہ! یااللہ! اے میرے رب! اے میرے پروردگار! دعائیں مانگ رہا ہے اور فرشتے ہر دعا پر کہتے ہیں: تیرا کھانا حرام کا ہے، تیرا پینا حرام کا ہے، تیری غذا حرام کی ہے، تیری دعا کہاں قبول ہوگی؟ تو اس کا یہ سارا سفر ناکام ہے، نامراد ہے۔ حالانکہ عرفہ کی حاضری بڑی مقدس ہے۔ عرفہ کے میدان میں خالقِ کائنات جس قدر بندوں کے قریب آتا ہے اس کی تحدید مذکور نہیں ہے۔ راتوں کو وہ آسمان اول پر آتا ہے، عرفہ کے میدان میں

[1] صحيح مسلم، حديث: 1015. [2] جامع الترمذي، حديث: 889.

«دُنُوّ» کا ذکر ہے، قرب کا۔[1] یہ قرب کتنا ہے؟ اس کی وضاحت نہیں ہے۔ کتنا وہ قرب ہوگا!! اللہ فرماتا ہے کہ میرے بندے میرے پاس آئے ہیں۔ یہ مت سمجھو کہ تم عرفہ کے پہاڑوں پر آئے ہو بلکہ تم میرے پاس آئے ہو، میرے مہمان ہو۔ لیکن یہ بندہ وہاں بھی اپنے مقاصد کے حرام ہونے کی بنا پر بدنصیب ہے۔ تو اللہ علیم ہے۔ شاکر ہے اور علیم ہے۔ تمھارے عمل کا قدر دان ہے لیکن علیم ہے۔ تمھارے عمل کو دیکھتا ہے، چیک کرتا ہے، پرکھتا ہے توحید کی میزان پر، اتباع سنت کی میزان پر، اخلاص کی میزان پر، رزق کی حلت و حرمت کی میزان پر۔ اور بہت سے امور ہیں۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے کہ جو شخص کسی کاہن کے پاس جائے، اس سے کچھ پوچھے تو اللہ تعالیٰ چالیس دن اس کی کوئی نماز قبول نہیں کرے گا۔[2] ایک اور حدیث میں ہے کہ جو شخص شراب پی لے اللہ تعالیٰ چالیس دن تک اس کی کوئی نماز قبول نہیں کرے گا۔[3] کوئی نیکی قبول نہیں کرے گا۔ تو اللہ بندوں کے ان امور کو بھی جانتا ہے۔ یہ شرابی تو نہیں ہے، یہ کسی کاہن کے پاس تو نہیں گیا، ٹی وی کو سامنے رکھ کر استخارہ کے پروگرام کو دیکھ کر اس کے دل میں کوئی نرم گوشہ تو نہیں آ گیا کہ یہ لوگ بھی صحیح ہو سکتے ہیں؟ فرمایا: کسی کاہن کے پاس جاؤ گے اور اس کی تصدیق کر بیٹھو گے تو تم کافر بن جاؤ گے۔ تو اللہ یہ سب کچھ دیکھتا ہے، سب کچھ جانتا ہے۔ وہ شاکر ہے، لیکن ساتھ ساتھ علیم ہے۔ وہ صرف عمل کے ظاہر کو نہیں دیکھتا کہ سجدوں پر سجدے ہو رہے ہیں اور قیام پر قیام ہو رہے ہیں بلکہ اس عمل کو دیکھے گا، سنت رسول کی اتباع کو دیکھے گا، اس کی تجارت کو دیکھے گا اور اس کے روزمرہ کے معمولات کو دیکھے گا۔ اگر سارے امور شرعی میزان کے

[1] صحیح مسلم، حدیث: 1348، و سنن ابن ماجه، حدیث: 3014. [2] صحیح مسلم، حدیث: 2230. [3] سنن ابن ماجه، حدیث: 3377.

مطابق ہیں تو پھر وہ شاکر ہے، ایسا شاکر کہ ایک بندے نے راہ چلتے ایک پتھر کو ٹھوکر مار کر ہٹا دیا، اللہ نے جنت دے دی، ایسا شاکر ہے۔ وہ بڑا قدر دان ہے لیکن تمھارا عمل، تمھاری نیکی ان سارے امور اور ان کی میزان کے مطابق ہو، پوری طرح فٹ آ جائے تو اللہ شاکر ہے۔ اس منہج کی طرف آ جاؤ۔ اللہ بڑا قدردان ہے۔ جو شخص جنت میں سب سے آخر میں جائے گا، جو پل صراط پر کھڑا نہیں ہو پائے گا۔ اس کے عمل کی طاقت ہی نہیں تھی جو اس کو کھڑا کر سکے۔ اور جس طرح بچے رینگتے ہیں، اس طرح رینگتا ہوا پتہ نہیں کتنی مدتِ مدید کے بعد وہ اس پل کو عبور کرنے میں کامیاب ہوگا، جنت میں داخل ہوگا۔ اس کی ساری تفصیل احادیث میں موجود ہے۔ یہاں شاہد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ شخص جو سب سے آخر میں پہنچا، پل صراط کو رینگتے ہوئے عبور کرتا رہا، وہ شخص اگر ہمیشہ کے لیے تمام اہل دنیا کو اپنا مہمان بنا لے تو اس کے خزانے ختم نہیں ہوں گے۔ اس کے خزانے اور اللہ کی نعمتیں ختم نہیں ہوں گی۔[1] اللہ ایسا شاکر ہے۔ یہ تم اپنے عمل کو، اپنے منہج اور اپنے عقیدے کو اس میزان پر قائم کرو۔ تو نقصان تمھیں اپنی حرکات کی بنا پر پہنچتا ہے اور قصور کس کا؟ ماہ صفر کا۔

اللہ کے بندو! یہ بہت بڑی جسارت ہے۔ ماہ صفر بقیہ ایام کی طرح اللہ کی مخلوق ہے۔ اور اللہ کی کوئی مخلوق نحس پر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بعض چیزوں میں شر رکھا ہے، اس شر کو تم تک پہنچاتا ہے۔ اس کے اسباب، اس کی حکمتیں، اس کی متقاضیات ہیں۔ بعض اوقات بندہ بخار زدہ ہوتا ہے، اس کا کوئی بچہ، کوئی رشتے دار فوت ہو جاتا ہے، تجارت میں گھاٹا پڑ جاتا ہے، یہ شر نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے اللہ رب العزت تمھیں یہ نقصان

[1] صحیح مسلم، حدیث: 188، و مسند أحمد: 454/1.

دے کر، صبر کی توفیق دے کر تمھیں قیامت کے دن درجات کی بلندی عطا فرما دے۔ حدیث میں آتا ہے کہ بعض بندے جن کے بڑے اونچے درجات، مگر ان کے عمل چھوٹے ہیں تو اللہ تکلیفیں پہنچا کر اور صبر کی توفیق دے کر اس درجے کے مطابق ان کو بنا دیتا ہے۔[1] یہاں شر نحوست نہ ہوا، باعثِ خیر ہوا۔ اور بعض اوقات مال، خزانے، دولتیں ایسی آزمائش بنتے ہیں کہ بندے کی عاقبت کو برباد کر دیتے ہیں۔ اور بعض اوقات ایک انسان معصیتوں کے باوجود مال دار اور امیر ہوتا ہے۔ اس کو خالقِ کائنات کی نعمت مت سمجھو۔ اللہ تعالیٰ گناہوں اور نافرمانیوں کے باوجود، شرک و بدعت کے باوجود اگر کسی بندے کو دولت دیتا ہے، خزانے، محلات اور بلڈنگیں دیتا ہے، اعلیٰ قسم کی گاڑیاں دیتا ہے، اس سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے استدراج ہے۔ استدراج کا معنی ہے ڈھیل۔ ڈھیل ایک عذاب ہے۔ ڈھیل کے بعد اللہ کی پکڑ زیادہ سخت، زیادہ قابل مواخذہ، باعثِ عذاب اور تکلیف دہ ہوگی۔ یہ ایک عذاب ہے۔ تو تم خیر و شر کو کیا سمجھو۔ تمھارا کام اپنے اعمال پر توجہ دینا ہے، اپنے عقیدے پر توجہ دینا ہے، اس کی اصلاح تمھاری اصلاح ہے، تمھارے گھر کی اصلاح ہے اور تمھارے ماحول کی اصلاح ہے۔ یوں اصلاح عام ہوگی۔ لیکن اگر تم اس پر توجہ نہ دو۔ عقیدے فاسد ہوں، عمل میں بگاڑ ہو، سنت کی اتباع نہ ہو، قدم قدم پر بدعات ہوں، ہر مہینے کے ساتھ کوئی نہ کوئی بدعت منسلک ہو۔ تو اللہ کو تم پر کیا رحم آئے گا؟ اللہ تعالیٰ نے تمھیں ایک نمونہ دیا ہے اس سے محض محبت کے دعوے ہیں، اتباع نہیں۔ یہ عجیب کھیل ہے۔ اس کی اتباع کرو، اپنے عمل کو اور صرف عمل کو نہیں بلکہ ہر چیز کو: میزان

[1] سنن أبي داود، حديث:3090.

ہے، منہج ہے، سیاست ہے، اخلاق ہے، معیشت ہے، معاشرت ہے، ادب ہے، عقیدہ ہے، ان سب کے سب کو ڈھال لو اللہ کے پیغمبر کی سنت کے ڈھانچے میں۔ بس یہ اصلاح کا پروگرام ہے دنیا و آخرت میں۔ اگر یہ نہیں ہوگا تو بگاڑ ہی بگاڑ ہے، مفاسد ہی مفاسد ہیں۔ اس بگاڑ کو اگر تم اللہ کے زمانوں، اللہ کے دنوں اور اس کے مہینوں پر ڈال دو گے تو بگاڑ مزید بڑھ جائے گا۔ اور اللہ کا عذاب مزید بڑھ جائے گا۔ ظاہری گناہوں سے وہ بگاڑ پیدا نہیں ہوتا جو عقیدے کے فساد سے پیدا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اصلاح کی توفیق عطا فرمائے۔ اللہ رب العزت اعتقاداً وعملاً وقلباً ولساناً ہر طرح سے ہمیں اپنی وحی پر قائم رکھے۔ اپنے پیارے پیغمبر کی سنت، سنت کی محبت، پیغمبر ﷺ کی ذات سے محبت، پیغمبر ﷺ کی تعظیم، پیغمبر ﷺ پر سچا ایمان اور اللہ رب العزت ہمیں توحید خالص کا محور عطا فرما دے۔

وَأَقُولُ قَوْلِي هٰذَا وَأَسْتَغْفِرُاللّٰهَ لِي وَلَكُمْ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ.

میلاد النبی ﷺ اور دیگر رسوم و رواج

تعلیماتِ نبویہ کی روشنی میں ...... ایک تحقیقی جائزہ

میلاد النبی ﷺ اور دیگر رسوم و رواج

تعلیماتِ نبویہ کی روشنی میں......ایک تحقیقی کاوش

خطبہ مسنونہ

﴿ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ ﴾

''آپ کہہ دیجیے: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''[1]

اللہ رب العزت نے انبیائے کرام علیہم السلام کو مبعوث فرمایا تا کہ ہمیں اللہ رب العزت کا پیغام سنائیں اور ہماری رہنمائی کریں۔ اور ہمیں اس راستے پر چلانے کی کوشش کریں جو جنت کی طرف جاتا ہے اور ہمیں جہنم سے بچائیں۔

[1] آل عمرٰن 31:3.

بعثتِ انبیاء کا مقصد اطاعتِ انبیاء ہے

تو یہ سب باتیں کب حاصل ہوں گی؟ جب ہم اپنے نبی کی اتباع کریں گے۔ اللہ رب العزت کسی قوم کی طرف کسی نبی کو مبعوث کیوں کرتا ہے؟ تاکہ اس کی اطاعت کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ [1] ہم نے جتنے بھی رسول بھیجے ان کی بعثت میں ایک ہی مقصد کارفرما ہے کہ ان کی اطاعت کی جائے۔ اور یہ اطاعت بھی اللہ کے اذن اور امر سے ہے۔ یہ کوئی اختیاری یا ذوقی معاملہ نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کا امر اور اذن ہے۔

رسولوں کو کیوں بھیجا گیا؟ تاکہ ان کی اطاعت کی جائے۔ اس لیے نہیں کہ ان کی اطاعت نہ کی جائے۔ اس لیے بھیجا گیا کہ ان کے فرمان کو، ان کے عمل کو پوری دنیا پر مقدم قرار دیا جائے۔ اس لیے نہیں کہ کسی اور کی بات یا کسی اور کے فعل کو نبی پر مقدم قرار دیا جائے۔ اس لیے بھیجا گیا کہ پورے شرحِ صدر اور بصیرت کے ساتھ نبی کی اتباع کی جائے۔ اس لیے نہیں بھیجا گیا کہ ان کے قول و عمل کو خود ساختہ تاویلوں اور خود ساختہ قواعد سے ٹالنے کی کوشش کی جائے۔

اتباع کی حقیقت

آج یہ بتانا ہے کہ نبی ﷺ کی اتباع کی حقیقت کیا ہے؟ یہ بات معلوم ہے کہ ہماری ہدایت نبی کی اتباع پر قائم ہے: ﴿وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا﴾ [2] اگر تم میرے پیغمبر کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے۔ یہ بات معلوم ہے کہ اللہ رب العزت کی رضا اور اس

[1] النسآء 4:64. [2] النور 24:54.

کی محبت کو حاصل کرنے کے لیے صرف نبی کی اتباع ضروری ہے۔ ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ ''کہہ دیجیے! اگر تم اللہ رب العزت کی محبت کے طلب گار ہو تو میری اتباع کرو۔ تم سے اللہ تعالیٰ محبت کرنے لگے گا اور تمھارے تمام گناہوں کو معاف کردے گا۔ اللہ تو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔'' [1]

اس اتباع کی حقیقت یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ جو عمل آپ کر رہے ہیں وہ عمل نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے ثابت ہو۔ دین کا کوئی بھی کام اس وقت تک نہیں کرنا جب تک اس کام کا ثبوت نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے نہ ملے۔ اور اس کے متعلق بہت سی چیزیں ہیں۔ صرف عمل کافی نہیں ہے بلکہ اس عمل کا اگر کوئی سبب ہے تو وہ سبب بھی نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے ثابت ہونا ضروری ہے۔ اس عمل کی کوئی جنس ہے تو وہ جنس بھی نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے ثابت ہونا ضروری ہے۔ اس عمل کی کوئی کیفیت ہے تو وہ کیفیت بھی نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے ثابت ہونا ضروری ہے۔ اس عمل کی کوئی مقدار ہے تو وہ مقدار بھی نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے ثابت ہونا ضروری ہے۔ وہ عمل اگر کسی زمانے کے ساتھ مقرون اور مشروط ہے تو اس زمانے کا بھی نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے ثابت ہونا ضروری ہے۔ اس عمل کا تعلق اگر کسی جگہ سے ہے، کسی مکان سے ہے تو اس جگہ کا بھی نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے ثابت ہونا ضروری ہے۔ یہ چھ چیزیں ہیں:

① عمل کا سبب　② عمل کی جنس　③ عمل کی کیفیت

④ عمل کی مقدار　⑤ عمل کا زمانہ　⑥ عمل کی جگہ

[1] آل عمرٰن 3:31.

ان تمام چیزوں کا ثابت ہونا ضروری ہے تب وہ عمل نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی اتباع کے دائرے میں ہوگا۔ اور اگر کوئی چیز ختم ہوجائے، اس کی نفی ہوجائے تو وہ عمل قطعاً مسنون نہیں ہوسکتا۔

① پہلی چیز عمل کا سبب ہے۔ جو عمل آپ کررہے ہیں اگر وہ عمل کسی سبب کے ساتھ جڑا ہوا ہے تو لازم ہے کہ وہ سبب نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے ثابت ہو، جیسے سورج غروب ہوتا ہے تو ہم مغرب کی نماز پڑھتے ہیں۔ مغرب کی نماز کا سبب غروب آفتاب ہے۔ یہ تین فرض ہم کیوں پڑھتے ہیں؟ یہ عمل مقرون ہے غروب آفتاب کے ساتھ۔ سوال یہ ہے کہ غروب آفتاب کے ساتھ نماز کی ادائیگی نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے ثابت ہے؟ جی ہاں۔ طلوع فجر جب ہوتی ہے تو ایک نماز ہم پر فرض ہوتی ہے اور وہ فجر کی نماز ہے۔ اب فجر کی نماز ایک عمل ہے جو کہ مقرون ہے ایک سبب کے ساتھ اور وہ سبب ہے طلوع فجر۔ اور یہ پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام سے ثابت ہے۔ لہٰذا صرف عمل کو نہ دیکھا جائے، اس عمل کا اگر کوئی سبب ہے تو اس کو بھی دیکھنا ضروری ہے۔ ستائیس رجب کو لوگ شب معراج کے نام سے رات کو قیام کرتے ہیں۔ بظاہر وہ تہجد کی نماز ہے۔ تہجد کی نماز میں کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن اسے ایک سبب سے جوڑا جاتا ہے۔ ایک سبب سے مقرون کیا جاتا ہے اور وہ سبب یہ ہے کہ آج کی رات معراج کی رات ہے۔ عمل درست ہے، تہجد کا عمل درست ہے لیکن جس سبب کے ساتھ اس کو جوڑا گیا اور مقرون کیا گیا وہ سبب نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے ثابت نہیں ہے اور ضروری ہے کہ جس سبب پر آپ کسی عمل کو قائم کریں گے تو اس عمل کے ساتھ ساتھ اس عمل کا سبب بھی پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام سے ثابت ہو۔

② اسی طرح جنسِ عمل ہے۔ اگر کسی عمل کی کوئی جنس ہے اور وہ عمل اس جنس کے ساتھ

پورا ہوتا ہے تو اس جنس کا بھی نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے ثابت ہونا ضروری ہے۔ آپ قربانی کرتے ہیں اونٹ کی، گائے کی، بکرے کی، دنبے کی، یہ ساری اجناس ثابت ہیں، لہٰذا قربانی درست ہے اور جنس بھی ثابت اور درست ہے۔ اگر آپ یہ حجت پیش کریں کہ ہرن کا گوشت لذیذ ہوتا ہے اور یہ ناپید ہے اور بہت مہنگا ملتا ہے تو میں کثرتِ ثواب کے لیے ہرن کی قربانی دیتا ہوں۔ وہ جانور ہے لیکن یہ جنس اللہ کے پیغمبر سے ثابت نہیں ہے۔ قربانی آپ کرلیں گے، ذبح کردیں گے لیکن یہ جنس نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے ثابت نہیں ہے۔ ضروری ہے کہ عمل کی جنس بھی پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام سے ثابت ہو۔ صدقۃ الفطر کی کچھ اجناس ہیں۔ اگر آپ کہیں کہ میں زیادہ اجر کے لیے کسی مہنگی جنس کا تعین کرتا ہوں، جیسے بادام ہیں، پستے اور چلغوزے ہیں۔ آج کل بڑے قیمتی ہیں تو میں ان اجناس کا صدقہ دیتا ہوں۔ رقم بہت خرچ ہوئی لیکن ثواب نہیں ملے گا۔ کیونکہ آپ نے عمل کو جس جنس پر قائم کیا ہے وہ پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام سے ثابت نہیں ہے۔ ضروری ہے کہ عمل کے تعلق سے اگر کوئی جنس ہے تو اس جنس کا پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام سے ثبوت ہو۔

③ اسی طرح عمل کی کیفیت ہے۔ اس عمل کی اگر کوئی کیفیت ہے تو اس کیفیت کا بھی پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام سے ثابت ہونا ضروری ہے، جیسے نماز ہے۔ اس کی ایک کیفیت ہے۔ جو قیام سے شروع ہوتی ہے، پھر رکوع ہے، سجود ہیں، تشہد ہے۔ اگر آپ اس کیفیت کو معکوس کردیں۔ تشہد سے شروع کریں پھر سجود اور رکوع اور قیام ہو، یہ ترتیب معکوس ہے۔ اور یہ کیفیت پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام سے ثابت نہیں ہے۔ صفتِ عمل میں، کیفیتِ عمل میں اگر کوئی عمل بھی نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے ثابت نہیں ہے، وہ تو عمل اللہ کے ہاں قابل قبول نہیں ہے۔ جیسے مسیئ الصلاۃ کی حدیث ہے۔ اس نے پیغمبر علیہ السلام کے سامنے نماز پڑھی۔ فرمایا:

«ارْجِعْ فَصَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ» [1] پھر پڑھو! یہ نماز نہیں ہوئی۔ اس کی نماز درست تھی، اس کی ترتیب بھی درست تھی۔ قیام بھی کیا، رکوع بھی، سجود بھی، تشہد بھی۔ تحریم سے تسلیم تک سب کام کیے۔ ایک کام کی کمی رہ گئی تھی اور وہ اعتدال اور اطمینان تھا۔ اس کی نماز میں اطمینان نہیں تھا، اعتدال نہیں تھا۔ رکوع سے اٹھتا اور پورے اطمینان سے قبل سجدے میں گر جاتا۔ سجدے سے اٹھتا تو پورے اطمینان سے قبل دوسرے سجدے میں گر جاتا۔ اس اعتدال کی کمی تھی۔ پیارے پیغمبر ﷺ نے فرمایا: یہ نماز نہیں ہوئی دوبارہ پڑھو! تو یہ کیفیت کا ایک فرق تھا۔ ثابت یہ ہوا کہ یہ کیفیت بھی ضروری ہے جو پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام سے ثابت ہو۔ اگر آپ پورا عمل کر جائیں اور کیفیتِ عمل میں کہیں فرق آجائے تو پھر وہ عمل اللہ کے ہاں قابلِ قبول نہیں۔ اسی لیے پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام نے ہر عمل کی کیفیت کے تعلق سے اتباع کا حکم دیا: «صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي» [2] نماز پڑھو بالکل ویسی جیسی میں پڑھتا ہوں۔ «لِتَأْخُذُوا مَنَاسِكَكُمْ فَإِنِّي لَا أَدْرِي لَعَلِّي لَا أَحُجُّ بَعْدَ حَجَّتِي هٰذِهِ» [3] ”شاید یہ میرا آخری حج ہو اور اس کے بعد مجھے تمھارے ساتھ حج کا موقع نہ ملے، لہٰذا اچھی طرح میرا طریقۂ حج دیکھ لو۔“ اس کی اتباع کرو، اسی کی تشہیر کرو، تاکہ میرے طریقۂ حج کو لوگ سنیں، سمجھیں اور اس کے مطابق حج کریں، کیونکہ ضروری ہے ہر عمل کی کیفیت پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام سے ثابت ہو۔

④ اسی طرح مقدارِ عمل ہے۔ اگر کسی عمل کی مقدار کا آپ تعین کرتے ہیں تو اس کی دلیل پیش کرنی پڑے گی۔ آپ ظہر کی چار رکعات کیوں پڑھتے ہیں؟ عصر کی چار رکعات کیوں پڑھتے ہیں؟ مغرب کی تین رکعات کیوں ہیں اور فجر کی دو رکعتیں کیوں ہیں؟

[1] صحيح البخاري، حديث: 757. [2] صحيح البخاري، حديث: 631. [3] صحيح مسلم، حديث: 1297، وسنن النسائي، حديث: 3062.

یہ عمل کی مقدار ہے۔ اس کو ثابت کرنا پڑے گا۔ اور اگر آپ کسی عمل کی کوئی مقدار طے کرلیں، اس پر عمل شروع کر دیں، سوائے ایسے عمل کے جس کی مقدار کے تعین کا شریعت نے اختیار دیا ہے جیسے اذکار ہیں۔ اذکار کا تعین آپ اپنے اوقات کو دیکھ کر کرسکتے ہیں۔ آپ دن میں ایک پارہ پڑھیں، دو پارے پڑھیں یا کوئی ذکر آپ سو دفعہ کریں، پانچ سو دفعہ کریں، اپنے اوقات کے مطابق اس کا تعین آپ کرسکتے ہیں، البتہ وہ اذکار جن کا تعین پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام سے تعداد کے ساتھ ثابت ہے، جیسے نماز کے بعد تینتیس بار سبحان اللہ، تینتیس بار الحمدللہ اور تینتیس بار اللہ اکبر اور سو کا عدد پورا کرنے کے لیے «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ» [1] یہ مقدار نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے ثابت ہے۔ تو کوئی بھی عمل ہو، اس کی مقدار کا تعین پیارے پیغمبر ﷺ فرمائیں گے۔ اسی لیے ہم دعوت دیتے ہیں کہ رمضان کی تراویح آٹھ ہی سنت ہیں۔ صحیح بخاری کی حدیث کے مطابق سیدہ عائشہ صدیقہ ﷝ سے پوچھا گیا کہ پیغمبر علیہ السلام رمضان میں کتنی رکعات پڑھتے تھے؟ آپ ﷝ نے مسئلے کو دوٹوک انداز سے بیان کیا اور کہا کہ رمضان ہو یا غیر رمضان ہو، پیارے پیغمبر ﷺ نے رات بھر گیارہ رکعات سے زیادہ کبھی نہیں پڑھی تھیں۔ [2] یہ تعداد کا تعین ہے۔ اس تعداد پر اضافہ کریں گے تو وہ اضافہ ثابت نہیں ہے۔ آپ کہیں گے: یہ تو طعن ہے امیر عمر بن خطاب ﷛ پر جن کے دور میں بیس رکعات پڑھی گئیں۔ جواب یہ ہے کہ بیس رکعات کی جتنی بھی اسناد ہیں وہ سب کی سب ضعیف ہیں اور صحیح بخاری کی اس حدیث کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ اس لیے وہ ناقابلِ التفات ہیں، لہٰذا کسی بھی عمل کی

[1] صحيح مسلم، حديث: 597. [2] صحيح البخاري، حديث: 1147.

مقدار ہے تو اس مقدار کو بھی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ثابت کرنا پڑے گا۔ تب وہ عمل اتباع کے دائرے میں آئے گا۔ اگر عمل ہو، خواہ کتنا ہی معتبر ہو مگر اس کی تعداد آپ کی طرف سے ہو اور مشروع تعداد کے خلاف ہو تو پھر وہ عمل مردود ہے اور نا قابلِ قبول ہے۔ عمل کی مقدار بھی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ثابت ہوگی تب وہ قابلِ قبول ہوگا۔

⑤ اسی طرح اگر کوئی عمل کا زمانہ ہے۔ کوئی عمل آپ کسی زمانے کے ساتھ مربوط کرتے ہیں تو ضروری ہے کہ اس زمانے کو بھی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ثابت کیا جائے کہ جب بھی وہ وقت آیا، وہ زمانہ آیا تو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وہ عمل کیا، جیسے ہر سال رمضان کا مہینہ آتا ہے۔ یہ پورا ایک مہینہ ایک زمانہ ہے جس میں روزے رکھے جاتے ہیں۔ روزہ ایک عمل ہے اور یہ ایک زمانے سے مربوط ہے۔ پورے مہینے کے روزے شوال میں نہیں ہوتے۔ ذوالحجہ میں نہیں ہوتے۔ صرف رمضان میں ہوتے ہیں۔ یعنی جو عمل آپ ایک زمانے سے مربوط کر کے کرتے ہیں وہ زمانہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ثابت ہے۔ اس زمانے کو اگر آپ تبدیل کرنے کی کوشش کریں گے، رمضان کے روزے آپ شوال میں رکھیں، رجب میں رکھیں تو وہ قابلِ قبول نہیں ہوں گے، کیونکہ عمل کا زمانہ پیارے پیغمبر ﷺ نے متعین کر دیا اور وہ ماہِ رمضان ہے جس کو ماہِ صیام قرار دیا گیا ہے۔ حج کا ایک زمانہ ہے۔ اس زمانے میں حج کرنا پڑے گا جو کہ آٹھ یا نو ذوالحجہ سے شروع ہوتا ہے اور بارہ یا تیرہ ذوالحجہ تک وہ عمل قائم رہتا ہے جیسا کہ احادیث ہیں۔ اگر آپ یہ عمل اس زمانے کے علاوہ کریں گے کہ میں شوال میں فارغ ہوتا ہوں حج کرلوں۔ رش سے بچ جاؤں گا، وہ عمل قابلِ قبول نہیں ہے۔ کیونکہ اس عمل کی تحدید ایک زمانے کے ساتھ ہے اور اس کو ایک زمانے سے جوڑا گیا ہے، مربوط کیا گیا ہے،

یہ عمل اس زمانے میں معتبر ہوگا۔ اور آپ کسی بھی عمل کو اگر کسی زمانے سے مخصوص کرتے ہیں تو اس زمانے کو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ثابت کرنا پڑے گا ورنہ وہ عمل نا قابلِ قبول ہے۔

عید میلاد النبی کی شرعی حیثیت

یہیں سے ہمارا سوال ہے کہ بارہ ربیع الاول، اس میں ایک عمل ہر سال کیا جاتا ہے، بڑھ چڑھ کر کیا جاتا ہے۔ اور ایک خاص عبادت کا اہتمام کیا جاتا ہے جس کو جلوسوں اور ریلیوں کا نام دیا جاتا ہے اور اس کو اظہارِ خوشی کی اساس قرار دیا جاتا ہے اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت کا مظہر قرار دیا جاتا ہے۔ تو کسی بھی عمل کا کسی زمانے سے مربوط ہونا اتباع کے تحت ہے اور شرعی دلیل کا متقاضی ہے۔ تو اس عمل کو ایک زمانے سے مربوط کیا گیا، پہلے اس عمل کو ثابت کرنا پڑے گا، پھر اس کے زمانے کو ثابت کرنا پڑے گا۔ اور یہ دونوں چیزیں کتاب وسنت سے ثابت نہیں ہیں۔ نہ یہ عمل اور نہ اس عمل کا زمانہ۔

پیارے پیغمبر محمد رسول اللہ ﷺ جن کی پیدائش کی خوشی میں سارے اہتمام کیے جاتے ہیں، منصبِ رسالت سنبھالنے کے بعد تیئس دفعہ یہ دن آپ کی زندگی میں آیا، آپ نے کبھی اس کا اہتمام کیا ہو؟ آپ کی وفات کے بعد خلافت علی منہاج النبوۃ تیس سال تک قائم رہی۔ ابوبکر صدیق، عمر بن خطاب، عثمانِ غنی، علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم اجمعین یکے بعد دیگرے خلیفہ منتخب ہوئے اور یہ تیس سالہ دور ہے خلافة علی منهاج النبوة کا، خلافت راشدہ کا جس کی تحدید پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خود فرمائی ہے۔ اس زریں دور میں بھی تیس دفعہ یہ دن آیا اور کبھی یہ اہتمام نہیں کیا گیا۔ صحابہ کا دور تقریباً 80 ہجری تک قائم رہا اور ان اسی سالوں میں کبھی یہ اہتمام نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد تابعین کا دور آیا

جو ائمہ ملت، محدثین اور فقہاء کا دور ہے۔ اس دور میں بھی کبھی اس عمل کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ تو یہ عمل اور اس عمل کا زمانہ ان دونوں چیزوں کو محکم دلائل سے ثابت کرنا پڑے گا۔ اور دلیل کوئی نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جس دور کو خیر القرون کہا، فرمایا کہ «خَيْرُ النَّاسِ قَرْنِي، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ» [1] سب سے بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے، اس کے بعد اگلا زمانہ، پھر اگلا زمانہ اور آپ نے تین ادوار کے بعد فرمایا: پھر فتنے ہوں گے۔ تو جو دور خیر القرون ہے اور بہترین دور ہے ان ادوار میں اس عمل کو ثابت کرنا پڑے گا۔ اور خیر القرون میں ائمہ ملت میں سے بھی کچھ کا دور آجاتا ہے، جیسے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ جن کی تقلید اس ملک میں عام ہے، انھی سے کم از کم اس عمل کا اہتمام ثابت کردیا جائے، لیکن کوئی اس کو ثابت نہیں کرسکتا۔

کئی صدیوں کے بعد مصر میں ایک فاطمی خاندان ہوا جس کی اساس غلط نسب پر اور ضلالت پر تھی، یہ انھوں نے ترویج دیا۔ اس کے بعد سے رائج رہا، آج تک چلا آرہا ہے مختلف رویوں کے ساتھ، رنگوں کے ساتھ اور مختلف کیفیتوں کے ساتھ اور ہر سال کیفیتیں تبدیل ہورہی ہیں۔ اور یہ بھی اس عمل کے بدعت ہونے کی ایک دلیل ہے۔ سنت جب سے شروع ہوئی ہے آج تک ایک ہے اور قیامت تک ایک ہی رہے گی۔ مشرق میں بھی وہی، مغرب میں بھی وہی، شمال میں وہی، جنوب میں وہی، عرب میں وہی، عجم میں وہی۔ بدعت ایک ایسی چیز ہے جو ہر سال رنگ بدلتی ہے اور ہر مقام پر رنگ بدلتی ہے۔ اس بارہ ربیع الاول کو منانے کے اہتمامات مصر میں کچھ اور ہیں، ایران میں کچھ اور ہیں، ہندوستان، پاکستان میں کچھ اور ہیں۔ یہ بھی ایک دلیل ہے کہ

[1] صحيح البخاري، حديث:2652.

یہ سنت نہیں بلکہ بدعت ہے۔ سنت کا ایک ہی رنگ ہے، اس میں کبھی تبدیلی واقع نہیں ہوسکتی۔ ہاں بدعت اپنے رنگ تبدیل کرتی رہتی ہے۔ تو پھر یہ عمل اور اس عمل کا زمانہ دونوں چیزوں کو ثابت کرنا پڑے گا جو کہ قطعاً ثابت نہیں ہوسکتا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث سے تہتر فرقوں کی نشاندہی کی۔ میری امت میں تہتر فرقے ہوں گے۔ «كُلُّهُمْ فِي النَّارِ إِلَّا مِلَّةً وَاحِدَةً» ''سب جہنم میں جائیں گے سوائے ایک کے۔'' صحابہ نے پوچھا: وہ ایک کون ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «مَا أَنَا عَلَيْهِ الْيَوْمَ وَأَصْحَابِي» ''یہ ایک گروہ وہ ہے جو اس چیز پر قائم ہو جس پر آج میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں۔'' [1] آپ ﷺ نے یہ حدیث بالکل دوٹوک الفاظ میں ارشاد فرمائی۔ یہ جوامع الکلم میں سے ہے۔ اور یہ حدیث قاطع النزاع ہے، یعنی جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں جو ملت اور جماعت اس پر قائم رہے گی وہ جنتی ہے۔ فرقہ ناجیہ اور طائفہ منصورہ ہے۔ اور جو اس راستے سے ہٹ گیا وہ جہنمی گروہ ہے۔ تو پھر یہ عمل پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کم از کم ثابت کیا جائے۔ صحابہ کے دور میں ہوا ہو، حالانکہ صحابہ سے بڑھ کر پیغمبر علیہ السلام سے محبت کرنے والا اور پیار کرنے والا کون ہے؟ وہ حقیقتاً اللہ کے نبی سے محبت کرتے تھے۔

جنگ بدر کے موقع پر مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: یارسول اللہ! آپ نے بہت سی دعائیں کرلیں، اب پریشان نہ ہوں۔ یہاں تک آپ ﷺ نے فرمادیا تھا کہ یااللہ! اگر یہ جماعت آج میدانِ بدر میں ہلاک ہوگئی تو پھر قیامت تک تیری عبادت کرنے والا کوئی پیدا نہیں ہوگا۔ [2] بڑی مشکل سے یہ اکٹھی ہوئی ہے۔ مقداد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ

[1] سنن ابن ماجه، حديث: 3993، و المستدرك للحاكم: 174/1. [2] صحيح البخاري، حديث:3953.

یارسول اللہ! «لَسْنَا أَصْحَابَ مُوسٰی» ''ہم کوئی قومِ موسیٰ نہیں ہیں۔'' اللہ نے ان کو فرمایا تھا کہ فلاں علاقے میں داخل ہو جاؤ، داخل ہونا ہی فتح کی علامت ہے۔ مگر قومِ موسیٰ نے انکار کردیا۔ اگر فتح اتنی آسان ہے تو موسیٰ! تم چلے جاؤ، تمھارا رب چلا جائے۔ ہمیں اطلاع کردینا کہ علاقہ فتح ہوگیا ہے ہم بھی پہنچ جائیں گے۔ فرمایا کہ «وَلٰكِنَّا نُقَاتِلُ عَنْ يَمِينِكَ وَعَنْ شِمَالِكَ وَ بَيْنَ يَدَيْكَ وَخَلْفَكَ» ''ہم لڑیں گے آپ کے آگے، آپ کے پیچھے، آپ کے دائیں اور آپ کے بائیں۔''[1] جہاں آپ کے پسینے کا قطرہ گرے گا وہاں اپنے گلے کٹوادیں گے اور خون بہادیں گے۔ کتنا عظیم ہے یہ جملہ، محبت کا مظہر ہے یہ جملہ۔ صحابہ کرام کو نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے محبت تھی۔ اپنا جان و مال آپ پر فدا کرنے کے لیے تیار تھے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سب کچھ قربان کیا، لٹادیا اپنے پیارے پیغمبر پر، آپ کی عزت پر اور آپ کے دین پر۔ اس طرح سارے صحابہ کے کچھ نہ کچھ واقعات ملتے ہیں جو پیارے پیغمبر کی محبت کا مظہر ہیں۔ اور اگر یہ بھی محبت کی اساس ہوتی تو صحابہ کرام یہ کام بڑھ چڑھ کر کرتے۔ اگر نبی کی محبت میں گلے کٹوا سکتے تھے تو یہ کام کون سا مشکل ہے! حلوے اور قورمے کھانا کون سا مشکل ہے! جلوس اور ریلیوں کا اہتمام کون سا مشکل ہے۔ چراغاں کرنا کون سا مشکل ہے۔ لیکن صحابہ سے ایسا کوئی اہتمام ثابت نہیں ہے۔ تو عمل، اس کی کیفیت، اس کا زمانہ، یہ تمام چیزیں ثابت ہوں گی تو پیغمبر کی اتباع میں آئیں گی، اگر کوئی چیز نفی ہوگئی تو پیغمبر کی اتباع سے خارج ہے۔

⑥ اسی طرح اگر وہ عمل کسی مکان یا جگہ سے منسلک ہے تو اس مکان اور جگہ کا ثابت

[1] صحيح البخاري، حديث:3952.

ہونا بھی ضروری ہے۔ جس طرح بیت اللہ کا طواف ہے اور یہ وہیں کی عبادت ہے۔ اگر آپ طواف کہیں اور کریں گے تو وہ طواف کا محل نہیں ہے، طواف کی جگہ نہیں ہے، اس کو ثابت کرنا پڑے گا۔ طواف ثابت ہے لیکن طواف کا محل ثابت کرنا پڑے گا۔ جیسے بہت سے بدبخت لوگوں نے آج سیہون کے حج کی اختراع نکالی ہوئی ہے کہ بیت اللہ کا حج امیروں کا حج ہے اور سیہون کا حج غریبوں کا حج ہے۔ طواف اور سعی جیسی مذموم حرکات وہاں پر کرتے ہیں۔ طواف ایک عبادت ہے، اس عبادت کا محل اللہ کا گھر ہے اور یہ ثابت ہے۔ کسی اور مقام پر یہ طواف کریں گے تو وہ ثابت نہیں ہے۔ ان کا ذہن ہے کہ ہم طواف ہی تو کررہے ہیں، کون سا گناہ کا کام کررہے ہیں۔ نہیں، طواف عبادت ہے لیکن جو محل کا تعین کیا گیا وہ محل پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام سے ثابت نہیں ہے۔ ''کوہِ مراد'' تربت میں ایک پہاڑ ہے، ذکری فرقہ وہاں حج کرتا ہے، طواف کرتا ہے۔ تو یہ نہ سمجھیں کہ طواف ایک عبادت ہے، عمل تو اچھا ہورہا ہے۔ نہیں، یہ طواف کا محل نہیں ہے۔ یہ طواف کی جگہ نہیں ہے۔ جو نیکی کسی جگہ سے مربوط ہوگی ضروری ہے کہ وہ جگہ پیارے پیغمبر کی سنت سے یا پیارے پیغمبر کے فرمان سے ثابت کرو۔ خالی عمل نہیں دیکھا جائے گا، عمل کا محل اور مقام دیکھا جائے گا۔ عرفہ، نو ذوالحجہ، عرفہ کا وقوف، یہ عبادت مکان اور زمان دونوں کے ساتھ مربوط ہے۔ عرفہ کا وقوف 9 ذوالحجہ کو ہوگا، اگر آٹھ کو کریں گے قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ دس کو کریں گے قابلِ قبول نہیں ہوگا۔

اور 9 ذوالحجہ ہو، یہ وقوف آپ منیٰ میں کرلیں قابل قبول نہیں ہوگا۔ یہ ایک ایسی عبادت ہے جس کا تعلق زمانے سے بھی ہے اور جگہ سے بھی۔ زمانہ کیا ہے؟ نو ذوالحجہ۔ دلیل کیا ہے؟ پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کا عمل۔ جگہ کیا ہے؟ عرفہ کا میدان۔ دلیل کیا ہے؟ پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام

کا عمل۔ تو آپ اسی طرح کوئی بھی عمل کسی زمانے سے جوڑیں گے، کسی مقام سے
جوڑیں گے تو اس جگہ کو اور اس زمانے کو ثابت کرنا پڑے گا۔ خالی عمل کافی نہیں ہے۔
بلکہ ثابت کرنا پڑے گا کہ یہ جگہ اور یہ زمانہ پیارے پیغمبر ﷺ سے ثابت ہے۔

یہ چھ حقیقتیں ہیں اتباع کی۔ اس کے بغیر حقیقت اتباع ثابت نہیں ہوسکتی۔ ہم کہتے
ہیں کہ ان چھ حقائق میں سے کوئی حقیقت یہاں منطبق کر کے دکھا دیں۔ پہلے کوئی شخص
یہی بتادے کہ ربیع الاول جو نام اس وقت سے چلا آرہا ہے جب اللہ تعالیٰ نے آسمان و
زمین پیدا کیے تھے اور آج تک چلا آرہا ہے، اس مہینے کے نام کو تبدیل کرنے کی کیا
دلیل ہے؟ ربیع النور۔ پیارے پیغمبر ﷺ نے یہی نام برقرار رکھا۔ تو اس نام کو تبدیل
کرنے کی کیا وجہ ہے؟ اور کس دلیل کے تحت؟ پھر جو حرکات اور جو اعمال ان دنوں
میں انجام دیے جاتے ہیں ان تمام کو ثابت کرنا پڑے گا۔ ان کا سبب ثابت کرنا پڑے
گا۔ ولادتِ رسول سبب ہے۔ مگر اس ولادت کے سبب کو سامنے رکھتے ہوئے پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام
نے اس قسم کے عمل کا اہتمام کیا ہو، یہ ثابت نہیں۔ جنس عمل ثابت کرنی پڑے گی۔
مقدارِ عمل ثابت کرنی پڑے گی۔ زمانۂ عمل ثابت کرنا پڑے گا۔ مکانِ عمل ثابت کرنا
پڑے گا اور اس کے ساتھ ساتھ کیفیت عمل ثابت کرنا پڑے گی۔ ان میں سے کوئی چیز
بھی یہاں منطبق نہیں ہورہی۔ تو پھر یہ ایک ایسا عمل ہے جو قطعاً بدعت ہے۔ پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام
کی سنت، آپ کے منہج اور آپ کے دین سے قطعاً ثابت نہیں ہے۔

اس موقع پر دو باتیں کی جاتی ہیں: ایک عمل کی حکمت، دوسرا عمل کی مشقت۔ ہم
کہتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں بھی پیارے پیغمبر ﷺ کی سنت کے ساتھ مربوط ہوں۔
لوگ کہتے ہیں کہ یہ سارا عمل ہم کس لیے کرتے ہیں؟ اپنے پیارے پیغمبر کی محبت میں۔

اپنے پیارے پیغمبر کے پیار کی وجہ سے یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ ہمیں آپ کی ولادت
باسعادت کی خوشی ہے۔ اس خوشی کا اہتمام ہوتا ہے۔ اس خوشی میں یہ سب کچھ کرتے
ہیں۔ یہ محبت کا مظہر ہے اور آپ کے پیار کی دلیل ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ محبت اور پیار
بھی ایک عبادت ہے اور یہ بھی دلیل سے ثابت ہوگی۔ کوئی عبادت بغیر دلیل کے ثابت
نہیں ہوسکتی۔ اور پھر کسی مسئلے کی علت، کسی مسئلے کی وجہ اور سبب یہ بھی پیارے پیغمبر کی
سنت کے ساتھ مربوط ہے بغیر سنت کے نہیں۔ اس طرح تو کوئی بھی انسان، کسی بھی
حکمت کی بنا پر کسی بھی عمل کی اختراع کرسکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ ہر عمل کی اگر کوئی علت
ہے تو وہ علت ثابت کرنی پڑے گی۔ ویسے ہمارا اہل الحدیث کا یہ عقیدہ ہے کہ کوئی عمل
پیارے پیغمبر سے ثابت ہو تو آپ سے ثابت ہونا ہی اس عمل کی حکمت ہے۔ جو عمل
آپ نے کیا ہے آنکھیں بند کر کے ہمارا یہ عقیدہ اور ایمان ہے کہ وہ عمل انتہائی حکیمانہ
ہے کیونکہ پیارے پیغمبر نے کیا ہے۔ پیارے پیغمبر کا کرنا ہی اس عمل کی حکمت ہے۔
حکمت وہ نہیں ہے جو ہم خود بنائیں اور سوچیں اور پھر اس کے تحت کسی عمل کو ایجاد
کرلیں۔ بلکہ حکمت یہ ہے کہ ایک عمل اللہ کے پیغمبر نے کیا تو آپ کا کرنا ہی حکمت
سے بھرپور اور لبریز ہے۔ جو کام آپ نے نہیں کیا اس میں کوئی حکمت نہیں ہے۔ اور جو
کام آپ نے کیا وہ سراسر حکمت کی اساس پر ہے۔ ہماری عقل میں وہ آئے یا نہ آئے۔

تو یہ قاعدہ باطل ہے کہ آپ کوئی اچھی حکمت خود ہی اختراع کرلیں اور اپنی اختراع
کردہ حکمت پر کسی عمل کو ایجاد کرلیں۔ یہ قطعاً دین اور شریعت نہیں ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم
کی یہی فکر تھی۔ ام المومنین سے ایک سوال ہوا کہ «مَابَالُ الْحَائِضِ تَقْضِي الصَّوْمَ
وَلَا تَقْضِي الصَّلَاةَ» ایک حائضہ عورت جو اپنے مخصوص ایام سے گزرتی ہے روزہ

نہیں رکھتی، نمازیں نہیں پڑھتی لیکن بعد میں روزوں کی قضا کرتی ہے جبکہ نماز کی قضا نہیں کرتی، اس میں کیا علت اور کیا حکمت ہے؟ روزے کی قضا کیوں ہے؟ اور نماز کی قضا کیوں نہیں ہے؟ کیا فرق ہے؟ کیا علت اور کیا حکمت ہے؟ ام المومنین نے اس سوال پر کوئی توجہ نہیں دی بلکہ اس کا جواب یوں دیا: «نُؤْمَرُ بِقَضَاءِ الصَّوْمِ وَلَا نُؤْمَرُ بِقَضَاءِ الصَّلَاةِ» ”روزے کی قضا کا ہمیں حکم دیا جاتا تھا اور نماز کی قضا کا ہمیں حکم نہیں دیا جاتا تھا۔“ [1] بس پیارے پیغمبر کا حکم حکمت ہے اور جو حکم آپ نے نہیں دیا اس میں کوئی حکمت نہیں ہے۔ تو یہ ہے اصل دین اور صحیح فہم۔ تو کوئی بھی حکمت اختراع کر کے اس کی اساس پر کسی عمل کو آپ ایجاد کر لیں جیسے حکمت یہ ہے کہ پیغمبر کا عشق، پیغمبر کی محبت اور پیار اور پیغمبر کی ولادت کی خوشی اور اس اساس پر عمل یہ ہے کہ جلوسوں کا اہتمام، ریلیوں کا اہتمام اور پھر رات کے قیام کا اہتمام، مختلف پکوانوں کا اہتمام۔ یہ سارے اعمال جس حکمت سے جوڑے گئے ہیں نہ یہ حکمت ثابت اور نہ وہ عمل ثابت ہے اور یہ چیز حقیقتِ اتباع کے خلاف ہے۔ ہم مسلکِ اتباع کی دعوت دیتے ہیں۔ تو اس طرح تو کوئی بھی شخص حکمت کا اختراع کر کے اس کی اساس پر کوئی بھی عمل جوڑ سکتا ہے۔ اللہ رب العزت رحمتیں نازل فرمائے امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ پر۔ صحابہ کی ایک نشست طلب کرتے ہیں۔ بڑے وقیع القدر صحابہ اس میں موجود تھے۔ اور ایک مسئلہ اٹھایا کہ جب حاجی طوافِ قدوم کرتا ہے۔ عمرہ کرنے والا طوافِ قدوم کرتا ہے تو اس طواف میں رمل کرتا ہے، یعنی اکڑ کے چلتا ہے، بازو پھیلا کر چلتا ہے اور دایاں کندھا کھول کر چلتا ہے۔ اس کی نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے دور میں ایک وجہ تھی۔ جب ہم

[1] صحیح مسلم، حدیث: 335.

عمرۃ القضا کرنے گئے تھے، مشرکین مکہ نے کہا تھا: «قَدْ وَهَنَتْهُمُ الْحُمَّى» مسلمانوں کو بخار نے مار دیا ہے تو یہ مکمل عمرہ کر ہی نہیں سکیں گے۔ بیت اللہ کے طواف، سات چکر، صفا و مروہ کی سعی جو ڈھائی کلومیٹر تک محدود ہے اس میں چلنا اور دوڑنا، مسلمان یہ پورا کر ہی نہیں سکیں گے، چنانچہ یہ لوگ عمرہ کرنے آرہے ہیں۔ ہم تماشا دیکھنے بیٹھتے ہیں اور جب یہ تھک ہار کے بیٹھ جائیں گے، گر جائیں گے تو ہمیں استہزاء کا موقع مل جائے گا، چنانچہ وہ ایک طرف پہاڑ پر بیٹھ گئے۔ صحابہ کرام اور پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام عمرہ کر رہے تھے۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کو ان کی اس بات کی اطلاع مل چکی تھی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہم رمل کریں گے، اکڑ کر اور سینہ پھیلا کر چلیں گے، بازو کھول کر اور تھوڑا سا بھاگتے ہوئے چلیں گے اور دائیں کندھے کو کھول کر چلیں گے تاکہ ہمارے بازو کی قوت اور صلابت ان پر ظاہر ہو۔ مشرکین مکہ تو استہزا کی نیت سے پہاڑ پر بیٹھے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ لیکن انھوں نے دیکھا کہ مسلمان تو شکرے کی طرح چھلانگیں مار رہے ہیں جن کے کندھوں میں طاقت نظر آرہی ہے تو وہ مایوس ہو گئے۔ [1]

امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اب مکہ فتح ہو چکا، مشرکین مکہ کا صفایا ہو چکا اور مکہ دارالاسلام بن چکا ہے۔ اب یہاں پر کفار نہیں ہیں بلکہ یہاں کفار کا داخلہ بھی منع ہے۔ اب ہم بازو کیوں کھولیں؟ اور شکرے کی طرح چھلانگیں کیوں لگائیں؟ رمل کیوں کریں؟ سوال یہی پیدا ہوتا ہے، حکمت جو کارفرما تھی وہ ختم ہو چکی۔ اب یہ کام کیوں کریں؟ فرمایا کہ خبردار! جو عمل اللہ کے پیغمبر کے دور میں ہم کرتے تھے وہ قیامت تک کے لیے مہر ہے۔ کوئی طاقت اس کو ختم نہیں کر سکتی۔ میں نے اس دفعہ تمھیں اس لیے

[1] صحیح مسلم، حدیث: 1266.

بلایا ہے کہ آج کے بعد کوئی امیر، کوئی حاکم، کوئی مفتی، کوئی مجدد، کوئی فقیہ اس حکمت کو سامنے رکھتے ہوئے اس عمل کو ختم کرنے کی کوشش نہ کرے۔ یہ پیارے پیغمبر ﷺ کا امر تھا۔ پیارے پیغمبر کی سنت تھی اور پیارے پیغمبر کی سنت جب شروع ہوتی ہے تو قیامت تک قائم رہتی ہے۔ کوئی دنیا کا مفتی اور کوئی دنیا کا امام اسے ختم نہیں کر سکتا، حالانکہ اس مسئلے کی حکمت ختم ہو چکی۔ دین حکمت کے ساتھ مربوط نہیں ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ کے پیغمبر نے جو حکم دیا اس کی کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہے۔ ہمیں سمجھ آئے یا نہ آئے۔ اس حکمت کا سمجھنا ضروری نہیں ہے۔ یاد رکھو! دین تو اتباع کا نام ہے۔

گوشت اونٹ کا بھی ہے اور گوشت گائے کا بھی ہے۔ کیا وجہ ہے گائے کا گوشت کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا، اونٹ کا گوشت کھانے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ حکمت میں پڑو گے تو پریشان ہو کر بیٹھ جاؤ گے۔ کیا فرق ہے؟ گوشت یہ بھی ہے اور گوشت وہ بھی ہے۔ دودھ پیتا بچہ اگر پیشاب کر دے تو چھینٹے مارنا کافی ہے، کپڑا پاک ہو جائے گا۔ دودھ پیتی بچی اگر پیشاب کر دے، اسے دھونا ضروری ہے ورنہ وہ کپڑا پاک نہیں ہوگا۔ کیا فرق ہے؟ یہ بھی پیشاب ہے، وہ بھی پیشاب ہے۔ اور یہ بھی دودھ پیتے بچے کا ہے، وہ بھی دودھ پیتے بچے کا ہے۔ کیا فرق ہے ان دونوں میں؟ حکمت پر بیٹھو گے تو تم کبھی کامیاب نہیں ہو سکو گے، پریشان ہی رہو گے۔

نماز ظہر کی چار رکعتیں سری کیوں ہیں؟ عصر سری کیوں ہے؟ مغرب میں دو رکعت جہری اور ایک سری کیوں ہے؟ فجر میں دو رکعت اور دونوں جہری کیوں ہیں؟ عشاء میں چار رکعت ہیں دو جہری اور دو سری کیوں ہیں؟ عشاء کی نماز چار رکعت کیوں فرض ہے؟ مغرب کی تین کیوں ہیں؟ فجر کی دو کیوں ہیں؟ اگر آپ حکمت پر غور کریں گے تو

وہ تو بتائی ہی نہیں گئی۔ حکمت ضرور ہے مگر بتائی نہیں گئی۔ یہ دین دینِ اتباع ہے۔ اگر آپ اس چکر میں پڑ جائیں کہ میرے سامنے حکمت واضح ہو تو پھر قبول کروں گا تو آپ اتباع نہیں کر رہے بلکہ اپنی عقل اور فہم کے غلام بن گئے ہیں۔ جو سمجھوں گا وہ مانوں گا، جو سمجھ نہیں پاؤں گا اس کو نہیں مانوں گا۔ یہ درایت کا مسئلہ گمراہی کی اساس ہے، گمراہی کی کڑی ہے۔ تو ایک حکمت آپ خود تراش کر اس پر کسی مسئلے کو مربوط کریں، اس کو شریعت قرار دیں، یہ قطعاً شریعت نہیں ہے۔ حکمت کیا ہے؟ محبت رسول۔ عمل کیا ہے؟ جلوسوں اور ریلیوں کا اہتمام۔ تو نہ یہ حکمت اور نہ یہ عمل جو اس موقع پر ہے، بن سکتا ہے۔

محبتِ رسول حق ہے۔ اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہو سکتا بلکہ پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کی ایسی محبت فرض ہے جو پوری کائنات کی محبت پر غالب ہو۔ لیکن محبت کی اس حکمت کی اساس پر ایسے عمل کرنا جو اللہ کے پیغمبر سے ثابت ہی نہیں، یہ دین نہیں ہے۔ بلکہ صرف وہ عمل کریں گے جو پیارے پیغمبر ﷺ سے ثابت ہے۔ پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کی اتباع آپ کی محبت کی علامت ہے۔ پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کی اطاعت آپ کی محبت کی علامت ہے۔ پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کی تعظیم آپ کی محبت کی علامت ہے۔ پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام پر کثرت سے درود پڑھنا اور سلام بھیجنا آپ کی محبت کی علامت ہے۔ پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کے دین کو سچا جاننا آپ کی محبت کی علامت ہے۔ پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کی ایسی تصدیق کہ جو حدیث ہمارے سامنے آئے گی اسے قبول کریں گے، اپنی برادری کے خلاف پا کر، اپنے امام کے فتوے کے خلاف پا کر، اپنے پیرومرشد کے قول کے خلاف پا کر کسی حدیث کو رد نہیں کریں گے، محبت یہ ہے کہ پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کا فرمان آ جائے، اس کے خلاف پوری دنیا ہو، دنیا کے محدثین اور فقہاء ہوں، دنیا کے

سارے مجددین ہوں، سارے عوام ہوں، سب کو ٹھکرا دو اور چھوڑ دو اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فرمان کو سینے سے لگا لو۔ یہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت کے تقاضے ہیں۔ تو حکمت اور اس حکمت کے تحت عمل یہ دونوں چیزیں شریعت سے ثابت ہونا ضروری ہیں۔ حکمت اگر شرعی ہے، اس پر عمل کی اساس غیر شرعی ہے تو وہ دین نہیں ہے بلکہ وہ بدعت ہے۔

اسی طرح بعض لوگ اپنے عمل کو مشقت پر محمول کر کے اس میں ثواب کی حرص لیے بیٹھے ہیں کہ شریعت تو کہتی ہے: کسی شخص کے پاؤں میں کانٹا چبھ جائے تو اس کے گناہ معاف ہوتے ہیں جبکہ جلوس کا اہتمام، بعض اوقات اس میں کئی میل پیدل چلتے ہیں، پسینے بہتے ہیں، تھکاوٹ سے چور ہوتے ہیں، مختلف پکوان پکتے ہیں، اس کے لیے محنت ہے، مشقت ہے اور پیسوں کا خرچ کرنا ہے۔ اس ساری مشقت کا کوئی اجر نہیں ہے۔ کسی کھاتے میں نہیں ہے۔ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ مشقت بھی ایک ایسا مسئلہ ہے جو اللہ کے پیغمبر کی سنت سے ثابت ہوگا تو قابلِ قبول ہوگا ورنہ ہر وہ مشقت جو اللہ کے پیغمبر کے منہج اور آپ کے دین سے ہٹ کر ہے اس کا کوئی اجر نہیں ہے۔ تبھی آپ نے اس صحابی سے فرمایا تھا جو حج کرنے نکلا اور پیدل چل دیا کہ سفرِ حج کے دوران پیدل چلوں گا، سواری پر نہیں بیٹھوں گا، دھوپ میں چلوں گا اور سایہ استعمال نہیں کروں گا اور کھاؤں گا نہیں اور پیوں گا نہیں۔ بھوکا اور پیاسا رہوں گا تاکہ مشقت پر اللہ تعالیٰ سے بڑا اجر حاصل کرلوں۔ اجر کثیر کا مستحق بن جاؤں۔ حتی کہ چلتے چلتے بے ہوش ہو کر گر گیا۔ صحابہ اس کو سہارے دے رہے ہیں، اس کو سنبھال رہے ہیں۔ اللہ کے پیغمبر نے پوچھا: کیا ماجرا ہے؟ عرض کیا کہ یہ صحابی ان چار ارادوں کے ساتھ نکلا تھا۔ بھوکا اور پیاسا چلتا رہا، پیدل چلتا رہا، مسلسل دھوپ میں سفر کیا، پڑاؤ ڈالتے تو وہاں بھی سائے

تلے نہیں بیٹھتا تھا بلکہ دھوپ میں بیٹھتا، تو کب تک برداشت کرتا؟ حتی کہ غش کھا کر گر گیا۔ اس کی حرص یہ تھی کہ ثواب زیادہ ملے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس مشقت میں اس نے اپنے آپ کو ڈال رکھا ہے، اللہ کا دین اس سے لاتعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہے۔ اس کو بتا دو کہ تمھیں اللہ کی اطاعت کرنی ہوگی۔ اس کو حکم دو کہ یہ کھانا کھائے اور پانی پیے، سواری پر سفر کرے اور سائے تلے بیٹھے۔ جس تکلیف میں اس نے اپنے آپ کو ڈال رکھا ہے، اللہ کا دین اس سے بری ہے۔ [1]

عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی بہن بھی اس عزم کے تحت نکلی کہ پورے سفرِ حج کے دوران میں سواری پر نہیں بیٹھوں گی، ننگے پاؤں چلوں گی اور ننگے سر رہوں گی۔ سواری پر اس لیے نہیں بیٹھوں گی کہ پیدل چلنے کی تکلیف پر اللہ سے اجر کی حرص لیے اور ننگے پاؤں اس لیے کہ راستے میں کانٹے چبھیں گے، ٹھوکریں لگیں گی، پاؤں زخمی ہوں گے، اس پر بھی ثواب ملے گا۔ اور ننگے سر اس لیے کہ سر ڈھانپنا ایک شرف کی علامت ہے اور سر کو کھولنا اس دور میں ذلت کی علامت تھی۔ چونکہ حج کی عبادت اللہ کے لیے ہے تو اللہ کے سامنے اظہارِ ذلت اور تذلل پر اضافی اجر ملے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عقبہ! اپنی بہن کو کہہ دو: «إِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنْ نَّذْرِهَا» اگر ایسا کرو گی، پورا سفرِ حج پیدل کرو گی، ننگے پاؤں چلو گی، ننگے سر رہو گی تو لوگ اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور جنت کے وعدے لے کر لوٹیں گے اور تمھاری بہن لوٹے گی اللہ کا غضب اور اس کی ناراضی لے کر، کیونکہ اس مشقت کا اللہ کے دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ [2] مشقت کی کوئی

[1] صحیح البخاري، حدیث:6703-4، و سنن أبی داود، حدیث:3300. [2] صحیح مسلم، حدیث:1644، و سنن أبي داود، حدیث:3297، و إرواء الغلیل:324/8.

اساس نہیں ہے۔ بلکہ ہر وہ مشقت جو اللہ کے پیغمبر کے دین کے تابع ہے، جو آپ کے فرامین کے تابع ہے، اس کا اجر ہے۔ بنوسلمہ والوں نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ ہم اپنے گھر مسجد نبوی کے قریب لے آئیں، ہمارے گھر دور ہیں۔ کسی کا گھر ایک میل کے فاصلے پر تو کسی کا دو میل کے فاصلے پر۔ اپنے گھر ہم قریب لے آئیں تا کہ مسجد نبوی کا پڑوس ہم کو حاصل ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بنوسلمہ! «آثَارَكُمْ» اپنے گھر اگر قریب لے آؤ گے تو یہ ایک میل اور دو میل نماز کے لیے پیدل چل کر آتے ہو، ان قدموں کا ثواب تمھیں کیسے ملے گا؟ [1] یہ مشقت ہے۔ ایک میل چلنا، دو میل چلنا، کس عمل کے لیے؟ نماز کی ادائیگی کے لیے، مسجد میں حاضری کے لیے۔ یہ مشقت اللہ کے پیغمبر کے دین کے دائرے میں ہے۔ اس کا اجر اور ثواب ہے۔ لیکن ایک شخص ایک مشقت کا پہلو اپنی طرف سے طے کر لے، اس پر عمل کرنا شروع کر دے، وہ مشقت چونکہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے عمل سے، آپ کے منہج سے، آپ کے دین سے ثابت نہیں، لہٰذا اس کا کوئی اجر و ثواب نہیں ہے۔ تو کسی بھی عمل کے تعلق سے مشقت کی اساس، مشقت کی نیت یہ بھی ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے لیے دلیل پیش کرنا ضروری ہے۔ دلیل کے بغیر نہیں۔ مشقت کا جو راستہ ہے اس کی تحدید بھی اللہ کے پیغمبر کی سنت کرتی ہے اور اللہ کے پیغمبر کے فرامین کرتے ہیں، انسان کی اپنی عقل نہیں۔ انسان اپنی عقل سے کسی عمل کو مشقت پر محمول کر کے، اسے اپنائے اور اس پر اجر کی حرص رکھے، ہرگز نہیں۔ ایسا ممکن نہیں ہے۔ جیسے ان صحابہ نے کہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے تو فتح مکہ کے سفر میں عصر کے وقت روزہ افطار کر لیا تھا، کیونکہ صحابہ کا نقاہت کے مارے

[1] صحیح البخاري، حدیث: 655.

برا حال تھا۔ مشورہ دیا گیا: کل ہم مکہ میں داخل ہوں گے، ہوسکتا ہے مشرکین سے مقابلہ ہو جائے، رمضان کے روزے نے ان کو کمزور کر دیا، کیوں نہ افطار کر لیا جائے۔ کچھ کھا پی لیں کہ طاقت بحال ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے عصر کے وقت اجازت دے دی کہ روزہ ابھی افطار کر لو، کھاؤ اور پیو، تمھیں مکمل روزے کا ثواب دے دوں گا۔ صحابہ اس پر خوش ہوئے۔ افطار کر لیا۔ کھانے پینے لگے مگر بعض صحابہ نے کہا: ہم تو وقت پر افطار کریں گے تا کہ زیادہ ثواب ملے۔ یہ صحابہ کسی فرقے کی پیداوار نہیں تھے۔ یہ عمل انھوں نے کسی فرقے کی اتباع میں نہیں کیا، بلکہ یہ عمل انھوں نے اس بنا پر کیا کہ ہمیں زیادہ اجر ملے۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کو اطلاع مل گئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «أُولَئِكَ الْعُصَاةُ، أُولَئِكَ الْعُصَاةُ» دو بار فرمایا کہ جو لوگ اب تک روزے سے ہیں وہ سب کے سب نافرمان ہیں، نافرمان ہیں۔ [1] حالانکہ وہ روزے سے ہیں اور اس مشقت پر اجر کے متمنی ہیں، لیکن نہیں۔ مشقت کا دائرہ بھی شریعت محدود کرتی ہے اور اس کا تعین بھی اللہ کے پیغمبر کا دین کرتا ہے۔ اب حقیقتِ اتباع اہل الحدیث کی دعوت سے پہچاننے کی کوشش کرو۔ ﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي﴾ ”کہہ دیجیے! اگر اللہ کی محبت کے طلب گار ہو تو میری اتباع کرو۔“ [2] وہ اتباع کیا ہے؟ اتباع خودساختہ مناہج پر قائم نہیں ہے بلکہ اتباع ایک ایسا معاملہ ہے جو پورے کا پورا اللہ کے پیغمبر کے دین اور آپ کی پیروی میں رنگا ہوا ہے۔ اس میں عمل اور جزئیاتِ عمل اور زمانۂ عمل اور مکانِ عمل، کیفیتِ عمل، سببِ عمل، جنسِ عمل، مشقتِ عمل، حکمتِ عمل یہ ساری کی ساری چیزیں اللہ کے پیغمبر کے دین سے ثابت ہونا ضروری ہیں۔ اگر کوئی چیز ثابت نہ ہوسکی تو وہ عمل اللہ کے پیغمبر کی

[1] صحیح مسلم، حدیث: 1114. [2] آل عمران 31:3.

اتباع میں نہیں ہوسکتا۔ کھانا کھلانا یقیناً نیکی ہے۔ اس کو اگر مقرون کرو ایک سبب کے ساتھ۔ کوئی فوت ہوگیا، رسمِ سوئم ہے، کھانے پکیں گے، تو کھانا کھلانا نیکی ہے۔ مگر وہ سبب اللہ کے پیغمبر سے ثابت نہیں ہے۔ قرآن پڑھنا ایک نیکی ہے مگر قرآن خوانی کو مقرون کیا جائے تیجے کے ساتھ، دسویں اور چالیسویں کے ساتھ۔ یہ ایسے اسباب ہیں جو پیارے پیغمبر سے ثابت نہیں ہیں۔ تو خالی عمل کو نہیں دیکھا جائے گا۔ عمل کے سبب کو، عمل کی کیفیت کو، عمل کی جنس کو، عمل کے زمان کو، عمل کے مکان کو، عمل کی مشقت کو، عمل کی حکمت کو، یہ تمام کی تمام چیزیں محدود ہیں شریعت کے دائرے میں اور پیغمبر علیہ السلام کی سنت میں، تب ہی اتباع کا معنی مکمل ہوگا۔ اور یہ دعوتِ اہل حدیث ہے۔ اس طریقے سے اگر پیغمبر علیہ السلام کی اتباع قائم ہوجائے تو اس ملک میں، اس قوم میں، اللہ کی برکتیں اور رحمتیں نچھاور ہوں گی اور امن ملے گا، رزق کی فراوانی ہوگی، نعمتیں حاصل ہوں گی اور اس کے بعد آخرت کی کامیابی، جنت کے وعدے یقینی ہیں کیونکہ اللہ کے پیغمبر کا فرمان ہے: میری پوری امت جنتی ہے، سوائے اس کے جو انکار کردے۔ صحابہ نے پوچھا: انکار بھلا کون کرسکتا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:
”جو میری اطاعت کرے گا، میری اتباع کرے گا حقیقتِ اتباع کے ساتھ، وہ میرے ساتھ جنت میں جائے گا اور جو شخص میری اتباع نہیں کرے گا، کسی وجہ سے اس کی اتباع کا معنی پورا نہ ہوسکا تو وہ شخص جنت میں جانے کا انکار کربیٹھا۔ اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔“[1] تو حقیقتِ اتباع کو پہچانیے! اللہ پاک ہم کو توفیق عطا فرمادے، ہم اللہ کے پیغمبر کے سچے متبع فرماں ہوجائیں اور حقیقتِ اتباع کے ان تمام معانی کے ساتھ، ان تمام

[1] صحيح البخاري، حديث: 7280.

حقائق کے ساتھ تاکہ ہمارا ہر عمل پیارے پیغمبر کی اتباع میں شمار کیا جائے اور وہی عمل اللہ کے ہاں قابلِ قبول ہے اور کوئی چیز اگر پیچھے رہ گئی، اتباع کے دائرے سے باہر نکل گئی تو وہ مردود ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَّيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ»[1] جو شخص کوئی ایسا عمل کرے جس عمل کی کوئی وجہ ہماری شریعت کے خلاف ہے، ہمارے عمل کے خلاف ہے تو وہ مردود ہے، اس پر کوئی اجر نہیں اور کوئی ثواب نہیں۔ اللہ پاک اس حقیقت کا فہم عطا فرمادے! عمل کی توفیق دے دے! (آمین)

وَأَقُولُ قَوْلِي هٰذَا وَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِي وَلَكُمْ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ.

[1] صحيح مسلم، حديث: 1718.

آزادی کی نعمت اور اس کے تقاضے

آزادی کی نعمت اور اس کے تقاضے

خطبہ مسنونہ:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ﴾

"اے لوگو! تم ان چیزوں میں سے کھاؤ جو زمین میں حلال اور پاکیزہ ہیں اور شیطان کے قدموں کی مت پیروی کرو، بے شک وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔"[1]

آج کے دن کی ہمارے لیے اہمیت یہ ہے کہ آج کے دن ہمیں آزادی کی نعمت حاصل ہوئی۔ اللہ کے فضل و کرم سے یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ رب العزت نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف مبعوث فرمایا دو مقاصد کے تحت۔ ایک مقصد بیانِ توحید جو ہر نبی کی بعثت کا مقصد ہوتا ہے اور دوسرا مقصد بنی اسرائیل کی آزادی۔ فرعون نے برے طریقے سے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو مخاطب کر کے کہا تھا:

﴿أَنْ عَبَّدتَّ بَنِي إِسْرَاءِيلَ﴾[2]

[1] البقرة 2:168. [2] الشعرآء 26:22.

تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے۔

اپنی قوم کو غلامی کی اس دلدل سے نکالنا موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے مقاصد میں سے تھا جو بالآخر حاصل ہوا۔ فرعون اور آل فرعون غرق ہوئے۔ جو شخص بھی طاقت کے نشے میں دھت ہوتا ہے، سنت الٰہی ہے کہ وہ اپنے ہیبت ناک انجام تک پہنچ جاتا ہے۔ بالآخر فرعون بھی غرق ہوا اور اپنے انجام کو پہنچا۔ اور بنی اسرائیل کو فرعون کے چنگل سے آزادی نصیب ہوگئی۔ جب رسول اکرم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے، وہاں یہودیوں کو دیکھا کہ وہ محرم کی دس تاریخ کو روزہ رکھتے ہیں۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ یہ روزہ کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: «وَهُوَ يَوْمٌ نَجَّى اللّٰهُ فِيهِ مُوسَى وَأَغْرَقَ آلَ فِرْعَوْنَ» [1] آج کے دن اللہ رب العزت نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو نجات دی، آزادی کی نعمت سے سرفراز فرمایا۔ آج کے دن غلامی کی زنجیریں ٹوٹی تھیں۔ یہ دن ہماری آزادی کا دن ہے۔ اسی دن فرعون اور فرعون کی آل غرق ہوئی۔

اللہ رب العزت کا شکر ادا کرنے کے لیے یہودیوں کا یہ فعل ہے۔ حالانکہ «أَبْغَضُ خَلْقِ اللّٰهِ فِي الْأَرْضِ» اس زمین میں سب سے زیادہ مبغوض، نفرت کے قابل، حقیر قوم یہودی ہیں۔ ان کی سوچ کا اندازہ کیجیے کہ اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے اپنی آزادی کے دن وہ روزہ رکھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''موسیٰ تو ہمارا بھائی ہے۔'' «نَحْنُ أَحَقُّ بِمُوسَى مِنْكُمْ» [2] ہم تم سے زیادہ حق رکھتے ہیں موسیٰ علیہ السلام کا، ہمارا بھائی ہے۔ بھائی ہونے کا معنیٰ کیا ہے؟ ایک اور حدیث سے یہ بات واضح ہوتی

[1] صحيح البخاري، حديث:3397. [2] سنن ابن ماجه، حديث:1734.

ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «اَلْأَنْبِيَاءُ إِخْوَةٌ مِّنْ عَلَّاتٍ» [1] انبیاء آپس میں علاتی بھائی ہیں۔ سارے انبیاء آپس میں علاتی بھائی ہیں۔ «دِينُهُمْ وَاحِدٌ» ان کا دین ایک ہی ہے۔ علاتی بھائی وہ ہوتے ہیں جن کا باپ ایک اور مائیں مختلف ہوں۔ بھائیوں کی تین قسمیں ہیں: حقیقی بھائی جن کے ماں اور باپ ایک ہوں۔ علاتی بھائی جن کا باپ ایک اور مائیں مختلف ہوں۔ اور اخیافی بھائی جن کی ماں ایک ہو اور باپ مختلف ہوں۔ جیسے ایک عورت شادی کرلے، پھر بیوہ ہوجائے بعدازاں کسی اور مرد سے نکاح کرلے اور ہر شوہر سے اولاد ہو۔ یہ باپ مختلف ہیں لیکن ماں ایک ہے۔ یہ اخیافی بھائی کہلاتے ہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے انبیاء کو علاتی بھائی قرار دیا۔ جن کا اصل ایک ہے، باپ ایک ہے۔ اور یہاں اصل سے مراد توحید ہے۔ سارے انبیاء کا عقیدۂ توحید ایک ہے۔ تو ان کی بعثت کا مقصد بھی توحید کو بیان کرنا ہے۔

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ﴾ [2]

ہم نے ہر قوم میں رسول بھیجے۔ اس دعوت کے ساتھ کہ ایک اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کا انکار کرو۔

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ﴾ [3]

ہم نے آپ سے پہلے جتنے رسول بھیجے، ان کی طرف وحی کی کہ میرے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے، میری ہی عبادت کرو۔''

اور میری ہی عبادت کی دعوت دو۔ اپنی قوموں کو، ملتوں کو میری عبادت کی طرف اور

[1] صحيح مسلم، حديث:2365. [2] النحل 36:16. [3] الأنبياء 25:21.

میری توحید کی طرف بلاؤ۔ یہ سارے انبیاء کا اصل ہے۔ اس لحاظ سے انبیاء آپس میں علاتی بھائی ہیں۔ تو نبی پاک ﷺ نے فرمایا: موسیٰ ہمارا بھائی ہے باعتبارِ عقیدے کے، باعتبارِ منہج کے۔ قوم یہود تو اپنے عقیدے سے بغاوت کر چکی ہے۔ انحراف اور الحاد کا راستہ اختیار کر چکی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی وفات سے قبل یہ بددعا کی تھی:

«لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَاءِهِمْ مَسَاجِدَ» [1]

اللہ رب العزت یہودیوں پر، عیسائیوں پر لعنتیں برسائے کہ جنھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں پر مسجدیں بنالیں، عمارتیں بنالیں، قبے بنالیے۔

وہ وہاں سجدہ اللہ کو کرتے ہیں، عبادت اللہ کی کرتے ہیں لیکن قبروں پر قبے بنانا اور عمارتیں تعمیر کرنا یہ بھی شرک اور الحاد ہے۔ جس پر رسول اللہ ﷺ نے یہود و نصاریٰ پر لعنت کی بددعا فرمائی۔ پیغمبر علیہ السلام کا یہ فرمان بھی ہے: «لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ» تم لوگ سابقہ قوموں کی ہو بہو پیروی کروگے۔ خیر وشر میں انھوں نے جس راستے کا انتخاب کیا تم بھی کروگے۔ جیسے ایک جوتا دوسرے جوتے کے بالکل تابع ہوتا ہے رنگ میں، ڈیزائن میں، سائز میں کچھ فرق نہیں ہوتا، اسی طرح تم بھی یہود و نصاریٰ کے مشابہ بن جاؤ گے اور کوئی فرق نہیں ہوگا۔ «حَتّٰى لَوْ دَخَلُوا جُحْرَ ضَبٍّ تَبِعْتُمُوهُمْ» [2] حتی کہ اگر کوئی شخص ان میں سے سانڈے کے بل میں داخل ہوا ہو جو ایک جانور ہے تو تم بھی داخل ہوگے۔ حتی کہ اگر کسی یہودی یا عیسائی نے اپنی والدہ سے نکاح کرلیا ہو تو تم بھی کروگے۔ [3] اس قدر مشابہت ہوگی۔ تو یہود و نصاریٰ کا ایک

[1] صحيح البخاري، حديث: 1390. [2] صحيح البخاري، حديث: 7320. [3] جامع الترمذي، حديث: 2641.

فعل تھا نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنانا، ان پر قبے تعمیر کرنا، عمارتیں بنانا۔ تو آج یہاں ان کی ترجمانی کون کر رہا ہے؟ ان کا تشبہ کس نے اختیار کیا ہوا ہے؟ پیغمبر علیہ السلام کا فرمان بالکل حق ہے کہ تم ان کی ہو بہو پیروی کروگے۔ اس کے مظاہر دکھائی دیتے ہیں۔

یہ ایک قوم کی آزادی تھی۔ اس کے حصول کے لیے اللہ رب العزت نے باقاعدہ اپنے پیغمبر کو بھیجا اور بعد میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور قائم رہا۔ گویا آزادی ایک نعمت ہے جو اللہ کے فضل سے ہمیں حاصل ہوئی۔ اور ہمارا ملک اس لحاظ سے متمیز اور ممتاز ہے کہ اس کی آزادی میں ایک نظریہ شامل ہے اسلام، توحید اور لا الہ الا اللہ کا۔ یہ ایک نظریاتی مملکت ہے۔ اس کی اساس میں توحید ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آزادی کے فوراً بعد ہی سے کوئی ایسی قیادت حاصل نہیں ہوئی جو قیادت کا حق ادا کر سکے۔ اس آیت کریمہ کی ترجمانی کر سکے۔

﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ [1]

اپنے بندوں کو جب ہم زمین پر حکومت دیتے ہیں تو وہ نمازوں کا نظام قائم کرتے ہیں۔ زکاۃ کا نظام قائم کرتے ہیں۔ نیکیوں کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں کو مٹاتے ہیں۔

یہ چار بنیادی عناصر ہیں کسی بھی حکومت کی تشکیل کے لیے۔ ایسی کوئی قیادت میسر نہ آسکی جو تاسیس مملکت کے ان بنیادی عناصر کو پورا کرتی۔ بلکہ پورا کرنا تو دور کی بات ہے یہاں تو ان عناصر کا فہم بھی موجود نہیں ہے۔ اور یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ جو

[1] الحج 22:41.

اس مملکت کی تاسیس کا ایک نظریہ تھا وہ آج تک پورا نہ ہو سکا۔ بلکہ جو قیادت آ رہی ہے روز افزوں اس نظریے سے انتہائی دور اور اسے اس کا فہم و ادراک تک حاصل نہیں بلکہ اس کی سوچ تک میسر نہیں ہے۔ یوں ہمیں آزادی جسم کی حد تک مل گئی لیکن عقل، روح، قلوب اور اذہان کی آزادی میسر نہ آسکی۔ اگر ہم غور کریں تو ہمارا نظام تعلیم، ہمارا قانون، ہماری عدالتیں، ہماری سیاست سب کی سب باہر سے مستعار لی گئی ہیں۔ ہمارے پاس قرآن و حدیث کی دولت موجود ہے۔ قرآن و حدیث نے پورا نظام پیش کیا ہے سیاست کا بھی، عدل کا بھی، تعلیم کا بھی۔ ہر چیز یہاں موجود ہے لیکن ان تمام چیزوں سے انحراف کیا گیا اور وہ نظریہ جو اس ملک کی تاسیس میں کارفرما تھا، اس سے سراسر بغاوت کی گئی۔ نتیجہ یہ ہے کہ اللہ رب العزت کی طرف سے جو اس کی نعمتیں حاصل ہونے کے اسباب ہیں، وہ ناپید ہو چکے ہیں۔ اللہ رب العزت اپنی نعمتیں اور اپنا فضل عطا فرماتا ہے لیکن کچھ اسباب کے ساتھ: «اِحْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ» [1] تم اللہ کے دین کی، اس کی حدود کی، اس کی توحید کی حفاظت کرو، اس کے پروٹوکول کی حفاظت کرو، اللہ رب العزت تمھاری حفاظت کرے گا۔ یہ تقسیم شروع سے قائم ہے۔ آسمان والا زمین والوں پر اپنا فضل نازل فرماتا ہے بشرطیکہ زمین والے آسمان والے کا حق ادا کریں، اس کی عبادت کا، اس کی اطاعت کا اور اس کے دین کے فہم اور تنفیذ کا۔ تو یقیناً اللہ کا فضل حاصل ہوگا۔ آج چونکہ ہم نے آسمان والے کے نظام سے ایک طرح سے بغاوت اختیار کر رکھی ہے۔ اور یہاں ہر چیز امپورٹڈ ہے۔ سیاست بھی فرنگی، قانون بھی فرنگی اور تعلیم بھی فرنگی تو پھر اللہ رب العزت کا فضل، اس کا احسان ہمیں کیسے حاصل

[1] جامع الترمذي، حديث: 2516.

ہو سکتا ہے؟ اس طرح نظریے سے ہم سراسر انحراف اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اور رجوع الی الحق کی کوئی شکل دکھائی نہیں دیتی۔ وجہ یہی ہے شریعت کا ایک اصل ہمارے سامنے موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے:

«إِنَّ الْخَيْرَ لَا يَأْتِي بِالشَّرِّ» [1]

”خیر کبھی شر کے راستے سے نہیں آسکتی۔“

شر جو ہے وہ خیر کو نہیں لاتا۔ شر، شر ہی کو لاتا ہے۔ ہم نے اپنی قیادت کا چناؤ جس راستے سے کیا وہ شر ہے۔ جمہوریت شر ہے۔ یہ فتنہ ہے۔ یہ قطعاً اسلام کا راستہ نہیں ہے۔ دین کا راستہ نہیں ہے۔ اس راستے میں اسلام سے بغاوت ہے۔ توحید سے بغاوت ہے۔ اسلامی اصولوں سے بغاوت ہے۔ اکثریت کی حکومت یہ کوئی قاعدہ نہیں ہے۔ یہ انسانوں کی اختراع ہے۔ یہ خالق کائنات کا قانون نہیں ہے۔ خالق کائنات کے قانون میں اللہ رب العزت کی حاکمیت ہے، اکثریت کی نہیں ہے۔ اکثریت ایک بت ہے جس کو پاش پاش ہونا چاہیے۔ اکثریت کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے:

«اَلنَّاسُ كَإِبِلٍ مِائَةٍ لَا يَجِدُ الرَّجُلُ فِيهَا رَاحِلَةً» [2]

لوگوں کی اکثریت کی مثال اس شخص کی سی ہے جو سو اونٹ پالتا ہے۔ کھلاتا ہے، پلاتا ہے۔ بظاہر اونٹ تو بہت ہیں مگر ان میں سواری کے قابل کوئی نہ ہو۔ اس کے کام آنے والا کوئی اونٹ نہ ہو۔ پھر سو کی تعداد کا کوئی فائدہ نہیں۔ تعداد بہت بڑی ہے۔ ایک بڑا سرمایہ ہے یہ، لیکن وقت آنے پر کوئی کام نہ آئے۔ فرمایا کہ

[1] مسند أحمد: 21/3. [2] صحيح مسلم، حديث: 2547.

یہ مثال ہے لوگوں کی کثرت کی۔ اکثریت کی کبھی تعریف نہیں کی گئی: ﴿ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ○ ﴾[1] اکثریت کا مزاج ایسا ہے کہ ہر دور میں لوگوں کی اکثریت حق کو ناپسند کرنے والوں کی ہے۔ ﴿ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ○ ﴾[2] اکثریت کا مزاج ایسا ہے کہ اکثر لوگ بے عقل ہیں، بے وقوف ہیں، جبکہ اس کے مقابلے میں جو اقلیت ہوتی ہے، اس کی تعریف ہے، مدح ہے، حوصلہ افزائی ہے: ﴿ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ○ ﴾[3] میرے بہت تھوڑے بندے شکر گزار ہیں۔ ﴿ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ ﴾[4] مومن تھوڑے ہوتے ہیں، فاسق زیادہ ہوتے ہیں۔ تو جن عناصر پر جمہوریت کا نظام قائم ہوتا ہے وہ سارے عناصر خلاف شریعت ہیں۔ تو اس راستے سے جو قیادت منتخب ہوتی ہے بھلا اس سے خیر کی کیا توقع ہوسکتی ہے؟ کوئی توقع نہیں۔

نتیجہ یہ کہ وہی نظام ہم پر قائم ہے جو پاکستان کے قیام سے قبل تھا اور وہی قانون اور دستور ہے جو پاکستان کے قیام سے قبل تھا۔ اور عدالتیں اسی دستور کی روشنی میں فیصلے کرتی ہیں۔ نام کی ایک اسلامی کونسل اگرچہ بنی ہوئی ہے مگر یہ المیہ ہے کہ اس کے فیصلے بھی اسی انگریز کی عدالت پر پیش ہوتے ہیں، پھر ان کی تائید اور موافقت سے ان کی تنفیذ ہوتی ہے۔ اگر موافقت نہ کریں تو ان کی تنفیذ نہیں ہوتی۔ یہ سب کا سب بغاوت ہے اسلامی قوانین سے، اللہ رب العزت کی حکومت سے اور اس کے احکام اور فرامین سے۔ پھر یہ آزادی ابدان کو حاصل ہوئی ہے اور وہ بھی ایک بے معنی آزادی۔

آپ دیکھیں آج رات جو کچھ ہورہا ہے۔ مردوزن کا اختلاط، موسیقی کی محافل، بارہ بجتے ہی دھماکوں کی آوازیں اور ایک شور۔ اور اس وقت بہت سے ایسے بندے ہیں،

[1] المؤمنون 70:23. [2] المآئدۃ 103:5. [3] سبا 13:34. [4] آل عمرٰن 110:3.

خاص طور پر نوجوان جنھیں شاید بھول گیا کہ آج جمعہ کا دن ہے، اس کی اہمیت کیا ہے! گراؤنڈ اور میدان بھرے پڑے ہیں۔ آزادی کے نام سے مقابلے ہورہے ہیں۔ میچ ہو رہے ہیں، مگر جمعہ کا اہتمام نہیں ہے۔ تو پھر کیا یہ قوم، جو اللہ رب العزت کے قوانین سے بغاوت کرے اور اس کے احکام کو پس پشت ڈال دے، آزادی کی مستحق ہے؟ تو یقیناً یہ ایک بڑا انحراف اور الحاد ہے۔ میں نے عرض کیا کہ گئی گزری قوم یہود اپنی آزادی کے دن اظہار شکر کے لیے روزہ رکھتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ یہ نعمت اسی امر کی مستحق ہے کہ ہم روزہ رکھیں۔ اور یہاں سراسر اور کھلم کھلا بغاوت کا ایک اصول کارفرما ہے جو اللہ رب العزت کے عذاب اور اس کی ناراضی کو بہت زیادہ دعوت دینے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو نعمت سے سرفراز فرمائے اور وہ قوم اس نعمت کے اسباب و مقاصد کو فراموش کردے تو اللہ رب العزت نعمتیں چھین لیتا ہے۔ اس کا قانون اٹل ہے۔ بنی اسرائیل ہی کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ ﴿ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ○ ﴾[1] بنی اسرائیل کو پورے جہاں پر فوقیت دی گئی، برتری اور فضیلت دی گئی۔ ان کے لیے یہ ایک اعزاز تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اس نعمت کا حق ادا کرتے۔ اللہ کا شکر ادا کرتے۔ ایسا نہ ہوسکا۔ انھوں نے قدم قدم پر اللہ کی بغاوت کی۔ موسیٰ علیہ السلام سے معاندانہ رویہ تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس اعزاز کو چھین لیا۔ اب یہ اعزاز امت محمدیہ کو حاصل ہے۔ ﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ ﴾[2] تم سب سے بہترین امت ہو۔

لیکن اللہ رب العزت کے اصول ہیں، قوانین ہیں۔ ان کی پاسداری ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کی محبت سے مجبور نہیں۔ وہ ذات مجبور نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ سمجھا جائے کہ

[1] البقرۃ 47:2. [2] آل عمرٰن 110:3.

ہم امت محمدیہ ہیں اور ہم سے محبت کرنا اللہ کی مجبوری ہے۔نعوذ باللہ، ہرگز نہیں۔ اس کے قوانین ہیں، اس کا نظام ہے۔ اس کی پاسداری کرنے والا اس کا مقرب ہے۔ اور اس کے نظام سے بغاوت کرنے والا، اس کے فضل واحسان سے دور ہو جاتا ہے۔ ان قواعد اور قوانین کا احترام ضروری ہے۔ اور یہی دن جو بار بار آتا ہے ہمیں اس نعمت کی قدر و قیمت یاد دلاتا ہے ۔ تو چاہیے کہ ہم اللہ کی طرف رجوع اختیار کریں، اس کے دین کی طرف، اس کے احکام اور شریعت کی طرف اور اس کی سچی توحید اس ملک میں نافذ ہو اور یہاں اس کے پیارے پیغمبر محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت کی حاکمیت کی تنفیذ ہو۔ اس عزم کا اظہار ہو، اور اس کے لیے جدوجہد ہو۔ پھر یقیناً یہ اللہ کی رضا کی علامت ہوگا۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ کے نظام سے مسلسل بغاوت اختیار کیے رہے جیسا کہ آہستہ آہستہ فتنے اور خسارے اور نقصانات ہم پر قائم اور مسلط ہیں تو ایک وقت آسکتا ہے کہ اللہ رب العزت ہمیں کسی بھیانک عذاب میں مبتلا کردے اور ایک ایسی آزمائش ہم پر نافذ ہو جائے جس کا مقابلہ کرنے کی ہم میں ہمت نہ ہو۔

لیکن تاریکی کے اس دور میں ہم اہل الحدیث کا کردار بڑا واضح اور متعین ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کے پیغمبر کی سنت کے سب سے زیادہ قریب ہم لوگ ہیں۔ ہمیں اس کا فہم ہونا چاہیے، اس کی اہمیت کا ادراک اور احساس ہونا چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم نعمت توحید سے خوب مالا مال ہوں اور اللہ کے پیارے پیغمبر کی سنت اپنے اوپر نافذ کریں۔ اور اس کے بعد جو اہم ذمہ داری ہے، وہ یہ ہے کہ ہم اس توحید اور پیارے پیغمبر کی سنت کے داعی بنیں۔ یہ دعوت ہم ہی نے دینی ہے۔ جس کے منہج میں شرک ہو وہ توحید کا داعی نہیں بن سکتا۔ جس کے منہج میں بدعت ہو وہ پیارے پیغمبر کی

سنت کی دعوت نہیں دے سکتا۔ یہ اسی کا کردار ہے جو نعمتِ توحید سے مالا مال ہو اور شرک سے بیزار ہو۔ یہ اسی کا کردار ہے جو اللہ کے پیارے پیغمبر کی سنت کی نعمت سے مالا مال ہو اور بدعت سے بیزار ہو۔ تو یہ ہمارا کردار ہے۔ توحید و سنت کی نعمت اللہ نے ہمیں عطا فرمائی ہے۔ یہ ایک طرح سے ہماری کرامت ہے۔ اس گئے گزرے دور میں جہاں شرک و بدعت کی تاریکیاں ہیں اور ہمارے پاس نورِ توحید اور نورِ سنت نبوی ہے۔ یہ اللہ کی نعمت ہے، اس کا ہم حق ادا کریں، اس کا صحیح معنی میں فہم ہو، اپنے اوپر تنفیذ ہو۔ دعوت کے لیے ضروری نہیں ہے کہ باقاعدہ اسٹیج کا اہتمام ہو اور باقاعدہ جلسوں اور جلوسوں کی سیاست ہو۔ نہیں جو بھی ملنے جلنے والے ہوں ان تک پیغام پہنچایا جائے۔ ایک سے دو تک اور دو سے دس تک یہ بات اسی طرح پہنچتی ہے۔ دعوتِ دین کا کام بڑا دھیمہ ہے۔ بڑا باوقار ہے۔ لوگوں نے دعوت دین کو مختلف مفروضوں کے تحت بہت زیادہ شریعت سے دور کر دیا ہے۔ جس قدر یہ فریضہ مقدس ہے اسی قدر لوگوں نے اس فریضے میں بہت سی غلط باتیں شامل کر دی ہیں۔ کوئی یہ سمجھا کہ دعوت جلسوں اور جلوسوں کی رہین منت ہے۔ جس میں بے تکے نعرے ہوں، اچھل کود ہو، حالانکہ ہرگز نہیں۔ ایسا دین کا مزاج نہیں ہے۔ اور یہ دین کے وقار کے منافی ہے۔ ایک جماعت یہ سمجھتی ہے کہ دعوت کا طریقہ یہ ہے کہ گھر گھر جایا جائے، دستک دی جائے اور گھر والوں کو باہر نکالا جائے اور ان سے کہا جائے: کلمہ پڑھو اور ان کو دعوت دی جائے۔ اس فکر کے حامل بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں کسی کو دعوت دینے کے لیے ان کے پاؤں دبانا پڑیں تو ہم پاؤں تک دبائیں گے۔ نہیں ہماری دعوت اتنی ذلیل نہیں جتنا آپ نے کردیا۔ دعوت میں وقار ہے، عزت ہے۔ گھر گھر جانا اللہ کے

پیغمبر کے منہج میں شامل نہیں ہے، ثابت نہیں ہے۔ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام نے یہ دعوت گھر گھر جا کر نہیں دی۔ ہاں، آپ نے لوگوں کو جمع کیا، اکٹھا کیا اور ان کو دعوت دی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مختلف علاقوں میں جماعتیں جائیں۔ جماعتوں کا جانا اور بھیجنا اللہ کے پیغمبر کا منہج نہیں ہے۔ اللہ کے پیغمبر باوقار داعی بھیجا کرتے تھے۔ ایک داعی، دو داعی اور وہ جا کر دعوت دیا کرتے تھے۔ جماعتوں کا جانا اور جا کر کسی علاقے میں دو تین دن، چار دن قیام کرنا، اپنا پکانا، اپنا کھانا یہ کون سا دین اور کون سا منہج ہے؟ نبی علیہ الصلوۃ والسلام سے یہ بات ثابت نہیں ہے۔ ہرگز نہیں! آپ نے یمن، جو کہ سارا علاقہ اہل کتاب کا تھا، ایک داعی بھیجا، حالانکہ کفار کا علاقہ تھا، ایک وسیع مملکت تھی۔ وہاں جماعت کو بھیجنا چاہیے تھا لیکن دعوت توحید دے کر ایک ہی داعی بھیجا۔ اس کو دعوت کے اصول سمجھائے۔ طرق سمجھائے، صرف ایک ہی داعی پوری قوم کی طرف دعوت لے کر گیا۔ اللہ کی سنت بھی یہی ہے۔ معاشرہ جیسا بھی تاریک ہو اور قومیں جیسی بھی ظالم ہوں، اللہ ان قوموں کو سمجھانے کے لیے ایک ہی نبی بھیجتا ہے۔ ایک ہی داعی بھیجتا ہے۔ کسی قوم، کسی علاقے اور خطے میں انبیاء کی جماعت نہیں گئی۔ ایک ہی نبی گیا ہے۔ یہی دعوت کا وقار ہے اور یہی دعوت کا منصب ہے۔ تو لوگوں نے اپنے اپنے مفروضوں کے تحت اس دعوت کو اپنے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ہم اہل الحدیث ان سارے سانچوں سے بیزار ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی اس دعوت کے تعلق سے انھی طرق کو اپنائیں جو طرق اللہ کے پیارے پیغمبر نے اپنائے۔ جو طرق اللہ کے انبیاء نے اپنائے اور ہمارے سامنے بالکل واضح اور کھلی کتاب کی مانند ہیں۔ اور یہی ایک بچاؤ کا راستہ ہے کہ اس سچے دین کو ہم سمجھیں، اپنے اوپر اس کی تنفیذ کریں اور پھر آگے اپنی

مملکت میں، جس کو ہم نے ایک خاص نظریے کے تحت حاصل کیا، اس مملکت میں اس کو نافذ کرنے کی کوشش کریں۔

اور یہ یوم آزادی اس تجدید کا دن ہے کہ ہم ایک عزم کے ساتھ اس فکر پر قائم ہو جائیں کہ سچی توحید کو اور اللہ کے پیارے پیغمبر کی سنت کو اپنے اوپر نافذ کرنا ہے۔ جس کے لیے ہمارے بزرگوں نے قربانیاں دیں، اپنے آباء و اجداد کے مسکن کو چھوڑ دیا، اپنے کاروبار چھوڑ دیے، اپنے گھربار چھوڑ دیے۔ ہجرت اختیار کر لی۔ ہجرت کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ تاکہ اپنے خطے میں پہنچ کر آزادانہ طریقے سے اللہ کی عبادت کریں۔ یہ مقصد تو نہیں ہے کہ آزاد ہو کر ہم دھماکے کریں، آزاد ہو کر ہم فائرنگ کریں۔ آزاد ہو کر ہم رقص و سرود کی محفلیں اٹینڈ کریں اور آزاد ہو کر ہم شیطانی اعمال کو دعوت دیں جیسا کہ رات سے جاری ہے۔ ایک عجیب اختلاط، ایک عجیب بدتمیزی کا طوفان برپا ہے۔ کیا یہ آزادی کے تقاضے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ یہ تو اللہ کی ناراضی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ تو ہمیں چاہیے کہ ہم صحیح دین کو سمجھیں، اپنے اوپر اس کی تنفیذ کریں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی مملکت میں جس کے حصول میں نظریہ کارفرما ہے کہ یہاں اسلام نافذ ہوگا، اللہ کا دین آئے گا اور یہاں سے کفر والحاد رخصت ہوگا، اس نظریے کی تکمیل کی جدوجہد کریں۔ اور یہ عین عبادت ہے۔ اس پیغام کو آگے پہنچایا جائے۔ اور اس کے نشر و اشاعت کی کوشش ہو، یہ اللہ کی رضا کا راستہ ہے اور اس مملکت کے بقا کی ایک صورت ہے۔ ورنہ ہماری حرکتوں سے ہمارا ایک بازو ہم سے کٹ چکا ہے۔ پاکستان اس وقت مکمل نہیں ہے، ناقص ہے۔ جس مکمل پاکستان کو لا الہ الا اللہ کے نام پر حاصل کیا گیا، ہماری نالائقیوں کی بنا پر وہ آدھا کٹ چکا ہے۔ اور باقی آدھا بہت

سے فتنوں کی زد میں ہے اور اس کو بہت سی یلغاریں اپنی لپیٹ میں لے چکی ہیں۔ اور ہم ہوش کے ناخن نہیں لیتے اور بیدار ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس کا راستہ صرف اللہ کی طرف رجوع کرنے اور سچے دین کو اختیار کرنے کا ہے۔ سچا دین، رجوع الی اللہ، توحید خالص اور اللہ کے پیغمبر کی سنت بچاؤ کا راستہ ہے اور اس مملکت کے بقا کی بنیاد ہے۔ اگر اس سے بغاوت ہوگئی تو پھر جیسے ہمارا آدھا ملک کٹ چکا، اللہ نہ کرے باقی کے پیچھے بھی لوگ پڑے ہوئے ہیں۔ اس کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ خارجی اور داخلی سازشیں بالکل ہم قدم ہوچکی ہیں اور باہمی طاقت کے ساتھ حملہ آور ہیں اور ہمیں قطعاً کوئی ہوش نہیں ہے۔ ہم ذاتی مفادات میں الجھے ہوئے ہیں تو یہ چیز انتہائی خطرناک اور نقصان دہ ہوتی ہے۔ قومیں کیسے تباہ ہوتی ہیں؟ ہمیں ان امور کا اندازہ ہونا چاہیے۔ اور قوموں کی بقا کے راستے کیا ہیں؟ ان امور کا ہمیں اندازہ ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ بقا عطا فرماتا ہے، کب؟ جب اللہ رب العزت کی توحید کے ساتھ وفاداری ہو اور اس کے نظام کے ساتھ وفاداری ہو۔ اگر بغاوت ہوگی تو اللہ ہم سے ناراض ہوگا اور اللہ کی ناراضی سارے خطرات ونقصانات کا پیش خیمہ ہوسکتی ہے، جبکہ اللہ کی محبت ہماری بقا ہے۔ «اِحْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ» اللہ کے دین کی حفاظت کرو، اللہ تمھاری حفاظت کرے گا۔ «اِحْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ» [1] اللہ کے دین کی حفاظت کرو، ہمیشہ اللہ کو اپنے سامنے پاؤ گے۔ ہمیشہ اللہ رب العزت تمھاری حفاظت کرے گا۔ تو یہ تقسیم روز اول سے قائم اور جاری ہے کہ آسمان کی طرف سے رحمت اور فضل کی بارش ہوسکتی ہے، اگر زمین والے آسمان والے کے نظام کو اپنالیں۔ پوری طرح

[1] جامع الترمذي، حديث: 2516.

وفاداری اختیار کرلیں اور اگر بغاوت ہوگی تو اللہ تعالیٰ بھی ناراض ہوجائے گا۔ تو یہ انتہائی نقصان دہ چیز ہوگی جس کے خطرات کے ہم متحمل نہیں ہوسکتے۔ قدم بقدم یہ خطرہ موجود ہے اور ہر دن گزرنے کے ساتھ بڑھتا جارہا ہے۔ تو ہمیں کیا کرنا ہے؟ سچی توبہ۔ ہمیں کیا کرنا ہے؟ رجوع الی الدین۔ ہمیں کیا کرنا ہے؟ رجوع الی التوحید۔ ہمیں کیا کرنا ہے؟ رجوع الی السنہ۔ اپنے اوپر ان کا صحیح فہم اور ادراک، اپنے اہل پر ان کی تنفیذ اور اس تنفیذ کی کوشش کو عام کرنا، ایک مربوط دعوت جو انبیاء کے اصولوں اور طرق پر قائم ہو، انبیاء کی بنیادوں پر قائم ہو، وہی چیز کامیابی کا پیش خیمہ ہے۔ یہ ان شاء اللہ فلاح و رشد اور کامیابی کا راستہ ہے۔ پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام نے پہلی دعوت میں اس نکتے کو آشکارا کردیا تھا: «قُولُوا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوا» اگر فلاح چاہتے ہو، کامیابی چاہتے ہو، ہمیشہ کی کامیابی بلکہ ہر وقت کی کامیابی، دنیا میں کامیابی، آخرت میں کامیابی، قبر میں کامیابی تو «قُولُوا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ» [1] اللہ کی توحید کو مان لو، اللہ کی توحید کا اقرار اور اعتراف کرلو، اللہ تمھیں کامیابی عطا فرمادے گا اگر کامیابی چاہتے ہو۔ تو کامیابی حاصل کرنے کا جو نسخہ کیمیا ہے، وہ اللہ کے پیارے پیغمبر نے بیان کر دیا۔ یہ نسخہ سعادت، یہ دولت، یہ خزانہ ہمارے پاس موجود ہے۔ پس بات اس کے فہم اور شعور کی ہے، ادراک کی ہے اور اس کی تنفیذ کی ہے۔ اور یہ فلاح اور کامیابی کا راستہ ہے۔ اس کے سوا جو بھی راستہ ہوگا، بربادی کا راستہ ہوگا۔ تباہی کا راستہ ہوگا۔ تو اللہ سے دعا بھی کی جائے اور سچی توبہ بھی کی جائے۔

اللہ اس وطن عزیز کی حفاظت فرمائے۔ اللہ اس ملک کو اسلام اور توحید کا گہوارہ بنادے۔

[1] مسند أحمد: 3/492.

اس ملک کا جو نظریہ ہے توحید اور اسلام، اللہ تعالیٰ اس نظریے کی حفاظت کی توفیق دے اور اسی نظریے کو جو اس کی تاسیس میں شامل تھا، اللہ اس کی تنفیذ کی توفیق عطا فرما دے۔ یہ مملکت توحید کی مملکت ہو۔ یہ مملکت اللہ کے پیارے پیغمبر کی سنت کی مملکت ہو۔ اللہ کے پیارے پیغمبر کی محبت کی مملکت ہو۔ عمل صالح کی مملکت ہو اور علم نافع کی مملکت ہو۔ یہاں صحیح بخاری پڑھی جائے، پڑھائی جائے اور اس کا عموم ہو اور اللہ کے پیغمبر کی سنت «قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰه» کی صدائیں گونجتی ہوں۔ اس طرح یہ مملکت استوار ہو۔ اللہ پاک توفیق عطا فرما دے۔ (آمین!)

وَأَقُولُ قَوْلِي هٰذَا وَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِي وَلَكُمْ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

مشکل حالات میں سنتِ رسول ﷺ کا اتباع

مشکل حالات میں سنتِ رسول ﷺ کا اتباع

خطبہ مسنونہ:

﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا یُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِیْتًا ۝ وَّاِذًا لَّاٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّاۤ اَجْرًا عَظِیْمًا ۝ وَّلَهَدَیْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا ۝﴾

”اور اگر واقعی وہ مان لیتے جس کی انھیں نصیحت کی جاتی ہے تو یہ ان کے لیے بہتر اور (دین میں) زیادہ ثابت قدمی کا باعث ہوتا۔ اور تب ہم ضرور انھیں اپنی طرف سے بہت بڑا اجر دیتے۔ اور ہم ضرور انھیں سیدھے راستے پر چلاتے۔“[1]

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَالَّذِیْنَ یُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِیْنَ ۝﴾

”اور جو لوگ کتاب کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور انھوں نے نماز قائم کی (انھیں ہم اجر دیں گے)، بے شک ہم نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔“[2]

[1] النسآء 4:66-68. [2] الأعراف 7:170.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ الْإِسْلَامَ بَدَأَ غَرِيبًا وَّسَيَعُودُ غَرِيبًا كَمَا بَدَأَ، فَطُوبَى لِلْغُرَبَاءِ»[1]

وَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «الْعِبَادَةُ فِي الْهَرْجِ كَالْهِجْرَةِ إِلَيَّ» أَوْكَمَا قَالَ ﷺ[2] قَالَ الْأَلْبَانِيُّ: صَحِيحٌ.

شیخ عائش صاحب حفظہ اللہ کا حکم ہے کہ اردو میں بات ہو۔ اور میں ان شاء اللہ کوشش کروں گا کہ جو نصوص آپ کے سامنے پڑھوں، وہ عربی میں پڑھوں تاکہ ہمارے عرب ساتھی وہ سنیں۔ اور اس طالب علم کی معروضات سے اللہ رب العزت مجھے اور ان سب کو مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

گفتگو کا موضوع آپ نے سنا کہ مشکل حالات میں سنت رسول ﷺ کا اتباع۔ رسول اللہ ﷺ کی پیروی قیامت تک کے لیے ہے کیونکہ رسول اکرم ﷺ اللہ کے آخری پیغمبر ہیں: «بُعِثْتُ بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ»[3] جو قیامت سے قبل بھیجے گئے اور جن کی نبوت کا سورج تا قیامِ قیامت طلوع رہے گا اور قائم رہے گا۔ رسول اکرم ﷺ کی اتباع فرض ہے اور نافرمانی ناجائز ہے۔

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ ۝﴾

”اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو برباد نہ کرو۔“[4]

جس کا واضح معنیٰ یہی ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اگر تمھارا عمل

[1] صحيح مسلم، حديث: 145، 146. [2] جامع الترمذي، حديث: 2201. [3] مسند أحمد: 2/50. [4] محمد 47:33.

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے دائرے میں ہوگا تو وہ اللہ کے ہاں قابل قبول ہوگا اور اگر تمھارا عمل، تمھارا قول، تمھارا عقیدہ یا منہج اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کے دائرے سے خارج ہوگا تو وہ مردود ہوگا۔ «مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ»[1] ہمارے اس دین میں آنے والی ہر نئی چیز مردود ہے۔ «لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ أَحْدَثَ فِي الْإِسْلَامِ حَدَثًا»[2] جس شخص نے اسلام میں کسی ایک بدعت کو جاری کردیا اس پر دن رات اللہ کی لعنتیں برستی ہیں۔ تو رسول اکرم ﷺ کی اتباع ہر حال میں فرض ہے۔ اس کا اصل صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی حدیث ہے۔ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اس کے راوی ہیں۔ فرماتے ہیں «بَايَعْنَا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي الْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ»[3] کہ ہم نے رسولِ اکرم ﷺ کے ہاتھ پر سمع و اطاعت کی بیعت کررکھی تھی۔ آپ کی بات سنیں گے اور اطاعت کریں گے۔ کن حالات میں؟ ہر حال میں۔ «فِي الْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ» آسانی ہو یا تنگی ہو۔ خوشی ہو یا غمی ہو۔ راحت ہو یا تعب ہو۔ کوئی بھی موقع ہو۔ ہر حال میں رسول اکرم ﷺ کی اطاعت کرتے رہنے پر ہم نے اللہ کے پیغمبر کے ہاتھ پر بیعت کی ہوئی ہے۔ علماء جانتے ہیں اس حدیث کا مفہوم اور وسیع ہوسکتا ہے۔ اس وقت چونکہ مقتدا، امت کے قائد محمد رسول اللہ ﷺ تھے، اس لیے میں نے یہ محدود ترجمہ کیا کہ سمع و اطاعت پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اللہ کے پیغمبر کے ہاتھ پر بیعت کی ہوئی تھی۔ ہر عسر و یسر میں، ہر تنگی اور آسانی میں، ہر خوشی اور غمی میں اللہ کے پیغمبر کی اطاعت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا۔ اور یہ اطاعت جس شخص

[1] صحيح مسلم، حديث: 1718. [2] مسند الربيع بن حبيب: 36/1، حديث: 42.
[3] صحيح البخاري، حديث: 7199.

کو یا جس خاندان کو یا جس قوم اور قبیلے کو حاصل ہو جائے وہ دنیا اور آخرت کی تمام سعادتوں سے مالا مال ہوجاتا ہے۔

﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ﴾ اگر یہ لوگ صرف وہ کام کریں جن کاموں کی انھیں اللہ کے پیغمبر نصیحت کرتے ہیں تو ان کے لیے خیر ہے۔ ہر قسم کی خیر ہے۔ خیر مطلق ہے۔ اللہ فرمارہا ہے کہ ہر قسم کی خیر ہے۔ کوئی شر نہیں ہوگا۔ ان کے لیے خیر ہی خیر ہے۔ ﴿وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا﴾ اور دشمن کے مقابلے میں ان کو ثابت قدمی، نصرت اور تائید عطا فرمائیں گے۔ ﴿وَاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ اجر عظیم عطا فرمادیں گے جو ان کی اخروی سعادت کی ضمانت ہوگا۔ اللہ رب العزت نے اس اجر کو عظیم کے ساتھ موقوف فرمایا۔ وہ چھوٹا اجر نہیں ہوگا، اجر عظیم ہوگا۔ وہ اللہ کے پیغمبر کی اطاعت کا ثمرہ ہے۔ اور ساتھ ساتھ ﴿وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا﴾ صراط مستقیم کی ہدایت پر قائم رکھیں گے۔ یہ ایک ضمانت اور ایک عظیم بشارت ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان گرامی ہے: «إِنَّ الْقُلُوبَ بَيْنَ إِصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ يُقَلِّبُهَا كَيْفَ يَشَاءُ»[1] تمام بندوں کے دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے بیچ میں رہتے ہیں۔ اللہ رب العزت ان دلوں کو جس طرف چاہے اور جب چاہے پھیردے۔ لیکن یہاں ضمانتیں دیں۔ اگر تم میرے پیغمبر کی اطاعت اور پیروی کرتے رہوگے تو صراط مستقیم پر قائم رہوگے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «تَرَكْتُ فِيكُمْ مَّا إِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ فَلَنْ تَضِلُّوا أَبَدًا كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ نَبِيِّهٖ»[2] تمھارے بیچ جو کچھ میں چھوڑے جارہا ہوں اگر تم اسے تھامے رہوگے دنیا کی

[1] الأربعين النووية: 22/1. [2] المستدرك للحاكم: 37/1.

کوئی طاقت، دنیا کی کوئی تحریک، کوئی لالچ، کوئی دولت، کوئی مال تمھیں اللہ کے دین سے برگشتہ نہیں کرسکتا۔ بس شرط یہ ہے کہ جو چیز میں چھوڑ کے جارہا ہوں اسے تھام لو۔ اور وہ دو چیزیں ہیں: «كِتَابُ اللّٰهِ» ایک اللہ کی کتاب «وَسُنَّتِي» اور دوسری میری سنت۔ ہدایت کی اور ہدایت پر استقامت کی ضمانت۔ ورنہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ تمام بندوں کے دل اللہ رب العزت کی دو انگلیوں میں رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان دلوں کو جب چاہے، جس طرف چاہے پھیر دے۔ تو کوئی بھی حالت ہو، کوئی بھی کیفیت ہو اللہ کے پیغمبر ﷺ کا اتباع ہمارا نصب العین اور ہمارا حاصل حیات ہونا چاہیے۔ جیسی بھی گھڑی ہو، تنگی ہو، ترشی ہو، خوشی ہو، غمی ہو، مشکل ہو، آسانی ہو حتی کہ اگر سر پر تلوار لٹک رہی ہو، جان کو خطرہ ہو، مال کو خطرہ ہو لیکن کلمۂ حق، سنت کی اتباع سے کوئی انکار نہ ہو۔ ایسے لوگ موجود رہیں گے جو اللہ کے پیغمبر کی سنت کو تھامیں گے اور سنت کا اتباع کریں گے۔ اور وہ لوگ عظیم ہوں گے۔

رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے: «إِنَّ مِنْ وَّرَائِكُمْ أَيَّامَ الصَّبْرِ» [1] تمھارے پیچھے کچھ ایام صبر ہیں۔ کچھ تکلیفوں کے دور ہیں۔ جن میں میری امت پر تکلیفیں اور آزمائشیں ٹوٹ پڑیں گی۔ اور یہ اللہ کے مقرب بندوں کا حصہ ہیں۔ «أَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً الْأَنْبِيَاءُ، ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ» [2] فرمایا کہ ایسے مشکل دن اور ایسے مشکل حالات ہوں گے «الْعَامِلُ فِيهِنَّ كَالْقَابِضِ الْجَمْرِ» ان مشکل حالات میں میری سنت کو تھامنے والا ایسا ہوگا جیسے اپنی مٹھی میں آگ کا جلتا ہوا انگارا دبانے والا۔ آگ کے انگارے کو مٹھی میں لے کر بیٹھنا آسان کام نہیں ہے۔ تو فرمایا کہ ایسے لوگ ہوں گے۔

[1] سنن أبي داود، حديث: 4341. [2] صحيح البخاري، حديث: 5648.

سنت پر عمل کرنا اور دین پر چلنا یقیناً اس قدر مشکل ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «اَلْمُتَمَسِّكُ فِيهِنَّ يَوْمَئِذٍ......لَهُ كَأَجْرِ خَمْسِينَ مِنْكُمْ» [1] جو شخص اس دور میں، ان مشکل گھڑیوں میں اس چیز کو تھام لے جس پہ آج تم ہو۔ تم کون؟ صحابہ کرام۔ جس کو تم نے تھاما، جس کو تم نے سینے سے لگایا۔ اور وہ کیا تھا؟ کتاب وسنت۔ صحابہ کے دور میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے علاوہ کوئی شخصیت نہیں تھی جس کی وہ پیروی کریں۔ قرآن و حدیث کے علاوہ کوئی دستاویز اور کوئی کتاب نہیں تھی جس کو وہ پڑھیں۔ ایک دفعہ تورات کے کچھ ورق ہاتھ آگئے تو اللہ کے پیغمبر نے کیا ردعمل ظاہر کیا؟ کس طرح آپ کا چہرہ انار کے دانے کی طرح سرخ ہوگیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «أَمُتَهَوِّكُونَ أَنْتُمْ كَمَا تَهَوَّكَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارٰى» [2] کیا تم یہود ونصاریٰ کی طرح بربادی مول لینا چاہتے ہو؟ ان کی طرح تباہ ہونا چاہتے ہو؟ صحابہ کا منہج تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آج تم نے جس چیز کو تھاما ہے وہ قرآن و حدیث کے علاوہ کچھ نہیں۔ قرآن وحدیث کے علاوہ کسی اور کی پیروی کا کوئی تصور نہیں۔ شیخین: ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اس امت کے افضل ترین انسان تھے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: «كُنَّا نَقُولُ وَالنَّبِيُّ حَيٌّ أَفْضَلُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ بَعْدَ رَسُولِ اللّٰهِ أَبُوبَكْرٍ ثُمَّ عُمَرُ» [3] افضل ترین انسان۔ ایک دفعہ کچھ لوگوں نے ان کا حوالہ دے کر حج تمتع کی مشروعیت سے انکار کیا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

«يُوشِكُ أَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ حِجَارَةٌ مِّنَ السَّمَاءِ أَقُولُ: قَالَ رَسُولُ

[1] المعجم الكبير للطبراني: 44/12. [2] شرح السنة: 270/1، حديث: 126.
[3] المعجم الكبير للطبراني: 427/10.

اللّٰهِ وَتَقُولُونَ: قَالَ أَبُوبَكْرٍ وَّ عُمَرُ»

”مجھے ڈر ہے کہ تم پر آسمان سے پتھر نہ برسیں۔ میں اللہ کے پیغمبر کا فرمان پیش کر رہا ہوں اور تم اس کے مقابلے میں ابوبکر وعمر کی بات کر رہے ہو۔“ [1]

حالانکہ یہ دونوں اس امت کے افضل ترین انسان ہیں۔ میں کہتا ہوں: اگر ابن عباس رضی اللہ عنہما آج زندہ ہوتے اور لوگوں کا حال دیکھتے کہ یہ کس کس کے پیروکار بن چکے ہیں۔ وہاں تو شیخین کی بات تھی اور ان کا یہ ردعمل تھا کہ آسمان سے پتھر برسیں گے جو تمھیں برباد کر دیں گے۔ اگر وہ آج کا طرز عمل دیکھتے، لوگوں کی راہیں دیکھتے کہ انھوں نے کس طرح اس دین کو شطرنج کا کھیل بنا رکھا ہے، ان کی کیا کیفیت ہوتی؟ کیا ردعمل ہوتا؟ یہ صحابہ کا منہج تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ ایامِ صبر، وہ فتنوں اور فسادات کا دور، اس دور میں جس شخص نے اس چیز کو تھام لیا پورے صبر کے ساتھ، ثبات کے ساتھ اور استقامت کے ساتھ جس پر آج تم ہو، اس ایک شخص کو پچاس افراد کے برابر ثواب ملے گا۔ صحابہ نے یہاں ایک بات معلوم کی کہ وہ پچاس افراد کون ہوں گے؟ «مِنَّا أَوْ مِنْهُمْ؟» وہ پچاس افراد ہم میں سے ہوں گے یا اس دور کے ہوں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «بَلْ مِنْكُمْ» وہ تم میں سے ہوں گے۔ [2] ایام صبر میں، مشکل حالات میں محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت کو تھامنے والا وہ «كَالْقَابِضِ الْجَمْرِ» ہے۔ ایک شخص کا اجر اللہ رب العزت پچاس صحابہ کے برابر بڑھا دے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ حدیثیں اس موضوع کا اصل ہیں۔ اور شروع میں جو حدیث میں نے آپ کے سامنے پڑھی۔ صحیح بخاری و مسلم میں بہت سے صحابہ سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے

[1] موسوعة الرد على الصوفية: 31/25. [2] المعجم الكبير للطبراني: 44/12.

ارشاد فرمایا: «إِنَّ الْإِسْلَامَ بَدَأَ غَرِيبًا» ”اسلام کا آغاز غربت سے ہوا، اجنبیت سے ہوا“ «وَسَيَعُودُ كَمَا بَدَأَ» ”اور جہاں سے اسلام شروع ہوا وہاں لوٹ کر رہے گا۔“ [1] جس اجنبیت سے چلا، اس اجنبیت پر لوٹ کر رہے گا۔ اب دیکھیے محمد رسول اللہ ﷺ نے دعوتِ دین پیش کی۔ خود آپ کی برادری نے انکار کر دیا۔ آپ کی قوم نے نہیں مانا۔ بلکہ اس دعوت کے راستے میں کانٹے بچھائے، رکاوٹیں کھڑی کیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ جن کو وہ صادق وامین کہتے کہتے تھکتے نہیں تھے، انھیں تین سال تک شعب ابی طالب میں محصور کر کے رکھ دیا۔ کیسی اجنبیت؟ رسول اللہ ﷺ کا ایک صحابی آپ سے پوچھتا ہے: «مَنْ مَّعَكَ عَلٰى هٰذَا؟» ”یا رسول اللہ! اب تک کتنے لوگ آپ کے ساتھ بنے اور جڑے؟ کتنے لوگوں نے آپ کی اطاعت کی؟“ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «عَبْدٌ وَّ حُرٌّ» ایک آزاد اور ایک غلام نے۔ [2] آزاد ابوبکر اور غلام بلال رضی اللہ عنہ۔ ایسی اجنبیت۔ لوگوں نے ان کی حیات کو تنگ کیا، سوشل بائیکاٹ کیا، پتھر مارے، طرح طرح کے القاب رکھے، گالیاں دیں لیکن انھوں نے دین کو نہیں چھوڑا۔ اللہ کے پیغمبر کی غلامی کا راستہ نہیں چھوڑا۔ یہ وصف ہے غرباء کا۔ فرمایا کہ «فَطُوبٰى لِلْغُرَبَاءِ» بشارتیں ہیں غرباء کے لیے۔ وہ اس دین کو، کتاب و سنت کو اپنے سینے سے لگا لیتے ہیں۔ زمانے کی مخالفت، حکومتوں کے مظالم، کسی چیز کی پروا نہیں کرتے۔ کوئی فتنہ انھیں حق سے دور نہیں کرتا۔ اللہ کے پیغمبر کی سنت کا اتباع ان کا نصب العین ہے۔ یہ حقیقت میں اہل الحدیث کی شان ہے۔

یونس بن عبید ایک بڑے محدث گزرے ہیں۔ وہ فرمایا کرتے تھے: «لَيْسَ شَيْءٌ

[1] صحیح مسلم، حدیث: 146. [2] مسند أحمد: 112/4.

أَغْرَبَ مِنْ سُنَّةِ رَسُولِ اللّٰهِ وَأَغْرَبَ مِنْهَا مَن يَّعْرِفُهَا»[1] اس کائنات میں اللہ کے پیغمبر کی سنت سے بڑھ کر کوئی چیز اجنبی نہیں ہے۔ سب سے زیادہ اجنبی اور غربت کا شکار میرے پیغمبر کی سنت ہے۔ کوئی اٹھتا ہے اس کا انکار کر دیتا ہے، کوئی اٹھتا ہے سنت کو رد کرنے کے لیے مختلف قاعدے ایجاد کرتا ہے۔ کلمہ گو مسلمان، سنت کو رد کرنے کے لیے قاعدے بناتا ہے۔ کتابوں میں باقاعدہ لکھ کے جاتا ہے کہ «لَوْ عَمِلْنَا بِكُلِّ حَدِيثٍ لَّسُدَّ بَابُ الرَّأْيِ» ''اگر ہم نے ہر حدیث پر عمل کرنا شروع کر دیا تو رائے کا دروازہ بند ہو جائے گا۔'' اور ہم تو اہل الرائے ہیں۔ یہ سنت کی اجنبیت اور غربت ہے۔ قاعدے بناتے ہیں کہ دلیل اول کتاب اللہ ہے اور دلیل ثانی سنت رسول اللہ ہے۔ یہ تقسیم کہاں سے آ گئی؟ یہ قاعدہ بدعت ہے۔ کتاب و سنت ساتھ ساتھ ہیں۔ یہ کہاں سے آپ نے پڑھ لیا کہ کوئی مسئلہ دیکھنا ہو تو پہلے قرآن میں تلاش کرو، پھر حدیث میں دیکھو۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «لَنْ يَّتَفَرَّقَا» یہ دونوں جدا نہیں ہوں گے۔ «حَتّٰى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ»[2] ''حتی کہ یہ دونوں چیزیں اکٹھی اللہ تعالیٰ مجھ پر حوض کوثر پر پیش کرے گا۔ یعنی تا قیامِ قیامت یہ کتاب و سنت ساتھ ساتھ رہیں گے۔ میں سمجھتا ہوں معنوی طور پر، ضمنی طور پر اللہ کے پیغمبر کا یہ فرمان جماعت اہلحدیث کے لیے بہت بڑا تزکیہ ہے۔ کیونکہ یہ وہ جماعت ہے جس نے دونوں چیزوں کو ساتھ ساتھ رکھا ہوا ہے۔ ایک ہاتھ میں کتاب اللہ، ایک ہاتھ میں سنت رسول۔ تو یونس بن عبید کا قول: «لَيْسَ شَيْءٌ أَغْرَبَ مِنْ سُنَّةِ رَسُولِ اللّٰهِ» سنت رسول سے بڑھ کر اجنبی کوئی اور چیز نہیں۔ «وَأَغْرَبَ مِنْهَا مَن يَّعْرِفُهَا»[3] لیکن اس سے زیادہ اگر کوئی اجنبی ہے تو

[1] مفتاح الجنة للسيوطي: 64/1. [2] جامع الترمذي، حديث: 3788. [3] مفتاح الجنة للسيوطي: 64/1.

وہ لوگ ہیں جو سنت والے ہیں، جو حدیث والے ہیں، جو حدیثیں پڑھتے ہیں، پڑھاتے ہیں، عمل کرتے ہیں اور حدیثوں کے ساتھ قائم ہیں، محکم ہیں۔ دعوتاً و عملاً، نشراً و بلاغاً، قراءتاً و سماعاً ہر لحاظ سے اس حدیث کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ پھر اس سے زیادہ اجنبی کوئی چیز ہے تو وہ اہل الحدیث ہیں جن کی لوگ مخالفت کرتے ہیں۔ جن پر طرح طرح کی طعن و تشنیع ہوتی ہے۔ لیکن یہ لوگ کسی مخالفت کی پروا نہیں کرتے بلکہ ان کا شغل، اہتمام بالسنہ جاری اور قائم ہے۔ حدیثوں کو پڑھنا، پڑھانا، اس کے لیے انفس نفائس کی قربانیاں دینا، یہ جاری اور قیامت تک قائم رہے گا۔ تو میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ مشکل سے مشکل گھڑی میں سنت رسول کا اتباع اپنا نصب العین بنا لیں۔ اس کا اجر و ثواب آپ نے سن لیا۔ «فَطُوبٰى لِلْغُرَبَاءِ» اور ایک متمسک بالسنة کے لیے پچاس صحابہ کے برابر اجر ہے۔ کب؟ فتنوں اور فسادوں کے مشاغل میں، تنگی اور ترشی میں۔ اگر سنت کو تھامے بیٹھا ہے تو اس کی کیفیت اس شخص کی سی ہے جو آگ کا انگارا مٹھی میں لیے بیٹھا ہے۔ لیکن ثواب پچاس صحابہ جتنا۔ تو سنت کا اتباع ہر حال میں اپنے پیش نظر رکھیے۔ سنت کو پیش کرنے کا اہتمام کیجیے۔ یہ مختلف لوگ جو سنت کی اس عظیم الشان راہ پر مختلف وار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارا طریق سنت کو پیش کرنا ہو اور سنت کے ذریعے سمجھانا ہو۔ امیر المؤمنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: «أَهْلُ الرَّأْيِ هُمْ أَعْدَاءُ السُّنَنِ»[1] یہ رائے والے سنت کے دشمن ہیں۔ «يَأْتُونَكُمْ وَيُجَادِلُونَكُمْ بِالْقُرْآنِ»[2] تمھارے پاس آئیں گے، تم سے قرآن پاک پڑھ پڑھ کے جھگڑیں گے۔ تم کیا کرو؟ «فَجَادِلُوْهُمْ بِالسُّنَنِ» تم ان کو اللہ کے پیغمبر کی سنت

[1] الفقيه والمتفقه للخطيب: 104/2. [2] تاريخ بغداد: 286/14، رقم: 7581.

سے جواب دو «فَإِنَّ السُّنَّةَ آيَةٌ» یہ لوگ درحقیقت سنت کو یاد کرنے سے، حدیثوں کو پڑھنے پڑھانے سے اور حدیثوں پر عمل کرنے سے عاجز آچکے ہیں، تھک چکے ہیں۔ یہ ان کا ردِعمل ہے۔ تو جیسے بھی حالات ہوں اللہ کے پیغمبر کی سنت کے ساتھ تمسک ہمارا نصب العین ہونا چاہیے، جیسا کہ محدثین کرام کا تھا۔ انھوں نے کس طرح سنت کا اہتمام کیا اور اپنی عمریں اس راہ میں کھپا دیں۔ اس کی خاطر طویل و عریض سفر کیے۔ کئی کئی مہینوں کے سفر۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کا مصر کا سفر، خالد بن مَخْلَد رضی اللہ عنہ کے پاس صرف ایک حدیث سننے گئے کہ اللہ کے پیغمبر نے ایک حدیث سنائی تھی، میں سمجھتا ہوں کہ جس جس نے سنی تھی وہ سب فوت ہو چکے، صرف تم زندہ ہو۔ تم سے سننے کے لیے مدینے سے آرہا ہوں، حالانکہ اس کا متن یاد ہے لیکن جس شخصیت نے اللہ کے پیغمبر سے سنی تھی، اس سے سننا چاہتے ہیں تاکہ سند عالی مل جائے۔ اس کے لیے اس کا ذوق، شوق اور جستجو، یہ محدثین کی سیرتوں کا خلاصہ ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ ہاں میں نے اللہ کے پیغمبر سے سنا تھا: «مَنْ سَتَرَ عَلَى أَخِيهِ عَوْرَةً فَكَأَنَّمَا أَحْيَا مَوْؤُدَةً» [1] جس شخص نے اپنے کسی مسلمان بھائی کی پردہ پوشی کر دی، اس کے عیب کو چھپا لیا تو اللہ اس کو اتنا اجر دے گا کہ جیسے اس نے جاہلیت کے دور کی کسی زندہ درگور بچی کو قبر سے اٹھا کر زندہ کر دیا ہو۔ حدیثوں کی خاطر سفر، سند عالی کی جستجو، یحییٰ بن معین موت کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ کسی نے پوچھا: «مَاتَشْتَهِي؟» "کیا چاہتے ہو؟" کہا کہ «بَيْتٌ خَالٍ وَّ سَنَدٌ عَالٍ» دو چیزیں چاہتا ہوں: خالی گھر مل جائے اور اللہ کے پیغمبر تک سند عالی مل جائے۔ خالی گھر کیوں؟ تاکہ مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے اور میں خالی گھر میں بیٹھ کر

[1] معجم الأوسط: 175/5، حديث: 4992.

پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کی حدیثیں پڑھوں، یاد کروں، ان کو حفظ کروں، یہ نور اپنے سینے میں پہنچاؤں اور کوئی مخل نہ ہو۔ اور سند عالی اگرچہ میں ضعیف ہو چکا ہوں، چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوں، پھر بھی اس سند عالی کو حاصل کرنے کے لیے چل پڑوں گا۔ «أَهْلُ الْحَدِيثِ هُمْ أَهْلُ النَّبِيِّ وَإِنْ لَّمْ يَصْحَبُوا» "اہل الحدیث ہی درحقیقت اہل النبی ہیں۔ حدیث والے ہی درحقیقت نبی والے ہیں کہ ان کو اگرچہ نبی کی ذات کی صحبت کا شرف میسر نہیں ہوا لیکن پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کی مبارک سانسوں کے دن رات کے ساتھی بنے۔ صبح و شام قال رسول اللہ، قال رسول اللہ۔ ایسے لوگوں کے انجام، ایسے لوگوں کا سفر، ایسے لوگوں کی زندگی بڑی مبارک ہوتی ہے۔ وہ تاحیات اللہ تعالیٰ کی حفاظت اور سعادت میں رہتے ہیں۔ دیکھیں امام احمد بن حنبل، ان کا بیٹا بیان کرتا ہے کہ سکرات الموت میں ہیں، چونکہ وضو کی ایک فضیلت ہے، ہم نے سوچا کہ اپنے باپ کو اس وقت باوضو کر دیں۔ وضو کرا رہے تھے۔ ہاتھ دھوئے، کلی کرائی، چہرہ دھویا، بازو دھوئے، پاؤں دھو رہے تھے۔ امام احمد اپنی زبان سے کچھ بولے۔ ہم نے اپنے کان قریب کیے تو فرما رہے تھے: «خَلِّلُوا بَيْنَ الْأَصَابِعِ» میری انگلیوں کا خلال تم بھول گئے ہو۔ [1] اللہ سکرات الموت میں عمل بالسنہ کی توفیق دے رہا ہے۔

امام مزی تہذیب الکمال میں لکھتے ہیں: ابوزرعہ الرازی عبیداللہ بن عبدالکریم عالمِ نزع میں ہیں اور کچھ محدثین ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے جن میں ان کا رفیق خاص محمد بن ادریس ابوحاتم الرازی بھی تھا۔ یہ دونوں مقام رَے کے عظیم محدث تھے۔ عالمِ نزع ہے اور ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ان کو کلمے کی تلقین کریں لیکن زبان نہیں چل رہی۔

[1] حلية الأولياء لأبي نعيم: 183/9.

بے ہوشی کے دورے پڑ رہے ہیں۔ ہمیں بڑی فکر کہ اللہ رب العزت انھیں کلمہ پڑھنے کی توفیق دے دے۔ لیکن زبان نہیں چل رہی۔ ہم نے سوچا کہ ہم وہ حدیث پڑھتے ہیں جس میں کلمے کا ذکر ہے۔ پوری زندگی جو درس حدیث کا سلسلہ رہا شاید زبان پر وہ حدیث آجائے اور کلمہ بھی ساتھ آجائے۔ چنانچہ ہم نے وہ حدیث پڑھنی شروع کردی۔ سند کا اعلیٰ حصہ پڑھا اور رک گئے، ابوزرعہ الرازی نے اپنی آنکھیں کھولیں اور وہ حدیث خود پڑھنی شروع کردی: «حدَّثنا بُنْدارٌ، قال: حدَّثنا أبو عاصِمٍ، قال: حدَّثنا عبْدُالْحميدِ بْنُ جعْفرٍ عنْ صالِحِ بْنِ أبي عريبٍ عنْ كثِيرِ بْنِ مُرَّةَ الْحضْرمِيِّ عنْ مُعاذِ بْنِ جبلٍ» پوری سند ذکر کردی اور فرمایا: «قال رسُولُ اللهِ ﷺ: منْ كان آخِرُ كلامِهِ لا إلٰه إلَّا اللهُ دخل الْجنَّة» ثُمَّ تُوُفِّي یہ حدیث پوری کی اور وفات پا گئے۔ [1] یہ شغف بالسنہ، اشتغال بالحدیث کی برکت کہ اللہ نے حدیث پڑھنے کی برکت سے زبان کھول دی اور کلمہ نصیب ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ”جس کو موت سے پہلے اللہ تعالیٰ کلمہ پڑھنے کی توفیق دے دے، وہ جنتی ہے۔“ [2] صحیح مسلم میں حدیث ہے: «منْ مات وهُو يعْلمُ أنَّهُ لا إلٰه إلَّا اللهُ دخل الْجنَّة» ”جس شخص کو موت سے قبل لا إلٰه إلَّا اللّٰه کا علم ہو، وہ جنتی ہے۔“ [3] «إنَّما الْأعْمالُ بِالْخواتِيمِ» [4]

جو حدیثیں ہم پڑھتے ہیں اور یہ نور ہم اپنے سینے میں اتارتے ہیں، یہ عمل کرنے کے لیے ہیں۔ تو عمل کا کوئی موقع اپنے ہاتھ سے جانے نہ دیں اور جیسا مرضی موقف

[1] تهذيب الكمال: 14/13. [2] سنن أبي داود، حديث: 3116. [3] صحيح مسلم، حديث: 26.
[4] صحيح البخاري، حديث: 6607.

آجائے ہم سنت رسول کا اتباع کریں، اسے ہر چیز پر فوقیت اور ترجیح دیں۔ صحابہ کرام کی زندگی اسی چیز کی آئینہ دار ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے اپنی وفات سے قبل شام کے بعض علاقوں کے لیے ایک لشکر ترتیب دیا جو جیش اسامہ کے نام سے معروف ہے۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ «أنْفِذُوا جيْش أُسامة» ”جیش اسامہ کو بھیج دو۔“ لشکر چل پڑا۔ مدینے سے کچھ فاصلے پر تھا کہ اللہ کے پیغمبر ﷺ کا انتقال ہوگیا۔ لشکر کو بھی اطلاع مل گئی۔ اللہ کے پیغمبر ﷺ کے چہرے پر آخری نگاہ ڈالنے کے لیے، اللہ کے پیغمبر کا جنازہ پڑھنے کے لیے واپس پلٹ آئے، چنانچہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب خلیفہ بنے تو آپ نے خلیفہ بنتے ہی پہلا کام کیا کیا؟ جیش اسامہ کو روانہ کرنے کا حکم دیا۔ بڑے اجلّہ صحابہ نے امیر عمر کے ذریعے عرض کی: جیش اسامہ بھیجنے کا یہ وقت مناسب نہیں ہے۔ بہت سے قبائل عرب ارتداد اختیار کرچکے ہیں اور بنوتمیم کے بعض لوگ زکاۃ کا انکار کرچکے ہیں۔ ان سے جنگ ہوسکتی ہے۔ یہ ہم پر حملہ کرسکتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کی سازشیں اپنے عروج پر ہیں۔ اگر ایک طاقت باہر چلی گئی تو یہ لوگ مدینہ میں ہماری اینٹ سے اینٹ بجادیں گے۔ یہ وقت مناسب نہیں ہے۔ لشکر کو روک لیجیے۔ فرمایا: «كيْف أحْبِسُ جيْشًا أنْفذهُ رسُولُ اللهِ ﷺ؟» ”اس لشکر کو کیسے روکوں جس کو اللہ کے پیغمبر بھیجنے کا حکم دے چکے تھے۔“ مجھ میں یہ طاقت نہیں، حالانکہ بڑے مشکل حالات ہیں۔ سارے صحابہ ایک طرف ہیں لیکن فرمایا کہ لشکر ضرور جائے گا۔ اور فرمایا: تم کیا بات کرتے ہو۔ اگر یہ قبائل ہم پر حملہ کردیں، ہم کو ذبح کردیں اور فضاؤں میں اڑنے والے پرندے نوچ کر ہماری بوٹی بوٹی کردیں، یہ لشکر پھر بھی جائے گا۔ حتی کہ صحابہ کو خاموش ہونا پڑا۔ [1]

[1] السيرة النبوية، شمس الدين بن عثمان الذهبي: 182/3.

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی استقامت! کچھ لوگوں نے کہا کہ ٹھیک ہے لشکر بھیج دیجیے لیکن اسامہ ایک نوجوان شخص ہے۔ کسی عمر رسیدہ صحابی کو امیر بنادیں۔ فرمایا کہ جس کو اللہ کے پیغمبر نے امیر بنایا ہے، ابوبکر اس کو تبدیل کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ امیر وہی رہے گا جس کو اللہ کے پیغمبر نے منتخب کیا ہے۔ اور بعد میں سب نے اس کا ثمرہ دیکھا۔ کچھ لوگ اس انتظار میں تھے کہ مسلمان کمزور ہو چکے ہیں، اللہ کے پیغمبر کے انتقال کے بعد ان کا شیرازہ بکھر چکا۔ اب ان کی وہ طاقت نہیں۔ لیکن جب وہ لشکر گیا اور ملک شام سے جہاد کر کے واپس لوٹا تو یہ سب توہّمات ختم ہو گئے اور یہ زبانیں گنگ ہو گئیں۔ یہ تو بڑے طاقتور ہیں۔ اللہ کے پیغمبر کے انتقال کے بعد بھی جنگ و جہاد کا سلسلہ قائم و دائم ہے اور جہادی قافلے جا رہے ہیں۔ ان کی طاقت ویسی ہی ہے۔

یہ سنت کا اتباع ہے، حالانکہ موقف بڑا شدید ہے، حالات سخت ہیں۔ لیکن عمل بالسنہ صحابہ کا وتیرہ تھا۔ کچھ لوگوں نے زکاۃ کا انکار کیا، کچھ لوگ مرتد ہوئے۔ فرمایا کہ سب سے لڑوں گا۔ امیر عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جو مرتد ہوئے ان سے قتال تو بجا ہے لیکن منکرین زکاۃ کلمہ گو ہیں، ان سے قتال کیوں کرو گے؟ اللہ کے پیغمبر کی حدیث پیش کی کہ «إِلَّا بِحَقِّهَا» اور زکاۃ، مال کا حق ہے۔ «وَاللّٰهِ لَوْ مَنَعُونِي عِقَالًا كَانُوا يُؤَدُّوْنَهُ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ لَقَاتَلْتُهُمْ عَلٰى مَنْعِهِ» [1] اللہ کے پیغمبر کے دور میں اگر وہ زکاۃ میں ایک رسی بھی دیتے تھے جو اونٹ کے گلے میں بندھی ہوتی ہے۔ آج اگر وہ اونٹ دے دیں گے، رسی روک لیں گے، اس رسی کے روک لینے پر بھی میں ان سے لڑوں گا اور قتال کروں گا۔ یہ تھا اللہ کے پیغمبر کے فرمان کے ساتھ تمسک۔

[1] صحيح البخاري، حديث:7284.

اللہ کے پیغمبر کے مال کی تقسیم کا اختلاف اٹھا۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا اللہ کے پیغمبر کی لخت جگر، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آتی ہے اور اپنے ورثے کے حصے کا مطالبہ کرتی ہے۔ بڑا شدید موقف ہے۔ اللہ کے پیغمبر کی بیٹی سامنے بیٹھی ہے۔ اس کی ایک طلب ہے اور وہ ناراضی کا اظہار بھی کر رہی ہے۔ لیکن میں کیا کروں؟ اللہ کے پیغمبر کی قرابت کو دیکھوں؟ اللہ کے پیغمبر کی بیٹی کو دیکھوں؟ یا اس کی ناراضی کو دیکھوں یا اللہ کے پیغمبر کی سنت کو دیکھوں؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا: «نَحْنُ مَعَاشِرُ الْأَنْبِيَاءِ لَا نُورَثُ مَاتَرَكْنَا فَهُوَ صَدَقَةٌ» [1] ہم انبیاء کی جماعت، ہمارے مال کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ جو مال ہم چھوڑ کر جائیں گے، بیت المال میں جائے گا اور وہ سب مسلمانوں کا ہوگا۔ یہ ورثہ کیسے ہو؟ فرماتے ہیں: «لَقَرَابَةُ رَسُولِ اللّٰهِ أَحَبُّ إِلَيَّ أَنْ أَصِلَ مِنْ قَرَابَتِي» [2] پیغمبر کی قرابت کو جوڑنا مجھے اپنی قرابت سے زیادہ عزیز ہے۔ مگر اللہ کے پیغمبر کے اس فرمان کا کیا کروں؟ تو دیکھیے، کتنے شدید حالات ہیں۔ پوری امت ایک طرف۔ بعض محدثین کو لکھنا پڑا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا پوری امت پر یہ احسان ہے۔ کیونکہ وہ اکیلے تھے اور پوری امت ایک طرف تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ تین مشاہیر ایسے گزرے ہیں جن کا عمل، جن کی استقامت پوری امت پر احسان ہے۔ اور اس کا اس موضوع سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ ایک ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جنھوں نے فتنۂ منع زکاۃ کے خلاف اعلانِ جہاد کیا۔ صحابہ ایک طرف ہیں، آپ اکیلے ایک طرف ہیں۔ پوری امت پر احسان ہے۔ اگر ان کا یہ موقف نہ ہوتا تو آج امت کا نظریہ کیا ہوتا؟ واللہ اعلم۔

[1] صحيح البخاري، حديث: 3712، و مسند الربيع بن حبيب: 261/1. [2] صحيح البخاري، حديث: 3712.

دوسری شخصیت امام مالک رحمہ اللہ۔ وہ اکیلے ڈٹ گئے کہ طلاق مکرہ (زبردستی طلاق) جائز نہیں ہے۔ کوئی شخص کسی کے کندھے پر بندوق رکھے یا تلوار رکھے اور کہے کہ اپنی بیوی کو طلاق دو ورنہ وار کردوں گا اور وہ ڈر کے مارے طلاق دے دے تو طلاق نافذ ہوجائے گی۔ امام مالک ڈٹ گئے کہ اللہ کے پیغمبر کا فرمان ہے: «لَا طَلَاقَ وَلَا عِتَاقَ فِي إِغْلَاقٍ» [1] زبردستی کی طلاق نافذ نہیں ہوتی۔ اکیلے ڈٹے، پوری امت اس کے خلاف تھی۔ پوری امت پر احسان ہے۔

تیسری شخصیت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ، امام اہل السنہ، جب فتنہ خلق قرآن اٹھا، بادشاہ وقت کا، پوری رعیت کا، اس کے تمام پچھے علماء کا یہی موقف تھا کہ قرآن پاک اللہ کی مخلوق ہے، نعوذ باللہ۔ اکیلے امام کی آواز کہ «اَلْقُرْآنُ كَلَامُ اللّٰهِ غَيْرُ مَخْلُوقٍ» [2] قرآن کلام اللہ ہے، مخلوق نہیں ہے۔ لوگوں نے مارا لیکن استقامت اختیار کی۔ اتنے کوڑے مارے جاتے کہ بے ہوش ہو جاتے۔ لیکن جب ہوش آتا تو فرماتے: «اِيتُونِي بِشَيْءٍ بِكِتَابِ اللّٰهِ أَوْ سُنَّةِ رَسُولِ اللّٰهِ» اس گردن کو جھکانا چاہتے ہو تو کتاب اللہ پیش کرو یا اللہ کے پیغمبر کی سنت پیش کرو۔ اکیلے ڈٹے رہے۔ حتی کہ بعض علماء نے تقیہ کی حدیث پیش کر کے سمجھانے کی کوشش کی کہ جان بچانے کے لیے تنازل کی راہ اختیار کر لینے، پسپائی کا راستہ اختیار کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جان بچا لیجیے اور حکومت کی ہاں میں ہاں ملا دیجیے۔ فرمایا: کیسی بات کرتے ہو؟ علماء تقیہ کا راستہ پکڑ لیں اور جاہل حق کو نہ جانتے ہوں تو حق کیسے واضح ہوگا؟ اللہ اکبر۔ پوری امت پر امام احمد کا احسان ہے۔ ان اکیلے کی استقامت اس مسئلے کو زندہ کر گئی، ورنہ نہ معلوم آج لوگوں کا موقف

[1] سنن أبي داود، حديث: 2193. [2] السنن الكبرٰى للبيهقي: 207/10.

کیا ہوتا۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زندگی کے یہ شدید مواقع اور پھر تمسک بالسنہ، ہمیں چاہیے کہ اسے اپنا نصب العین بنائیں۔ اپنے لیے مثال بنائیں۔

قرآن پاک میں ایک جماعت کا ذکر ہے جنھوں نے سَاعَةُ الْعُسْرَہ میں اللہ کے پیغمبر کی اتباع کی۔ کیا ان کی شان اور کیا ان کا مقام! ﴿لَقَدْ تَابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ﴾ [1] ''اللہ نے معاف کر دیا نبی کو، مہاجرین کو، انصار کو جنھوں نے اپنے پیغمبر کی مشکل گھڑی میں اتباع کی۔'' یہ سَاعَةُ الْعُسْرَہ کیا ہے؟ یہ جنگ تبوک کا موقع ہے۔ بڑی مشکل گھڑی ہے۔ اللہ کے پیغمبر کا امر تھا کہ ہم نے تبوک جانا ہے۔ ملک شام میں جا کر لڑنا ہے لیکن حالات بڑے تنگ تھے۔ ایک تو شدید گرمی۔ منافقین کہتے تھے: ﴿لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ﴾ ارے بڑی گرمی ہے مت جاؤ۔ [2] اور دوسری طرف مدینے کے پھل پک چکے تھے۔ پھل کھانے کا وقت ہے۔ ان کو چھوڑ کے چلے جائیں، سواریاں میسر نہیں ہیں، پیسے کی تنگی۔ پیسوں کے انبار لگا دیے۔ وسائل کے انبار لگا دیے۔ اللہ کے پیغمبر کی زبان سے ایک بار نکلا کہ جیشِ عسرہ کون تیار کرے گا؟ صحابہ اٹھے، مال لے کر آ گئے۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے سیکڑوں اونٹ اور پچاس گھوڑے پیش کر دیے کہ ان کی پشتوں پر بیٹھ کر صحابہ جہاد کے لیے جائیں۔ ایک ہزار سونے کے سکے اللہ کے پیغمبر کی جھولی میں ڈال دیے۔

عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ ایک سو اوقیے سونا اللہ کے پیغمبر کو پیش کرتے ہیں۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ گئے کہ ابوبکر ہر موقع پر مجھ سے بڑھ جاتے ہیں، آج کل میرے گھر میں بڑا مال آیا ہوا ہے۔ آج تو ان کو بڑھنے نہیں دوں گا۔ اپنے گھر گئے، سارا سامان دو

[1] التوبة 9:117. [2] التوبة 9:81.

حصوں میں تقسیم کر دیا۔ آدھا گھر کے لیے چھوڑا، آدھا اللہ کے پیغمبر کے پاس لے آئے۔ اللہ کے پیغمبر نے پوچھا: «مَا أَبْقَيْتَ لِأَهْلِكَ؟» عمر! گھر میں کیا چھوڑا؟ فرمایا: «مِثْلَهُ» آدھا آپ کو پیش کر دیا، آدھا گھر چھوڑ آیا ہوں۔ تھوڑی دیر میں ابوبکر بھی آ گئے۔ اپنا مال سر پر اٹھایا ہوا ہے۔ اللہ کے پیغمبر نے پوچھا: ابوبکر! «مَا أَبْقَيْتَ لِأَهْلِكَ؟» گھر میں کیا چھوڑا؟ فرمایا: «أَبْقَيْتُ لَهُمُ اللّٰهَ وَ رَسُولَهُ» [1] گھر میں اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑ کر آیا ہوں۔ سب کچھ لے آیا ہوں۔"

ایک انصاری ابوعقیل بڑا پریشان کہ میرے پاس کچھ نہیں۔ میں کیا پیش کروں؟ رات اپنے باغ میں گزارتے ہیں۔ ایک ایک کھجور کو ٹٹولتے ہیں کہ کوئی کھانے کے قابل ہو، وہ توڑ لوں۔ اس طرح کوئی ڈیڑھ دو کلو کھجوریں توڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر اپنے پیغمبر کو دے دی۔ پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام اس کی تھوڑی سی کھجوریں قبول کرتے ہیں۔ فرمایا کہ ابوعقیل انصاری کی کھجوروں کو چاندی اور سونے کے ان ڈھیروں پر پھیلا کر رکھ دو، مجھے بڑی پسند آ رہی ہیں۔ ساعة العسرہ میں اللہ کے پیغمبر کے فرمان کی تکمیل ہو رہی ہے۔ سبحان اللہ! تو ہمارا بھی یہ نصب العین ہونا چاہیے۔ مشکل ترین سفر، کٹھن ترین سفر، کبھی پہاڑ، کبھی وادیاں، کبھی خاردار جھاڑیاں، گرمی، پانی نہیں ملتا، پیاس اتنی کہ بعض صحابہ نے اپنے اونٹ ذبح کر دیے کہ اونٹوں کے پیٹوں میں جو پانی جمع ہے اسی کو پئیں۔ مگر اللہ کے پیغمبر کی نافرمانی نہیں کی۔ اللہ کے پیغمبر کی اتباع کی۔ ساعة العسرہ میں اللہ کے پیغمبر کی اطاعت کو فوقیت دی۔

اللہ کے پیغمبر روانہ ہو چکے ہیں۔ کچھ صحابی پیچھے رہ گئے جن میں ابوخیثمہ بھی تھے۔

[1] سنن أبي داود، حديث: 1678.

اپنے گھر گئے۔ دو بیویاں ہیں، دونوں نے استقبال کیا، ٹھنڈا پانی پیش کیا، کھجوریں پیش کیں۔ کھانے کے لیے بیٹھے۔ دل میں خیال آیا کہ اللہ کے پیغمبر تو تبوک کے سفر پر ہیں اور میں اپنی دو خوبصورت بیویوں کے بیچ میں بیٹھ کر پھل کھا رہا ہوں اور ٹھنڈا پانی پی رہا ہوں۔ ایسا ممکن نہیں۔ ان کو چھوڑا، پھل اور پانی چھوڑا، سواری لی اور روانہ ہو گئے۔ یہ اتباع ہے۔

ایک صحابی کعب بن مالک رضی اللہ عنہ پیچھے رہ گئے۔ نہیں جا سکے۔ اللہ کے پیغمبر واپس آئے، منافقین آ کر عذر پیش کر رہے ہیں۔ کوئی بیماری کا عذر پیش کر رہا ہے، کوئی اپنے اہل کی بیماری کا عذر پیش کر رہا ہے۔ اللہ کے پیغمبر «غَفَرَ اللّٰهُ لَكَ» اللہ تجھے معاف کر دے۔ دعا دے دے کر ان کا عذر قبول کر رہے ہیں۔ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ بھی آئے۔ اور یہ بڑا کٹھن موقع تھا۔ اگر سچ بولوں تو رسوائی ہے، اس کا نقصان ہو سکتا ہے اور اگر جھوٹ بولوں تو ان منافقین کی طرح میں بچ سکتا ہوں، طعن و ملامت سے میرا دامن محفوظ رہے گا۔ یہ بھی مشکل ترین حالت ہے۔ اور کعب بن مالک فرماتے ہیں: میں اتنا بڑا قادر الکلام تھا، اتنا بڑا خطیب تھا کہ اپنی زبان سے ہر طرح کا بیان دے سکتا تھا۔ لیکن میں نے سوچا کہ یہاں اللہ کے پیغمبر کی اتباع کرنی ہے، سچ بولنا ہے جھوٹ نہیں بولنا۔ "مومن اور گناہ کر سکتا ہے جھوٹ نہیں بول سکتا۔" [1] رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «إِنَّ الرَّجُلَ لَيَصْدُقُ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَاللّٰهِ صِدِّيقًا» [2] ایک شخص پے در پے سچ بولتا ہے، اتنا سچ بولتا ہے کہ اللہ فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ اس کو صدیق لکھ دو۔ اور ایک شخص جھوٹ بولتا ہے۔ ایک ابھی بولا، پھر شام کو بولا، اگلے دن بولا۔ جھوٹ بولتا رہتا ہے۔ ایک اسٹیج ایسی آتی ہے کہ اللہ فرماتا ہے: لکھ دو کہ یہ کذاب ہے۔ بڑی

[1] شعب الإيمان للبيهقي: 456/6، والموطأ للإمام مالك، حديث: 1795. [2] صحيح مسلم، حديث: 2607.

بُری بیماری ہے۔ «إِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِي إِلَى الْجَنَّةِ» ''سچائی نیکی کا راستہ دکھاتی ہے اور نیکی جنت کا راستہ دکھاتی ہے۔'' «وَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِي إِلَى الْفُجُورِ وَإِنَّ الْفُجُورَ يَهْدِي إِلَى النَّارِ» ''اور جھوٹ گناہوں کا راستہ دکھاتا ہے اور گناہ جہنم میں پہنچاتے ہیں۔''[1] اب سچ بولیں یا جھوٹ بولیں۔ اللہ کے پیغمبر کی اتباع کا تقاضا ہے کہ سچ بول دیں کچھ بھی ہو، کوئی آفت ہو۔ سچ بتادیا کہ میرے پاس کوئی عذر نہیں۔ صحت بھی ہے، وسائل بھی ہیں، مال بھی ہے، کوئی بیماری بھی نہیں ہے۔ تیاری بھی کررکھی تھی لیکن سستی کی بنا پر نہیں جاسکا۔ سچ کہہ دیا۔ پھر کتنی بڑی مصیبت آئی؟ پچاس دن پورے مدینہ میں ان کا بائیکاٹ ہوا۔ حتیٰ کہ بیوی تک کو الگ کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ پچاس دن اکیلے پھرتے رہے۔ کوئی مسکرا کر نہیں دیکھ رہا، کوئی بات نہیں کررہا۔ اس تنگی اور سختی کو برداشت کیا لیکن سچائی کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اللہ کے پیغمبر کی غلامی اور اللہ کے پیغمبر کی اتباع ہر چیز پر مقدم رکھی۔ بالآخر پچاس دن کے بعد اللہ رب العزت نے توبہ قبول کی۔ اللہ کے پیغمبر نے بلا کر بشارت دی۔ پوچھتے ہیں: «أَمِنْ عِنْدِكَ يَارَسُولَ اللّٰهِ أَمْ مِنْ عِنْدِاللّٰهِ؟» ''یارسول اللہ! یہ توبہ کی قبولیت کی خبر آپ کی طرف سے ہے یا اللہ کی طرف سے ہے؟'' فرمایا: اللہ کی طرف سے ہے۔ کتنی بڑی فضیلت، کتنا اونچا مقام اور پھر ساتھ ہی فرماتے ہیں: «إِنَّ مِنْ تَوْبَتِي أَنْ أَنْخَلِعَ مِنْ مَّالِي» اللہ نے میری توبہ قبول کی، میں اللہ کا شکریہ اس طرح ادا کرتا ہوں کہ اپنے پورے مال سے دستبردار ہوجاتا ہوں، یہ اللہ اور اس کے رسول کے لیے صدقہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَمْسِكْ عَلَيْكَ بَعْضَ مَالِكَ» کعب! کچھ مال اپنے پاس روک لے، یہ تمھارے لیے بہتر ہے۔ فرمایا کہ

[1] صحيح البخاري، حديث:6094.

ٹھیک ہے، جنگ خیبر کا جو حصہ میرے پاس ہے وہ روک لیتا ہوں، پھر باقی سارا مال صدقہ ہے۔ اور ساتھ ہی فرماتے ہیں: «إِنَّ اللّٰهَ إِنَّمَا نَجَّانِي بِالصِّدْقِ» یارسول اللہ! میرا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے میری سچائی کی برکت سے نجات دی۔ فرماتے ہیں کہ میری توبہ کی ایک نشانی اور ایک تقاضا یہ ہے کہ آج کے بعد میں صرف سچ ہی بولوں گا۔[1] تو دیکھیں جیسا بھی موقع ہو سچائی، صدق، اللہ کے پیغمبر کی اتباع، اللہ کے پیغمبر کی پیروی ہی نصب العین ہونا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کے فرامین میں بڑی برکت ہے، بڑی طاقت ہے۔ اللہ کے پیغمبر کا ہر فرمان حرف بہ حرف درست ہے، پتھر پر لکیر ہے۔ جو اس کے ثمرات اور نتائج ہیں، سب کے سب حاصل ہوں گے۔ اللہ کے پیغمبر کے فرامین معمولی نہیں ہیں۔ آپ کی دعائیں اور آپ کی سنتیں معمولی نہیں ہیں۔ لوگ تنقیص کی کوشش کرتے ہیں مگر پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فرامین دین ہیں۔ اللہ کے پیغمبر کا بولنا دین، اللہ کے پیغمبر کا عمل کرنا دین، اللہ کے پیغمبر کی خاموشی بھی دین، کیسی ذاتِ مبارکہ ہیں اللہ کے آخری پیغمبر۔ ہر فرمان پتھر پر لکیر اور ایک اٹل حقیقت ہے۔ دیکھیں ابوسلمہ رضی اللہ عنہ فوت ہوگئے۔ ان کی بیوی ام سلمہ رضی اللہ عنہا بڑی پریشان ہیں اور مصیبت کے پہنچتے وقت جو دعا اللہ کے پیغمبر سے سن رکھی تھی اس دعا کو پڑھ رہی ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ صبر دے دے: «إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ» اور ساتھ ہی پڑھا کہ «اَللّٰهُمَّ أْجُرْنِي فِي مُصِيبَتِي وَأَخْلِفْ لِي خَيْرًا مِّنْهَا» اے اللہ! مجھے اس مصیبت پر صبر کا اجر دے دے اور مجھے اس سے بہتر عطا فرما دے۔ اور جب یہ پڑھنے لگیں: «وَأَخْلِفْ لِي خَيْرًا مِّنْهَا» کہ اس سے بہتر عطا فرما دے۔ اس کو پڑھنے سے پہلے زبان رک گئی اور کہتی ہیں: «أَيُّ

[1] صحيح البخاري، حديث:4418.

الْمُسْلِمِينَ خَيْرٌ مِّنْ أَبِي سَلَمَةَ» ابوسلمہ سے اچھا کون ہوسکتا ہے؟ یہ الفاظ میں کیسے کہوں کہ مجھے اس سے اچھا اور بہتر عطا فرمادے۔ ابوسلمہ سے اچھا کون ہوسکتا ہے؟ لیکن پھر سوچا کہ اللہ کے پیغمبر کا امر ہے، دعا کو پڑھ لینا چاہیے۔ دعا پڑھ لی اور جب عدت ختم ہوئی، آپ کس کے نکاح میں آگئیں؟ محمد رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں۔ [1] دعا پڑھنے کی برکت۔ رسول اللہ ﷺ گھر سے باہر نکلے۔ ابورافع رضی اللہ عنہ ہنڈیا میں گوشت پکا رہے ہیں۔ فرمایا: ابورافع! کیا پکا رہے ہو؟ فرمایا: پورا بکرا ہے۔ آپ کو دستی پسند تھی۔ فرمایا کہ اس کی دستی نکال کر دو، ہم کھائیں گے۔ دستی نکال کر دی۔ آپ نے تناول فرمائی۔ فرمایا: ابورافع! ایک دستی اور دو۔ انھوں نے دوسری بھی نکال دی۔ وہ بھی تناول فرمائی۔ ابورافع! ایک دستی اور دو۔ عرض کی کہ بکرے کی دو ہی دستیاں ہوتی ہیں۔ فرمایا کہ میرے کہنے پر تلاش کرتے تو تیسری بھی مل جاتی۔ [2] اللہ کے پیغمبر کے فرامین! ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک جہاد کے موقع پر تنگی تھی، بھوک اور فاقہ تھا۔ سات سات کھجوریں دن بھر کے لیے مجاہدین کے حصے میں آئیں۔ مجھے بھی سات مل گئیں۔ وہ سات کھجوریں اس طرح تھیں کہ ان میں ایک حشفہ تھی۔ ایسی کھجور جو ردی ہوتی ہے اور کھائی جانے کے قابل نہیں ہوتی۔ میں نے سوچا: پہلے ہی بھوک ہے، سات کھجوریں، اوپر سے ایک حشفہ ہے۔ یہ فالتو کھجور جو پھینکے جانے کے قابل ہے۔ کیوں نہ اللہ کے پیغمبر کے پاس جاؤں اور یہ تبدیل کرالوں، پھر سوچا کہ نہیں، اللہ کے پیغمبر کے مبارک ہاتھ سے ملی ہے۔ یہ سوچ کر میں نے وہ کھجور کھالی۔ [3] اس طرح کی مثالیں آپ کو ذخیرۂ حدیث میں سے بے شمار ملیں گی، تو اللہ کے پیغمبر کے فرامین پر عمل کرنا ہر حالت میں موجب سعادت ہے۔ اللہ رب العزت کی رضا اور اس کی محبت کی اساس ہے۔

[1] صحيح مسلم، حديث: 918. [2] مسند أحمد: 48/2. [3] صحيح البخاري، حديث: 5411، و مسند أحمد: 324/2.

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ [1] اللہ کے پیغمبر کہہ دیجیے کہ لوگو! اگر تم اللہ کی محبت چاہتے ہو تو اس کا ایک ہی طریق ہے بلکہ ایک ہی اساس ہے، وہ یہ ہے کہ میری اتباع کرو۔ اللہ کی محبت کی اساس میری اتباع ہے۔ تم تو صرف اللہ کی محبت کے طالب تھے لیکن اس اتباع کا ثمرہ یہ ہے کہ ﴿يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾ تمھیں اللہ اپنا محبوب بنالے گا۔ تم اللہ کے محبوب بن جاؤ گے۔ کتنا بڑا ثمرہ ہے یہ۔ اللہ کے پیغمبر کی اتباع سے اللہ کی محبت حاصل ہوجاتی ہے۔ «إِذَا أَحَبَّ اللَّهُ الْعَبْدَ نَادٰى جِبْرِيلَ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ فُلَانًا فَأَحِبَّهُ» اللہ جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبریل کو خبر دیتا ہے کہ میں فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں فَأَحِبَّهُ تو بھی اس سے محبت کر۔ جبریل اس سے محبت کرتا ہے۔ اور جبریل کی محبت ان فرشتوں تک پہنچتی ہے جو حاملین عرش ہیں۔ وہ محبت شروع کردیتے ہیں۔ حاملین عرش کی محبت ساتویں آسمان تک پہنچتی ہے۔ وہ بھی محبت کرتے ہیں۔ پھر چھٹا، پھر پانچواں، پھر چوتھا، پھر تیسرا، دوسرا، پہلا۔ الغرض ساتوں آسمانوں کے فرشتے اس سے محبت کرنا شروع کردیتے ہیں۔ اور حدیث کے آخری الفاظ ہیں: «ثُمَّ يُوضَعُ لَهُ الْقَبُولُ فِي أَهْلِ الْأَرْضِ» پھر اللہ تعالیٰ اس بندے کی قبولیت اور محبت کے جھنڈے قیامت تک کے لیے زمین پر بھی گاڑ دیتا ہے۔ [2] قیامت تک کے لیے تمام زمین والے اس سے محبت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے پیغمبر کی اتباع کی توفیق دے دے۔

وَأَقُولُ قَوْلِي هٰذَا وَأَسْتَغْفِرُ اللَّهَ لِي وَلَكُمْ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

[1] آل عمرٰن 3:31. [2] صحيح البخاري، حديث: 6040.

دینی مدارس کی اہمیت وضرورت

اوران پر ہونے والے اعتراضات کا جائزہ

دینی مدارس کی اہمیت وضرورت

اوران پر ہونے والے اعتراضات کا جائزہ

خطبہ مسنونہ کے بعد:

﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا﴾

”اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روک رکھیں جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں، وہ اس کا چہرہ چاہتے ہیں اور آپ کی آنکھیں ان سے آگے نہ بڑھیں کہ آپ دنیاوی زندگی کی زینت چاہنے لگیں۔ اور اس شخص کی اطاعت نہ کریں جس کا دل ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا، اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے چلا، اور اس کا معاملہ ہمیشہ حد سے بڑھا ہوا ہے۔“[1]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ، وَإِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَّاللّٰهُ يُعْطِي»[2]

[1] الکہف 18:28. [2] صحیح البخاري، حدیث:71.

محترم سامعین حضرات! اس نشست کا جو موضوع رکھا گیا ہے وہ آپ نے سن لیا ہے، یعنی دینی مدارس کی اہمیت، ان کی ضرورت اور مدارس پر ہونے والے اعتراضات کا جائزہ۔ پہلے ایک بڑا اہم مقدمہ قابلِ غور ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہماری جدوجہد کا محور کیا ہونا چاہیے؟ اللہ تعالیٰ نے تین گھر بنائے ہیں: ایک دارالدنیا ہے۔ یہ دنیا ایک گھر ہے جس میں ہم موجود ہیں اور دوسرا جہان عالم برزخ ہے جو سب کا مصیر ہے، جہاں سب نے جانا ہے اور تیسرا جہان عالم آخرت ہے، جہاں سب نے خالقِ کائنات کے سامنے پیش ہونا ہے۔ اور اس عالم آخرت میں اللہ رب العزت نے صرف دو گھر بنائے ہوئے ہیں۔ کوئی تیسری، چوتھی چوائس نہیں ہے، کوئی پسند یا اختیار نہیں ہے۔

﴿فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ﴾

”ایک گروہ جنت میں جائے گا اور دوسرا جہنم میں جائے گا۔“[1]

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ان دونوں گروہوں کا فیصلہ ہو چکا۔

«قَدْ فَرَغَ رَبُّكُمْ مِّنَ الْعِبَادِ»

”تمھارا پروردگار بندوں کے فیصلے کر کے فارغ ہو چکا۔“[2]

«جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَائِنٌ»

”جو کچھ ہونے والا ہے قلم اسے لکھ کر خشک ہو چکے۔“[3]

تو یہ ایک سوال میں نے اٹھایا ہے کہ ہماری جدوجہد کا محور کیا ہونا چاہیے؟ محض دنیا کی طلب؟ دنیا کی ترقی اور کامیابی؟ یا پھر مرنے کے بعد جس عالم میں ہم نے داخل ہونا

[1] الشوریٰ 42:7. [2] السلسلة الصحيحة: 2/347. [3] مسند أحمد: 1/307.

ہے اس کا حصول اور اس کی کامیابی؟ ہماری جدوجہد کا محور کیا ہونا چاہیے؟ دوسرے الفاظ میں ہماری حقیقی کامیابی کیا ہے؟ دنیا کی ترقی، یہ کامیابی ہے یا آخرت کے بلند درجات کا حصول، یہ کامیابی ہے؟ قرآن تو یہ کہتا ہے:

﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ﴾[1]

”(ہماری لسٹ میں) کامیاب وہ ہے جسے جہنم سے بچا لیا جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے۔“

دنیا میں انسان بہت سے مراحل طے کرتا ہے۔ بہت سی کامیابیاں، بہت سی ناکامیاں۔ ان کامیابیوں اور ناکامیوں کو شریعت نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ اصل اہمیت عالم آخرت کی ہے کہ جب عمل کا سلسلہ بند ہو جائے گا اور جزا کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ ایک ایسا جہان جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «لَوْ أَنَّكُمْ تَعْلَمُونَ مَا أَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيلًا وَّلَبَكَيْتُمْ كَثِيرًا» اس جہان میں کیا ہونے والا ہے اور انسان کن کن حالات کا سامنا کرنے والا ہے۔ اس بارے میں جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جان لو تو تم ہنسنا چھوڑ دو۔ اور رونے بیٹھ جاؤ، مستقل رونا شروع کر دو۔ ہنسیاں بند ہو جائیں۔ «وَمَا تَلَذَّذْتُمْ بِالنِّسَاءِ عَلَى الْفُرُشَاتِ» بستروں کی جو نیندیں اور لذتیں ہیں، یہ سب بھول جاؤ۔ اور «وَلَخَرَجْتُمْ إِلَى الصُّعُدَاتِ تَجْأَرُونَ إِلَى اللّٰهِ» اور تم اپنے شہروں کو چھوڑ دو، گھروں اور بستیوں کو چھوڑ دو، دنیا کے اموال اور دنیا کی جن ترقیوں کے تم طالب ہو ان سب کو چھوڑ دو۔ اور کہاں نکل جاؤ؟ جنگلات میں۔ اور مستقل اللہ تعالیٰ کی طرف آہ و زاری کرنے لگو، روتے رہو، اپنا سب کچھ بھول

[1] آل عمرٰن 3:185.

جاؤ، دنیا کے سارے امور بھول جاؤ۔ کب؟ اگر تمھیں اس چیز کا علم ہو جائے جس کا مجھے علم ہے کہ مرنے کے بعد کیا کچھ ہونے والا ہے اور کس قسم کے حالات کا سامنا ہوگا اور کس قسم کی مشکلات سے گزرنا ہوگا اور کیسے کیسے مراحل طے کرنے پڑیں گے۔ [1]
فرمایا کہ تم ان حقائق کو نہیں جانتے: «لَوْلَا أَنْ لَّا تَدَافَنُوا لَدَعَوْتُ اللّٰهَ أَنْ يُّسْمِعَكُمْ مِّنْ عَذَابِ الْقَبْرِ» [2] مجھے اگر یہ خدشہ نہ ہوتا کہ تم اپنے مُردوں کو دفن کرنا چھوڑ دو گے تو میں یہ دعا کرنا چاہتا تھا کہ اللہ تم کو تھوڑا سا عذاب قبر سنا دے۔ لیکن میں نے یہ دعا نہیں کی۔ اگر تم نے تھوڑا سا عذاب قبر سن لیا تو تم اپنے مردوں کو دفن کرنا چھوڑ دو گے۔ کوئی قبرستان جائے گا ہی نہیں۔

یہ سوال جو ہم نے اٹھایا، اس کا کیا جواب؟ تمھاری لغت میں کامیابی کیا ہے؟ دنیا کے یہ جو چھوٹے چھوٹے امور ہیں، یہ کامیابی ہے؟ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ اصل کامیابی کا تعلق اس عالم سے ہے جو مرنے کے بعد ہے۔ جہاں انسان کا اپنا کوئی اختیار نہیں۔ یہاں کچھ اختیارات ہیں۔ ہم کیا کریں، کیا نہ کریں؟ اپنے سرمائے کے بقدر کیسا کاروبار کریں، چھوٹا کریں، بڑا کریں؟ لیکن وہاں تو اللہ تعالیٰ نے قبر کو دو طرح کا بنا رکھا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «إِنَّمَا الْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِّنْ رِّيَاضِ الْجَنَّةِ أَوْ حُفْرَةٌ مِّنْ حُفَرِ النَّارِ» [3] ”یہ قبر یا تو جنت کا باغیچہ بن جاتی ہے یا جہنم کا گڑھا بن جاتی ہے۔“ تو پھر ایک انسان کی جدوجہد کا محور کیا ہوگا کہ وہ اپنی جو مساعیِ حیات ہیں ان کو اپنی قبر بہتر بنانے میں اور اپنی قبر کو سنوارنے میں صرف کرے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ انسان جب دفن ہوتا ہے اور اللہ رب العزت اس کی زندگی کی رپورٹ

[1] صحيح البخاري، حديث:4621، وسنن ابن ماجة: 4190. [2] صحيح مسلم، حديث: 2868. [3] جامع الترمذي، حديث:2460، ضعفهُ الألباني.

ملاحظہ فرماتا ہے تو پھر دو میں سے ایک حکم آتا ہے: «أَنْ قَدْ صَدَقَ عَبْدِي فَأَفْرِشُوهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَأَلْبِسُوهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَافْتَحُوا لَهُ بَابًا إِلَى الْجَنَّةِ» [1] یہ بندہ نیک تھا، اس نے اپنے عقیدے کی، عمل کی اصلاح کر رکھی تھی۔ اسے جنت کا بستر دے دو، جنت کا لباس دے دو اور جنت کا دروازہ اس کی قبر میں کھول دو۔ جبکہ کچھ لوگوں کے لیے یہ ندا ہوگی: ”یہ بندہ برا تھا، بدکار تھا، اس کو جہنم کا لباس پہنا دو اور جہنم کا بستر اس کی قبر میں بچھا دو اور جہنم کا دروازہ کھول دو۔“

جب یہ سارے حقائق ہم جانتے ہیں تو پھر ہماری ان دنیوی کوششوں کا محور کیا ہونا چاہیے؟ پھر اس سوال کا جواب دو کہ کامیابی کیا ہے؟ دنیا کی چند ترقیوں پر خوش ہو جانا یا آخرت کے بلند درجات اور عالمِ آخرت کی کامیابی؟ کس چیز کا نام کامیابی ہے؟ ایک عارضی ترقی کا حصول کامیابی نہیں ہے بلکہ کامیابی تو آخرت کی ہے۔

اَللّٰهُمَّ إِنَّ الْعَيْشَ عَيْشُ الْآخِرَهْ
فَاغْفِرْ لِلْأَنْصَارِ وَالْمُهَاجِرَهْ

رسول اللہ ﷺ نے جنگ خندق کے موقع پر یہ دعا کی تھی۔ جب یہ دیکھا کہ انصار و مہاجرین اپنے پیٹوں پر پتھر باندھ کر خندق کھود رہے ہیں، کھانا ان کے پاس ہے ہی نہیں۔ کئی کئی دن کا فاقہ اور کوئی پروا نہیں۔ دنیا میں پیٹ بھر جانا، یہ کوئی کامیابی نہیں ہے۔ ان کی نظریں تو بلند درجات کی طرف تھیں۔ اور پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا کہ دنیا کی عیش، عیش نہیں ہے، عیش تو آخرت کی ہے۔ یااللہ! ان انصار و مہاجرین کو معاف کر دے، ان کے گناہوں کو معاف کر دے۔ [2]

[1] سنن أبي داود، حديث:4753. [2] صحيح البخاري، حديث:2834.

انصار کی ایک جماعت نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے دعا کرانے کے لیے آئی کہ پانی ہم سے دور ہے، دعا کردیں کہ اللہ تعالیٰ مدینہ شہر میں چشمہ جاری کردے تاکہ ہمیں دور سے پانی لانے کی تکلیف نہ ہو۔ جب نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے انصار کے چہروں پر یہ حاجت پڑھی تو فرمایا کہ آج جو بھی حاجت پیش کرو گے، جو بھی کام بتاؤ گے وہ پورا ہوگا۔ جب انصار نے یہ بات سنی تو دنیا کا یہ درد بھول گئے، اپنے باغات اور کھیتی باڑی بھول گئے اور کچھ سوچنے بیٹھ گئے کہ ہم نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے اتنی بڑی گارنٹی کے بعد کیا طلب کریں؟ انھوں نے بڑی سوچ بچار کے بعد یہ عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! آپ ہمارے لیے دعا کردیں کہ اللہ ہمارے گناہوں کو معاف کردے۔ [1] یہ وہ لوگ ہیں جن کی نظریں دنیا کی ترقیوں کی طرف نہیں ہیں بلکہ اخروی درجات کی طرف ہیں۔ گناہوں کی بخشش اگر حاصل ہوجائے تو آخرت میں کامیابی ہی کامیابی ہے۔ اور گناہ اگر دامن سے چمٹے رہ جائیں تو پھر کامیابی کا تصور بڑا مشکل ہوجاتا ہے۔ پھر بہت سے امور ہیں جن پر اگر توجہ دی جائے تو کامیابی ممکن ہوگی ورنہ کوئی امکان نہیں ہے۔

دراصل مدارس پر جو تنقید ہوتی ہے اور مدارس کے مقابلے میں دنیا کی اس عارضی ترقی نے لوگوں کی آنکھوں کو تو خیرہ کیا ہوا ہے، اس کا سبب یہی ہے کہ یہ نظریں صرف دنیا تک محدود ہیں اور آخرت دکھائی نہیں دے رہی۔ اور جو آخرت کے درجات عُلیٰ (بلندترین درجات) ہیں ان کی کوئی فکر نہیں، کوئی سبیل نہیں، چونکہ دینی مدارس، جیسا کہ آپ نے سنا کہ یہ حفاظتِ عقیدہ اور حفاظت دین کا سب سے مضبوط قلعہ ہیں۔ ان مدارس کے سلیبس میں، ان کے مناہج میں، ان کے نصاب میں جو کتب پڑھائی جاتی

[1] مسند أحمد: 3/139.

ہیں یہ اور کسی ادارے میں داخلِ نصاب نہیں ہیں۔

دیکھیں! سب سے اعلیٰ معیارِ تعلیم یا سب سے اعلیٰ علم وہ ہے جو باعتبار معلوم کے واضح ہوتا ہے کہ جس علم کو حاصل کیا جارہا ہے، اس کا معلوم کیا ہے؟ جتنے بھی دنیاوی مدارس ہیں، یونیورسٹیاں یا کالج یا سکول ہیں، ان کے علم کا معلوم دنیا کی چیزیں ہیں۔ کسی علم کا معلوم میڈیکل ہے، کسی کا سائنس ہے، کسی کا انجینئرنگ ہے اور کسی علم کا معلوم زراعت ہے۔ یہ سب چیزیں کیا ہیں۔ لوگو سوچو! تم ان چیزوں کے حصول کو ترقیِ کل سمجھتے ہو کہ زراعت کی ڈگری مل جائے، کامیابی ہے۔ میں ڈاکٹر بن جاؤں، کامیابی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ ایک بڑا احساس کمتری ہے اور بڑی گھٹیا سوچ ہے۔ بس میں انجینئر بن جاؤں کامیابی ہے۔ کون سی کامیابی ہے؟ یہ چند ٹکوں کی ایک عارضی کامیابی ہے۔ تم اس زعم میں کیوں مبتلا ہو؟ یہ کامیابی تھوڑی ہے۔ ہمارے نزدیک کامیابی اس چیز کا نام ہے جو آخرت کی فلاح پر منتج ہو۔ ہمارے علم کا جو معلوم ہے وہ خالقِ کائنات ہے۔ ہمارے علم کا معلوم عقیدہ ہے، نماز ہے، حج ہے، روزہ ہے، زکاۃ ہے۔ ہمارے علم کا معلوم آخرت ہے، فلاح آخرت ہے۔ تو اس چیز کا مقابلہ کوئی چیز کرسکتی ہے؟

کیا تمھاری یہ صنعتیں، یہ حرفتیں اور یہ دنیاوی علوم اس علم کا مقابلہ کرسکتے ہیں جس علم کا معلوم خالقِ کائنات کے اسماء وصفات ہوں۔ رب کیا ہے؟ مالک کیا ہے؟ خالق کیا ہے؟ اس کی صفات کا تعارف، اس کی توحید کی معرفت، کس کی نماز درست ہے، کس کی نماز غلط ہے۔ یہ ہمارے علم کا معلوم ہے۔

اور علم کی قدر باعتبار معلوم کے ہے۔ جس علم کو تم کامیابی سمجھتے ہو اس کا معلوم صرف دنیا تک محدود ہے۔ بہت تھوڑے لوگ ہیں جن کی نیتوں میں استقامت ہوتی

ہے اور وہ اپنے اس علم کو اس علم کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں، لیکن یہ بہت تھوڑے لوگ ہیں۔ باقی سب لوگوں کی نگاہوں میں دنیا کا ایک مستقبل ہے، دنیا کا کیریئر ہے۔ دنیا کی ترقی، دنیا کی دولت اور دنیا کا مال ہے۔ اور اسی کو کامیابی سمجھا جاتا ہے۔ ہم درویش اسے کامیابی نہیں سمجھتے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ایک شخص اگر خالقِ کائنات کی توحید کو نہیں جانتا اور وہ دنیاوی اعتبار سے وزیراعظم ہے، ہم اسے گٹر میں چلنے والے کیڑے سے بدتر سمجھتے ہیں۔ جو اپنے خالق کو نہیں جانتا وہ عہدے میں گورنر بن جائے، صدر بن جائے، بڑا سائنس دان بن جائے، کسی چیز کا موجد بن جائے، اگر رب کائنات کی توحید کو نہیں جانتا اور اللہ کے اسماء و صفات کا تعارف نہیں رکھتا تو پھر یہ کیڑے مکوڑے اس سے بہتر ہیں۔ اللہ فرماتا ہے کہ ﴿أُولَٰئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ○﴾[1] جن لوگوں کے پاس ایمان نہیں، عمل صالح نہیں، پروردگار کی توحید کی معرفت نہیں یہ لوگ ساری مخلوقات میں سب سے بدتر ہیں۔

﴿وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ ○ وَطُورِ سِينِينَ ○ وَهَٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ ○ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ○ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ○﴾ اس انسان کو ہم نے بڑا اشرف بنایا، اچھی خلقت دی، اسی انسان کو ہم نے پستی کی ذلت میں ڈال دیا۔ سوائے ان لوگوں کے ﴿إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ جن کا عقیدہ مستقیم، جن کو توحید کی معرفت حاصل ہو ﴿وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾ اور وہ نیک عمل کرتے ہوں۔[2] ان کا اجر ناقابل انقطاع ہے۔ ان کو بڑا اجر ملے گا اور یہ لوگ کامیاب ہیں۔ اور اگر ایمان اور عمل صالح نہیں ہے تو کچھ بھی ہو وہ اسفل السافلین میں ہے۔ ذلت کی تہوں میں، ذلت کی پستیوں

[1] البينة 6:98۔ [2] التين 1:95-6۔

میں، انتہائی ذلتوں میں۔ اب یہ عقیدہ، یہ ایمان و عمل آپ کو کہاں سے حاصل ہوگا؟ ہم نے تو ایم۔ اے اور جو گورنمنٹ کی یونیورسٹیاں ہیں ان کے پی۔ ایچ۔ ڈی کا نصاب دیکھا بالکل سطحی، سطحی بالکل۔ یہ چند احادیث کا انتخاب، چند سو آپ کر لیجیے، اس سے زیادہ نہیں۔ ایک سطحی سا علم ہے۔ وہ بھی صرف فضائل تک محدود ہے۔

ہمارے ان مدارس میں، اپنے اس معہد (المعهد السّلفي) کی بات کر رہا ہوں، جو آٹھ سال کا نصاب ہے۔ اس میں ہم کم و بیش پچیس ہزار حدیثیں طلبہ کو پڑھاتے ہیں۔ پورا صحاح ستہ: صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داود، جامع الترمذی، سنن النسائی، ابن ماجہ، موطا امام مالک۔ ان کا مجموعہ تقریباً پچیس ہزار حدیثیں بنتا ہے۔ ہر سال عقیدے کی کتاب ہے جس میں اسلامی عقائد پر بحث ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء، اس کی صفات، توحید ربوبیت، توحید الوہیت، عقیدۂ آخرت اور دیگر ضروری امور پڑھائے جاتے ہیں۔ تو پھر یہ مدارس طلباء کو وہ روحانی غذا دے رہے ہیں جس کا مقابلہ تمھاری کوئی جامعہ، کوئی یونیورسٹی نہیں کر رہی۔ دنیا کے یہ علوم مدار فلاح نہیں ہیں اور نہ یہ مدار فخر ہی ہیں۔ جو لوگ اس کامیابی کو کامیابی سمجھتے ہیں، اس پر فخر کرتے ہیں اور اسی پر اکتفا اور قناعت کرتے ہیں وہ انتہائی پست سوچ کے حامل ہیں۔ ان کی فکر انتہائی کوتاہ ہے اور وہ احساس کمتری میں مبتلا ہیں۔

دیکھیں رسول اللہ ﷺ کے دور میں کھجوروں کی تلقیح کا ایک مسئلہ درپیش ہوا۔ آپ مدینہ تشریف لائے تو انصار کو دیکھا کہ وہ کھجوروں کی تلقیح کرتے ہیں، پیوندکاری کرتے ہیں تو آپ نے روک دیا کہ تم تلقیح نہ کرو۔ جس طرح ہیں اسی طرح ان کے پھل کو آنے دو۔ صحابہ نے رسول اللہ ﷺ کی ہدایت پر پیوندکاری چھوڑ دی۔ جب فصل پیدا

ہوئی تو بہت تھوڑی ہوئی۔ صحابہ نے نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہم نے آپ کے مشورے سے تلقیح چھوڑ دی تھی، لیکن پھل بہت کم ہوا ہے۔ تب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ» [1] یہ دنیا کے امور تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ ان امور کو تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ اگر دنیا کے علوم بہتری کی اساس ہوتے اور دنیا کے علوم اس قدر فخر کے حامل ہوتے، جو کیا جاتا ہے، تو پھر کیا کہو گے کہ صحابہ نعوذ باللہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے افضل تھے۔ علم زراعت، ایگری کلچرل کا نبی علیہ الصلاۃ والسلام کو علم نہیں، صحابہ کو تھا۔ حالانکہ یہ وہ سائنس ہے، وہ علم ہے جو ہماری مادی ضرورت ہے۔ یہ کھیتی باڑی، یہ باغات ہماری مادی ضرورت ہے۔ ایٹم بم ہو نہ ہو، گزارا ہوسکتا ہے۔ کتنے ملک ہیں جن کے پاس ایٹم بم ہے اور بے شمار ممالک ایسے ہیں جو اس طاقت سے محروم ہیں۔ گزارا سب کا ہو رہا ہے۔ ایٹم بم کے بغیر گزارا ہوسکتا ہے لیکن کھائے پیے بغیر گزارا نہیں ہوسکتا۔ یہ ایگری کلچرل کا علم کتنا اہم ہے، مگر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس معاملے میں تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ اگر یہ امور بہتری کی بنیاد ہوتے تو پھر صحابہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے افضل ہیں، لیکن نعوذ باللہ، ہرگز نہیں۔ کیونکہ بہتری کی اساس، بلندیِ درجات کی اساس اور کامیابی کی اساس دین ہے نہ کہ دنیا۔ تو حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ جس اساس پر مدارس پر تنقید کرتے ہیں وہ صرف دنیا کی کامیابی کو کامیابی سمجھتے ہیں۔

چند دن پہلے جنگ اخبار میں ایک کالم چھپا تھا۔ کالم نویس کا نام حسن نثار ہے۔ اس نے ایک سوال اٹھایا تھا کہ قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک ان دینی مدارس نے پاکستان کو کیا دیا؟ اس شخص کی یہ سوچ بڑی گھٹیا ہے۔ یہ شخص ایک بڑے احساس کمتری

[1] صحیح مسلم، حدیث: 2363.

میں مبتلا ہے، یا پھر اندھا ہے جسے نظر نہیں آتا کہ ان مدارس کا پاکستان نہیں دنیا پر کیا احسان ہے۔ ان کے کیا نتائج ہیں؟ اور ان سے کیا ثمرات حاصل ہو رہے ہیں؟

اللہ کے بندو! اس کائنات میں سب سے قیمتی چیز علم نافع ہے۔ دین کے علم کا مقابلہ کوئی چیز نہیں کرسکتی۔ دنیا کی ساری ترقیاں، ساری دولتیں جمع ہو جائیں، میرے پیارے پیغمبر ﷺ کی ایک حدیث کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ جناب حسن بصری رحمہ اللہ بہت بڑے تابعی ہیں، فرمایا کرتے تھے: میں علم کا ایک باب پڑھ لوں، صرف علم کا ایک باب، کوئی ایک حدیث پڑھ لوں اور آگے پڑھا دوں، یہ میرے لیے بہتر ہے کہ اللہ مجھے پوری دنیا دے دے اور میں پوری دنیا اللہ کی راہ میں خرچ کردوں۔ صبح سے شام تک سونے کے سکے بانٹتا رہوں، درہم و دینار بانٹتا رہوں۔ صبح سے شام ہو جائے اور شام سے رات ہو جائے، بانٹتا رہوں اور ایک طالب علم ایک بار «قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ» کہہ دے، وہ بہتر ہے۔ اس علمِ دین کا مقابلہ کوئی چیز نہیں کرسکتی۔ کوئی نیکی نہیں کرسکتی۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہر چیز کی صحت علم کی صحت پر قائم ہے۔ تمھاری توحید کب درست ہوگی؟ جب توحید کے تعلق سے تمھارا علم درست ہوگا۔ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ﴾ [1] یہاں کیا پیغام ہے؟ کہ لا الہ الا اللہ کو پہچانو۔ ﴿فَاعْلَمْ﴾ ”جانو۔“ پہلے علم ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: «اَلْعِلْمُ قَبْلَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ» قول اور عمل سے پہلے علم ہے۔ آپ کا قول درست کب ہوگا؟ جب اس قول کے تعلق سے آپ کا علم درست ہے۔ آپ کا عمل درست کب ہوگا؟ جب اس عمل کے تعلق سے آپ کا علم درست

[1] محمد 47:19.

ہے۔ نماز صحیح کب ہوگی؟ جب نماز کے تعلق سے آپ کا علم درست ہے۔ آپ حج کرنے جارہے ہیں۔ صحیح حج کرکے کب لوٹیں گے؟ جب حج کے تعلق سے آپ کا علم درست ہے۔ آپ جہاد کررہے ہیں، جہاد صحیح کب ہوگا؟ جب جہاد کے تعلق سے آپ کا علم درست ہے۔ تو علم ہر چیز سے مقدم ہے، ہر چیز سے پہلے ہے، ہر عمل سے پہلے، ہر قول سے پہلے اور ہر عقیدے سے پہلے ہے، اگر یہ علم نہیں ہے تو بڑا اختلاف اور اضطرار ہوگا، بڑی ناکامیاں، نامرادیاں، ذلتیں اور پستیاں ہوں گی۔ مثال کے طور پر بغیر علم کے آپ کوئی بات کہہ دیں۔ اللہ پاک کا فرمان ہے: ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ [1] تمھاری زبان سے جو کلمہ صادر ہوتا ہے اسے نوٹ کرنے والے فرشتے موجود ہیں۔ وہ کلمہ نوٹ ہوگیا۔ اب یہ نہ سمجھو کہ یہ کلمہ ہوا میں تحلیل ہوگیا۔ وہ کلمہ لکھا جا چکا ہے۔ روز قیامت اللہ نے اس کلمے کے بارے میں سوال کرنا ہے۔ اللہ باز پرس کرے گا، اللہ پوچھے گا۔ وہ کلمہ اگر شرعی میزان کے خلاف ہے تو اس کی بڑی سخت پکڑ ہوسکتی ہے۔

نبی ﷺ کی ایک حدیث ہے۔ آپ ﷺ نے معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: «كُفَّ عَلَيْكَ هٰذَا» اے معاذ! یہ زبان پورے دین کی ملاک ہے، پورے دین کا کنٹرول زبان کے پاس ہے۔ معاذ رضی اللہ عنہ متعجب ہوئے کہ یارسول اللہ! یہ چھوٹی سی زبان اور پورے دین کی ملاک؟ اس میں عقیدہ، توحید، نماز، روزہ، قیام اللیل، صدقات، زکاتیں یہ زبان پورے دین کی ملاک ہے؟ فرمایا کہ «ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ يَا مُعَاذُ!» معاذ! تیری ماں تجھے گم پائے۔ «وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ فِي النَّارِ عَلٰى مَنَاخِرِهِمْ إِلَّا حَصَائِدُ أَلْسِنَتِهِمْ» [2]

[1] قٓ 18:50. [2] جامع الترمذي، حديث: 2616.

تجھے معلوم نہیں کہ لوگوں کو جہنم میں اوندھا کرکے ڈالنے والی چیز زیادہ تر زبان ہے۔ لوگ زیادہ تر جہنم میں کیوں جائیں گے؟ اپنی زبانوں کی وجہ سے۔ تو زبان کا استعمال کب صحیح ہوگا، جب زبان کے استعمال کے تعلق سے علم صحیح ہوگا؟ اگر علم صحیح نہیں تو زبان میں انحراف، ایسا انحراف جو ایک بندے کی تمام نیکیوں کو برباد کرسکتا ہے۔

صحیح مسلم کی حدیث ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «وَ إِنَّ رَجُلًا لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ» ”ایک شخص جنت والے کام کرتا ہے۔“ «حَتّٰى لَا يَبْقٰى بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجَنَّةِ إِلَّا شِبْرًا» ”حتی کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک بالشت کا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے۔“ نمازیں پڑھ پڑھ کے، قیام اللیل کرکر کے، اچھے عقیدے کی برکت سے جہاد کرکے وہ جنت کے دہانے پر پہنچ چکا ہے۔ «ثُمَّ يَتَكَلَّمُ بِكَلِمَةٍ» وہاں پہنچ کے ایک ایسا بول بولتا ہے کہ «يَهْوِي بِهَا سَبْعِينَ خَرِيفًا فِي النَّارِ» وہ ایک ہی بول اس کو جہنم میں ستر سال نیچے پھینک دیتا ہے۔ [1] کتنی بڑی وعید ہے۔ تو اگر زبان کی استقامت نہیں۔ زبان کی استقامت کس کو حاصل ہے؟ جس کا زبان کے امور کے تعلق سے علم صحیح ہے۔ تو علم ہر چیز سے پہلے ہے۔

اہل علم کی شان

اسی لیے محمد رسول اللہ ﷺ نے اہل علم کی شان بیان کی اور ان کو جو مقام حاصل ہے اس کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ آخرت کی کامیابی اور جنت کا حصول، صرف علم پر قائم ہے۔ یہ حدیث آپ ﷺ نے بیان فرمائی: «مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَلْتَمِسُ فِيهِ

[1] صحيح مسلم، حديث: 2988، وجامع الترمذي، حديث: 2314.

عِلْماً سَهَّلَ اللّٰهُ لَهُ طَرِيقًا إِلَى الْجَنَّةِ» [1] جو شخص ایک راستے پر چلے، یہ راستہ کہاں جارہا ہے؟ علم کی طرف، دینی درسگاہ کی طرف، کسی مدرسے کی طرف، کسی شیخ کی طرف، شیخ بھی مدرسہ ہے، مدرسہ ان اینٹوں اور دیواروں کا نام نہیں ہے۔ مدرسہ مشائخ اور علماء کا نام ہے۔ کسی عالم کے پاس جائے، کسی درسگاہ میں جائے۔ کس لیے؟ «يَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا» علم کی تلاش میں، علم کی طلب میں۔ تو اللہ تعالیٰ کیا کرتا ہے؟ «سَهَّلَ اللّٰهُ لَهُ طَرِيقًا إِلَى الْجَنَّةِ» اللہ تعالیٰ اس کا جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے۔

اس سے کیا ثابت ہورہا ہے؟ کہ جو علم کا راستہ ہے وہ جنت کا راستہ ہے۔ یہ راستہ درسگاہ کا نہیں جنت کا ہے۔ اتنا اونچا مقام۔ اس سے کیا ثابت ہورہا ہے؟ کہ جو شخص چلتا ہے طلب علم کے لیے، جنت اس کے لیے ہے۔ جو طلب علم کے لیے چلتا ہے اور چل کر کہاں جاتا ہے؟ کسی شیخ کے پاس، کسی عالم کے پاس، کسی درسگاہ میں، کسی ادارے میں اور کہاں جاسکتا ہے طلب علم کے لیے؟ تو وہ جنت میں داخل ہوگا، یعنی جنت کا راستہ ان دو چیزوں پر قائم ہے۔ ایک چلنے یا سفر کرنے پر اور دوسرا یہ سفر کرنا اور چلنا منتج ہو کسی درسگاہ کی طرف۔ اس کا مفہومِ مخالف کیا ہے؟ کہ جو شخص نہیں چلتا، درسگاہ کی طرف نہیں جاتا، طلب علم کی طرف نہیں آتا وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہو سکتا، یعنی جنت کا راستہ علم کا راستہ ہے، جہل کا راستہ نہیں ہے۔ جہل کا راستہ جنت کا راستہ نہیں ہے۔ جو شخص جہل پر قائم ہے، جنت میں داخل نہیں ہوسکتا۔ جنت کا داخلہ علم پر قائم ہے۔ کتنی بڑی شان اور فضیلت ہے۔

[1] جامع الترمذي، حديث:2646.

سلف صالحین کا حصول علم کے لیے سفر

ہم حیران ہوتے ہیں کہ ہمارے سلف صالحین طلب علم کے لیے کس قدر چلا کرتے اور سفر کیا کرتے تھے۔ ابودرداء رضی اللہ عنہ، نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے صحابی، کا قول ہے: «لَوْ أَشْكَلَتْ عَلَيَّ آيَةٌ» اگر قرآن پاک کی کسی ایک آیت کا فہم مجھ پر مشکل ہوجائے، صرف کسی ایک آیت کا۔ یہ چھ ہزار دو سو سے زائد آیتیں ہیں۔ سب آتی ہیں۔ کوئی ایک آیت سمجھ میں نہیں آرہی «عَلِمْتُ أَنَّ مَنْ يَفْتَحُهَا عَلَى بَرْكِ الْغِمَادِ» اور اگر مجھے یہ بات معلوم ہوجائے، اس آیت کو کھولنے والا اور اس کی تفسیر کو واضح کرنے والا شخص اس وقت ایک ہی ہے اور وہ برک الغماد میں، یعنی یمن کے آخری کونے میں بیٹھا ہوا ہے۔ «لَرَحَلْتُ إِلَيْهِ» اس آیت کو سمجھنے کے لیے میں سفر کرکے اس کے پاس جاؤں گا۔ ایسا کیوں؟ اللہ کے بندو! یہ سفر کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ اگر سمجھتے ہو کہ گھر بیٹھے کتابیں پڑھ کر دین حاصل ہوجائے گا تو تمھاری بھول ہے۔ جو لوگ خود کتابیں خریدتے ہیں، پڑھتے ہیں اور مرضی کا سمجھتے ہیں وہ «ضَلُّوا فَأَضَلُّوا» کی تفسیر ہیں۔ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور لوگوں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ ایسی کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ ایسے بہت سے کُتّاب (کتابیں پڑھنے والے) جو مدارس ہی نہیں گئے، ہوسکتا ہے ان میں کبر ہے کہ میں مدرسے میں جاؤں، مدرسے میں تو غرباء اور فقراء آتے ہیں۔ پسماندہ لوگ آتے ہیں، میں وہاں جاؤں۔ میرے پاس مال ہے، کتابیں خریدتا ہوں اور گھر بیٹھ کے پڑھتا ہوں۔ ایسے لوگ کبھی علم حاصل نہیں کرسکتے۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے: «اُغْدُ عَالِمًا أَوْ مُتَعَلِّمًا أَوْ مُسْتَمِعًا» اور ایک

روایت ہے: «أَوْ مُحِبًّا لَّهُمْ وَلَاتَكُنْ خَامِسًا فَتَهْلِكُ» ”عالم بن جاؤ یا علماء سے پڑھنے والا بن جاؤ، ان کے پاس جاؤ، جاکے بیٹھ جاؤ اور پڑھو «أَوْ مُسْتَمِعًا» یا علماء کے دروس سننے والا بن جاؤ یا ان سے محبت کرنے والا بن جاؤ۔ «وَلَا تَكُنْ خَامِسًا» پانچویں کوئی چیز نہ بنا «فَتَهْلِكُ» ورنہ برباد ہو جاؤ گے، ہلاک ہوجاؤ گے۔“ [1] «إِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ» یہ نبی ﷺ کی حدیث ہے حسن سند کے ساتھ فتح الباری میں کہ علم کتابیں پڑھنے سے نہیں آتا۔ علم علماء سے سیکھنے سے آتا ہے۔ [2] اس لیے دیکھو ہمارے سلف صالحین ایک ایک مسئلے کی خاطر لمبے سفر کرتے۔ جناب جابر ﷛ مدینے سے شام گئے۔ مظالم کے بارے میں نبی ﷺ کی ایک حدیث کے بارے میں سنا ہوگا، انھوں نے وہ حدیث خود نہیں سنی۔ حدیث کا متن موجود تھا لیکن وہ چاہتے تھے کہ یا تو نبی ﷺ سے سنتے یا اس سے جس نے نبی ﷺ سے سنی ہو، چنانچہ جب معلوم کیا تو پتہ چلا کہ جب نبی ﷺ نے یہ حدیث بیان کی تھی اس مجلس میں فلاں تھا، فلاں تھا، فلاں تھا، سوائے ایک صحابی کے سب فوت ہو چکے ہیں۔ عبداللہ بن انیس ﷛ اس وقت شام میں ہیں۔ مدینے سے شام کی طرف نکلے، ایک مہینے کا سفر کیا۔ عبداللہ بن انیس کے پاس پہنچے۔ نوکر کو اطلاع دی کہ جاؤ عبداللہ سے کہو کہ جابر ملنے آیا ہے۔ نوکر دوبارہ آیا کہ کون جابر؟ جابر تو بہت ہیں۔ کیا تم جابر بن عبداللہ انصاری ہو؟ کہا کہ جی ہاں۔ عبداللہ بن اُنیس ﷛ اپنے گھر سے بھاگے بھاگے باہر نکلے۔ نبی ﷺ کے اتنے بڑے صحابی۔ اور جابر ﷛ کا شمار مکثرین میں ہے، یعنی وہ صحابہ جن کی روایات بہت زیادہ ہیں۔

مکثرین صحابہ دس بارہ ہیں جن میں ابو ہریرہ ﷛ کا نام ہے، ابن عمر ﷠، جابر ﷛،

[1] شعب الإيمان: 265/2. [2] فتح الباري: 161/1.

ابن عباس، عائشہ صدیقہ، عبداللہ بن عمرو بن عاص ﷡ کا نام ہے۔ ان کا نام مکثرین میں شمار ہوتا ہے۔ اتنے زیادہ علم کے باوجود ایک حدیث سننے کے لیے ایک مہینے کے فاصلے پر مدینے سے شام گئے۔ یہ سفر صرف ایک حدیث کو حاصل کرنے کے لیے ایک درسگاہ کی طرف تھا۔ [1] ابوایوب انصاری ﷛ مدینے سے گئے، کہاں؟ مصر۔ اور سترِ مومن کے بارے میں ایک حدیث سننے کے لیے، صرف ایک حدیث سننے کے لیے۔ [2] کیونکہ وہ قدر ومنزلت کو جانتے تھے کہ یہ مقام کیا ہے: «مَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَّلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا» کہ جو طلب علم کی راہ پر چلے وہ جنت کی راہ پر چل رہا ہے۔ وہ درسگاہ کی طرف جارہا ہے، کسی شیخ کی طرف جارہا ہے؟ نہیں، جنت کی طرف جارہا ہے۔ اتنا اونچا مقام کہ جس تک رسائی حاصل کرنے والا درحقیقت جنت کا مسافر ہے۔ جنت کا طالب ہے۔

عامر الشعبی ایک حدیث روایت کرتے ہیں اور اپنے شاگرد سے کہتے ہیں: «خُذْهَا بِغَيْرِ شَيْءٍ» تم یہ حدیث لے لو کسی مشقت کے بغیر، کسی محنت کے بغیر۔ «قَدْ كَانَ الرَّجُلُ يَرْحَلُ فِيمَا دُوْنَهَا إِلَى الْمَدِينَةِ» ہم تو اس سے بھی چھوٹی حدیث کو حاصل کرنے کے لیے بغداد سے مدینے جایا کرتے تھے۔ [3] یہ ہے: «مَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا» ایک راہ پر چلتا ہے۔ یہ طریق طریق مدرسہ ہے جس پر آپ تنقیدیں کرتے ہیں۔ جہاں سے علم نافع حاصل ہوتا ہے۔ یہ جنت کا راستہ ہے۔ اس کا دوسرا معنی جو اس راہ پر نہیں چلتا اور طلب علم نہیں کرتا وہ جنت میں داخل نہیں ہوسکتا۔ جنت کا راستہ علم نافع پر قائم ہے اور یہ علم نافع قرآن وحدیث کا علم ہے جو خالص آپ کو کہاں سے ملے گا؟ صرف ان مدارس سے اور کہیں سے نہیں۔ کوئی اور راستہ ہے تو بتائیے۔

[1] أسد الغابة: 82/2. [2] جامع بيان العلم و فضله: 84/1. [3] صحيح البخاري، حديث: 5083، و جامع بيان العلم وفضله: 83/1.

صرف کتابوں سے علم حاصل کرنا

نبی علیہ الصلاۃ والسلام کا فرمان ہے اور جو آپ کا فرمان ہے اسی فرمان کے مطابق حصولِ علم ہو۔ «تَسْمَعُونَ مِنِّي وَيُسْمَعُ مِنْكُمْ وَيُسْمَعُ مِمَّنْ يَسْمَعُ مِنْكُمْ» [1] یہ علم تم مجھ سے سنتے ہو اور تم سے آگے لوگ سنیں گے اور ان سے آگے لوگ سنیں گے اور یہ سماع کا سلسلہ قیامت تک قائم رہے گا۔ تو علم استماع کے ساتھ ہے۔ مشائخ اور علماء کے پاس جانا اور ان سے علم حاصل کرنا۔ سلف صالحین ایسے لوگوں پر جرح کرتے تھے جس کا کوئی شیخ نہ ہو۔ امام ذہبی نے ایک عالم کا ذکر کیا ہے اور اس پر جرح کی اور جرح کے الفاظ یہ ہیں کہ «لَمْ يَكُنْ لَهُ شَيْخٌ» ''اس کا کوئی شیخ نہیں تھا۔'' [2]

امام اوزاعی ؒ امام مالک ؒ کے استاد ہیں۔ فرمایا کرتے تھے: «كَانَ هٰذَا الْعِلْمُ كَرِيمًا» یہ علمِ حدیث بڑا عزیز، بڑا محترم اور بڑا باوقار تھا۔ «فَلَمَّا دَخَلَ فِي الْكُتُبِ» حتی کہ کتابوں میں داخل ہو گیا۔ تحریر میں آ گیا۔ پہلے سینوں میں محفوظ تھا۔ ایک سینے سے نکلتا، دوسرے میں منتقل ہو جاتا۔ حتی کہ کتابوں میں شفٹ ہو گیا۔ «فَدَخَلَ فِيهِ غَيْرُ أَهْلِهِ» ''جب کتابوں میں داخل ہوا تو بہت سے نااہل علم میں داخل ہو گئے۔'' [3]

جب تک سینوں میں تھا بڑا محترم تھا، جب کتابوں میں داخل ہوا تو بہت سے نااہل اس میں داخل ہو گئے۔ اس کا کیا معنی؟ کتابوں میں اس علم کے داخل ہونے سے نااہل لوگ کیسے آ گئے؟ کتابوں سے استفادے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ہے استفادہ بالنص کہ انسان خود ہی کتاب لے لے اور خود ہی پڑھے، اپنی مرضی کا سمجھے۔ یہ نااہل ہے۔

[1] مسند أحمد: 321/1. [2] تاريخ الإسلام للذهبي: 25/10. [3] سير أعلام النبلاء: 114/7.

اس کو علم حاصل نہیں ہو گا۔ اور ایک وہ شخص جو علماء کی مدد سے کتابیں پڑھتا ہے۔ جہاں کوئی اشکال آ جائے بجائے اس کے کہ اپنی عقل کے گھوڑے دوڑائے، علماء سے رابطہ کرتا ہے، ان سے سوال کرتا ہے، ان سے اس علم نافع کے بارے میں پوچھتا ہے۔ آپ کتب کا ڈھیر لگا لیں، ان کتب کا فہم علماء کے بغیر ممکن نہیں۔ تو علم نافع کا حصول ان مدارس کا مرہونِ منت ہے اور تمام تر فضائل اسی اساس پر قائم ہیں، یعنی رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا کہ جنت کا راستہ اس راہ پر چلنے میں ہے۔ «مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا» جو طلب علم کے لیے ایک راہ پر چلے۔ اس کا ایک معنی اور بھی ہے۔ ایک معنی ہے چلنا «اَلْمَشْيُ بِالْأَقْدَامِ» کہ چل کر جانا، طلب علم کے لیے اپنے قدموں سے چل کر جانا۔ اس کا ایک معنی اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ طلب علم کا راستہ جو بھی ہے اس کو اختیار کرے۔ وہ راستہ کیا ہے؟ علماء سے ملنا، علماء سے پڑھنا، حفظ کرنا، سمجھنا، یاد کرنا اور لکھنا۔ جو بھی طلب علم کا راستہ ہے اس راستے کو اختیار کرے تاکہ علم نافع کو پا لے۔ تو فرمایا کہ وہ جنت کا راستہ ہے۔

دنیا چاند پر اور تم......

رسول اللہ ﷺ نے فارس کا ذکر کیا۔ فرمایا: «لَوْكَانَ الْإِيمَانُ بِالثُّرَيَّا لَتَنَاوَلَهُ رِجَالٌ مِّنْ هٰؤُلَاءِ» [1] اگر دین ثریا پر ہو، ثریا سب سے اونچا ستارہ۔ ثریا پر ہو گا تو قوم فارس کے کچھ لوگ وہاں پہنچ کر اس علم کو حاصل کریں گے۔ وہاں تک جائیں گے، وہاں پہنچ کر علم کو حاصل کریں گے۔ یعنی ان کا ثریا تک جانا یہ سفر کس کا ہے؟ لوگ ہمیں طعنہ

[1] جامع الترمذي، حديث: 3933، ومشكل الآثار للطحاوي: 239/5.

دیتے ہیں کہ دنیا چاند پر پہنچ گئی اور تم ابھی تک استنجا کے مسائل میں الجھے ہوئے ہو۔ دنیا چاند پر پہنچ گئی ہے۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ چاند پر پہنچنا کمال نہیں ہے۔ صحیح استنجا کرنا کمال ہے۔ اگر کوئی چاند پر جائے یا نہ جائے اس سے اللہ نے سوال نہیں کرنا لیکن کسی کا استنجا اگر صحیح نہیں ہوگا تو آؤ نبی علیہ السلام کی ایک حدیث سنیں! آپ ایک قبر کے پاس سے گزرے تو آپ نے فرمایا کہ یہ جو دو قبریں ہیں: «إِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ» ان دونوں قبروں میں عذاب ہو رہا ہے۔ «وَمَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيرٍ» اور ان کے عذاب کا سبب کوئی بڑا گناہ نہیں ہے، گناہ بھی چھوٹا ہے، یعنی چھوٹا سمجھتے تھے۔ گناہ کبیرہ ہے، لیکن یہ چھوٹا سمجھتے تھے۔ ان میں سے ایک چغل خور تھا اور دوسرا صحیح استنجا نہیں کرتا تھا۔ [1] اس کے کپڑے ناپاک رہتے۔ جسم ناپاک رہتا۔ اسے صحیح استنجا کرنا نہیں آتا تھا۔ اب اگر کوئی چاند پر نہیں گیا، اس کو قبر میں عذاب ہوگا کہ چاند پر کیوں نہیں گیا تھا؟ تو اتنا بدو تھا کہ تو چاند پر نہیں گیا۔ تو چڑھا ہی نہیں چاند پر۔ اس کو عذاب ہوگا؟ اس سے کوئی سوال ہوگا؟ نہیں ہوگا۔ پھر جس کا استنجا صحیح نہیں اس کو اللہ نے پکڑ لیا، دبوچ لیا اور قبر میں اس کو عذاب ہو رہا ہے۔ تو صحابہ کرام کی سوچ کیا تھی کہ دین کیا کہہ رہا ہے۔ ثریا تک جانے میں کس چیز کا کمال ہے کہ لوگ ترقی یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ثریا تک پہنچ جائیں۔ بھئی کیوں پہنچ جائیں؟ اس کا علم نہیں۔ لیکن رسول اللہ ﷺ فرما رہے ہیں کہ ہماری ترقی کا محور یہ ہے کہ ثریا میں اگر دین کا علم ہے تو پھر ہم وہاں جائیں گے تا کہ دین کے علم کو حاصل کریں۔ یہ شریعت کی سوچ ہے۔ تمھاری سوچ یہ ہے کہ ہم ثریا تک پہنچ جائیں۔ کیوں پہنچ جائیں؟ یہ کسی کو پتہ نہیں۔ ہماری ترقی یہ ہے کہ ہم ثریا تک جائیں

[1] صحیح البخاري: 218.

جب ہم کو علم ہو کہ وہاں پر دین کا علم موجود ہے۔ فرمایا کہ علم اگر ثریا پر ہوگا تو اس فارس کے لوگ وہاں پر بھی جائیں گے تا کہ وہاں سے علم حاصل کر کے آجائیں۔ یہ علم کی شان ہے۔ صحابہ علم کے مقام سے مرعوب ہوتے تھے نہ کہ ثریا تک جانے سے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فکر

نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث ہے۔ آپ نے دجال کا ذکر کیا۔ فرمایا کہ قرب قیامت جب دجال جب آئے گا، اس وقت کے سارے دن تمھاری دنیا کے عام دنوں کے برابر ہوں گے لیکن «يَوْمٌ كَسَنَةٍ» ایک دن ان میں ایسا ہوگا جو ایک سال کے برابر ہوگا۔ «وَيَوْمٌ كَشَهْرٍ» اور ایک دن ایک مہینے کے برابر ہوگا۔ «وَيَوْمٌ كَجُمُعَةٍ» اور ایک دن ایک ہفتے کے برابر ہوگا۔ باقی سارے دن تمھارے عام دنوں کے برابر ہوں گے۔ اب یہ ایک عجیب مسئلہ سامنے آگیا کہ ایک دن پھیل کر ایک سال کا ہوگیا۔ تعجب کی بات تو ہے لیکن صحابہ کی نگاہ اس پر نہیں تھی۔ بس اللہ کے نبی نے بتادیا، پتھر پر لکیر ہے۔ اب وہ ایک سال کے برابر ایک دن آکر رہے گا۔ وہ کیسے ہوگا؟ اس کی کیا سائنسی توجیہ ہے؟ صحابہ نے کچھ سوال نہیں کیا۔ پوچھا تو کیا پوچھا؟ یارسول اللہ! وہ دن اگر ہم نے پالیا تو ہم نماز کیسے پڑھیں؟ جن کی نگاہیں آخرت پر ہیں، بلند درجات کے حصول پر مرکوز ہیں۔ یہ ہے ان کا فلاح کا پروگرام۔ یہ سوال نہیں کیا کہ یہ کیسے ہوگا؟ کوئی اس کی منطقی یا سائنسی توجیہ کریں تا کہ یہ بات ہماری عقل میں آئے، نہیں۔ ضرور ہوگا۔ پیارے پیغمبر نے فرمادیا، پتھر پر لکیر۔ وہ دن آکر رہے گا، لیکن سوال کیا: اگر ہم نے پالیا تو ہم نماز کیسے پڑھیں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”تم وقت کا اندازہ

کرلینا۔‘‘ [1] عام دنوں میں اگر ظہر، عصر میں تین گھنٹوں کا وقفہ ہے تو تین گھنٹے کے وقفے سے نماز پڑھ لینا۔ پھر آگے عصر کی نماز، مغرب کی نماز اسی وقفے کے بقدر ایک اندازہ لگا کے پڑھ لینا۔ دین کا مسئلہ حل کیا۔ ان نصوص سے کیا بات واضح ہورہی ہے؟ کہ اصل کامیابی وہ کامیابی ہے جس کا تعلق آخرت کے ساتھ ہے۔ اسی کی تگ و دو کریں، اسی کی فکر کریں۔ یہ علم نافع اس کامیابی کی اساس ہے۔ تبھی تو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کی شان بیان کی اور اس راستے پر چلنے کا حکم دیا۔ یہ امر متعین ہے۔ جو اس راہ پر چلے گا وہ جنت میں جائے گا۔

حصولِ علم کے لیے ایک نبی کا سفر

یہ کتنا اہم معاملہ ہے کہ اللہ کے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام اس راہ پر چلے۔ ایک تقریر کی، اتنی مؤثر کہ دل نرم ہو گئے اور لوگ رو پڑے، رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ آپ وعظ کرکے جب چلنے لگے تو ایک شخص نے آپ کا پیچھا کیا اور کہا کہ موسیٰ! کیا اس سرزمین پر تم سے بڑا کوئی عالم ہے؟ فرمایا کہ نہیں، میں سب سے بڑا عالم ہوں۔ اس لیے فرمایا کہ میں اللہ کا نبی ہوں۔ نبی کے پاس براہ راست علم آتا ہے۔ علم جو بھی ہوگا پہلے پیغمبر کے پاس آئے گا۔ پیغمبر سے آگے منتقل ہوگا۔ تو چونکہ اس علم کا پہلا مخاطب میں ہوں، لہٰذا سب سے بڑا عالم میں ہوں۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات ناپسند آئی۔ اللہ پاک نے فرمایا: موسیٰ! یہ بات تم نے کیوں کہہ دی؟ اس زمین میں ایک ایسا شخص موجود ہے، اس کے پاس جو علم ہے وہ تمھارے پاس نہیں ہے۔ اب موسیٰ کلیم اللہ، جس سے اللہ نے کلام کیا۔

[1] صحيح مسلم، حديث: 2937، والمستدرك للحاكم: 130/7.

جس کو اللہ نے الواح کے ذریعے علم دیا، پوری تورات دی۔ اس موسیٰ نے خواہش کی کہ یااللہ! «كَيْفَ السَّبِيلُ إِلَيْهِ؟» میں اس کے پاس جانا چاہتا ہوں، کیسے جاؤں؟ اتنا بڑا عالم، نبی، اولوالعزم پیغمبر، کلیم اللہ، صاحب تورات، صاحب الواح، اتنے بڑے علم کا مالک «كَيْفَ السَّبِيلُ إِلَيْهِ؟» یااللہ! اس شخص کے پاس میں جانا چاہتا ہوں اور جو علم اس کے پاس ہے، اس سے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ہے طریق علم، اس پر چلنے کا شوق۔ ایک نبی یہ خواہش کررہا ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا: ٹھیک ہے۔ وہ شخص مجمع البحرین کے پاس ہے۔ دو بحر وہاں ملتے ہیں۔ مشرق کی طرف سے بحر فارس اور مغرب کی طرف سے بحر روم۔ ان دونوں کا ملتقی، مجتمع۔ جہاں یہ ملتے ہیں وہ شخصیت وہاں بیٹھی ہے۔ خضر علیہ السلام۔ وہاں چلے جاؤ۔ اب موسیٰ علیہ السلام کیا کہہ رہے ہیں؟ ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا﴾ نوجوان اپنے ساتھی یوشع بن نون سے، جو رفیقِ سفر تھا، اس سے فرمارہے ہیں کہ میں چلتا رہوں گا جب تک مجمع البحرین تک نہ پہنچ جاؤں۔ اور جب تک یہ نہیں آئے گا چلتا رہوں گا۔ ﴿اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا﴾ حقب کیا ہے۔ اس کی تفسیر میں اختلاف ہے، لیکن ایک قول جس کو زیادہ مفسرین نے اختیار کیا وہ یہ ہے کہ ایک حقب اسّی سال کا ہے۔ ایک حقب چلتا رہوں گا۔ جب تک یہ علاقہ نہیں آئے گا میں چلتا رہوں گا۔ یہ ہے طلب علم کا شوق۔ وہ جاہل نہیں تھے عالم تھے۔ عالم ہی نہیں اللہ کے نبی تھے۔ اور صاحب وحی، صاحب تورات اور پھر کلیم اللہ جن سے اللہ نے کلام کرکے ان کو علم دیا۔ کتنے بڑے نبی! لیکن طلبِ علم کا شوق اور آخر وہاں پہنچ گئے۔ لمبا قصہ ہے۔ وہاں پہنچ گئے اور خضر علیہ السلام سے کیا کہا؟ ﴿هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا﴾ کہ میں آپ کے پیچھے چلوں؟ آپ کے ساتھ

ساتھ چلوں؟ آپ مجھے وہ علم دیں جو اللہ نے آپ کو دیا ہے۔ خضر علیہ السلام نے کہا: ﴿اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا﴾ ”تم میرے ساتھ صبر نہیں کرسکو گے۔“ لیکن تم اتنی دور سے آئے ہو چلو، کہا: چلو! بہرحال قصہ طویل ہے۔ اتنا لمبا سفر کیا، جانے اور آنے میں، صرف تین باتیں حاصل ہوئیں۔ وہ آپ جانتے ہیں۔ صرف تین باتیں۔ اس کے بعد استاد اور شاگرد میں علیحدگی ہوگئی اور موسیٰ علیہ السلام کو واپس آنا پڑا۔[1] لیکن اللہ کے نبی کو طلبِ علم کا شوق۔ یہ شوق کس چیز کا غماز ہے؟ اللہ کا ایک نبی اتنا طویل سفر کیوں کررہا ہے؟ کس لیے؟ طلب علم کے لیے، ایک شیخ کے پاس جانے کے لیے۔ تو پھر یہ راستہ بڑا عظیم الشان راستہ ہے۔

مدارس کی طرف سفر اور طلبہ کا مقام

مدارس کا راستہ بڑا عظیم الشان راستہ ہے۔ اس راستے پر چلنا چاہیے۔ اس راستے پر چلنے والے بڑے برگزیدہ لوگ ہیں۔ دو شخصیتوں کے نام پیش کرتا ہوں: نبی ﷺ کے ایک صحابی قبیصہ بن مخارق، جن کی حدیث مسند احمد میں ہے۔ لاٹھی ٹیکتے ٹیکتے، بڑی مشکل سے نبی ﷺ کے پاس آئے، بوڑھے انسان تھے، سانس اکھڑی ہوئی ہے۔ لاٹھی ٹیکتے ٹیکتے نبی ﷺ تک پہنچ گئے۔ فرمایا: قبیصہ! کیوں آئے ہو؟ کہا کہ «كَبِرَتْ سِنِّي وَرَقَّ عَظْمِي» یا رسول اللہ! میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور ہڈیاں کمزور ہو گئیں، لہٰذا میں نے سوچا کہ آپ کے پاس آؤں اور آپ سے وہ علم حاصل کروں جس کا مجھے نفع ہو۔ «لِتُعَلِّمَنِي مَا يَنْفَعُنِي» تاکہ آپ مجھے کچھ علم دیں جس کا مجھ کو کچھ نفع ہو۔

[1] صحيح البخاري:4727.

یعنی ایک بوڑھا انسان بھی اس ضرورت کو محسوس کرتا ہے کہ طلب علم نافع کے بغیر کوئی گزارا نہیں ہے۔ تو آج ہی سفر کرکے، اگرچہ چلنے کی طاقت نہیں ہے۔ ہمت کرکے آگیا۔ ہڈیاں کمزور ہو چکی ہیں، لیکن پھر بھی چونکہ یہ طلبِ علم کا راستہ جنت کا راستہ ہے تو آپ مجھے کچھ ایسا علم نافع دے دیں جس کا مجھے فائدہ ہو اور میں کامیاب ہو جاؤں۔ رسول اللہ ﷺ نے علم نافع تو دیا لیکن ساتھ ساتھ یہ فرمایا کہ قبیصہ! مبارک ہو! «مَامَرَرْتَ بِحَجَرٍ وَّلَا شَجَرٍ وَّلَا مَدَرٍ إِلَّا اسْتَغْفَرَ لَكَ» تم جو فاصلہ طے کرکے آئے، جس درخت کے پاس سے گزرے، جس ٹیلے اور پتھر کے پاس سے گزرے، ان سب نے تیرے لیے استغفار کی دعا کی۔ درخت کے ایک ایک پتے نے اور ریت کے ٹیلے کے ایک ایک کنکر اور ایک ایک ذرے نے، حجر و شجر نے تیرے لیے دعا کی، استغفار کیا ہے۔[1] یہ مقام کس کا ہے؟ ایک طالب علم کا جو علم نافع کے حصول کے لیے گھر سے نکلتا ہے، سفر کرتا ہے اس کے لیے ہر چیز استغفار کرتی ہے۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے کہ پانی کی مچھلیاں اور بلوں کی چیونٹیاں اس کے لیے دعا کرتی ہیں۔ ہر چیز دعا کرتی ہے۔[2] یہ ایک طالب علم کی شان ہے۔ ان طلبہ کا مقام، ان کا وجود کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ علمائے سلف میں سے کئی ایک کا قول ہے: «إِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ الْبَلَاءَ عَنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ» اللہ اس امت کی بلائیں، مشکلیں، تکلیفیں ٹالتا ہے، کس کی برکت سے؟ «بِرِحْلَةِ أَصْحَابِ الْحَدِيثِ» طلبائے حدیث کے سفروں کی برکت سے۔[3] یہ چل کر جاتے ہیں تو ان کے قدم فرشتے گنتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ گنتے ہیں بلکہ «إِنَّ

[1] مسند أحمد: 60/5. [2] سنن أبي داود، حديث:3641. [3] الرحلة في طلب الحديث للخطيب البغدادي:15/1.

الْمَلَائِكَةَ لَتَضَعُ أَجْنِحَتَهَا رِضًا لِّطَالِبِ الْعِلْمِ» کہ فرشتے اپنے پر بچھاتے ہیں، ان کے لیے جو مدارس کی زینت ہیں۔[1] جو دور دراز کا سفر طے کر کے ان مدارس میں پہنچتے ہیں۔ تو یہ دینی مدارس، ان میں آنے والے طلبہ، ان کے علماء کا یہ مقام۔

نبی ﷺ کی میراث

نبی علیہ الصلاۃ والسلام کا فرمان ہے کہ یہ علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ انھوں نے ان مدارس سے جو علم حاصل کیا، انھوں نے انبیاء کی وراثت حاصل کی۔ «وَإِنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِينَارًا وَّلَادِرْهَمًا وَّإِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ» اور انبیاء کا ترکہ درہم و دینار نہیں بلکہ وہ ترکہ علم ہے جس کے حاملین یہ علماء ہیں۔[2] یہ علم انھوں نے کہاں سے لیا؟ ان مدارس سے، علماء سے سیکھا، سیکھ کر انبیاء کے وارث بن گئے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ مسجد میں آتے ہیں۔ دیکھا کچھ طلبہ بیٹھے ہیں اور قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ہو رہا ہے۔ حدیثیں بیان ہو رہی ہیں، فقہی مسائل پر بات ہو رہی ہے۔ فرمایا کہ «عَلٰى مِيرَاثِ مُحَمَّدٍ ﷺ يَقْتَسِمُونَهُ» یہ طلبہ محمد ﷺ کی میراث پر بیٹھے ہوئے ہیں اور پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کی میراث تقسیم کر رہے ہیں۔[3]

مسجد میں درس حدیث ہو رہا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بازار کی طرف نکل گئے، بہت بڑے تاجر اپنا کاروبار کر رہے ہیں۔ دنیاوی امور میں مصروف ہیں اور آپ فرما رہے ہیں: اے تاجرو! تم یہاں بیٹھے خرید و فروخت کر رہے ہو، «ذَاكَ مِيرَاثُ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ يُقَسَّمُ» مسجد میں اللہ کے پیغمبر کی میراث تقسیم ہو رہی ہے۔ پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کا ترکہ بٹ رہا

[1] سنن ابن ماجه، حديث: 223. [2] سنن ابن ماجه، حديث: 223. [3] شرف أصحاب الحديث: 102/1.

ہے۔ اور تم یہاں کاروبار کر رہے ہو۔ تمھارے نزدیک یہ کاروبار کامیابی ہے، لیکن یہ محدثِ امت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کس چیز کو کامیابی کہہ رہے ہیں کہ تم ابھی تک یہاں خرید و فروخت میں مصروف ہو اور تمھیں معلوم نہیں مسجد میں اللہ کے پیغمبر کی میراث تقسیم ہو رہی ہے۔ وہ دکانیں بند کر کے مسجد میں آ گئے کہ میراث بٹ رہی ہے کچھ ہمیں بھی مل جائے۔ دیکھا وہاں کچھ بھی نہیں۔ کہا کہ ابو ہریرہ! کہاں ہے میراث؟ ترکہ کہاں بٹ رہا ہے؟ کہا کہ اس مجلس میں کیا ہو رہا ہے؟ دین کے مسائل بیان ہو رہے ہیں، قال رسول اللہ، قال اللہ کی صدائیں گونج رہی ہیں، یہی تو اللہ کے پیغمبر کا ترکہ ہے۔[1]

حقیقی بادشاہ......علماء

خلیفہ ہارون الرشید اپنی بیوی زبیدہ کے ساتھ بغداد کے بازاروں میں گھوم رہا ہے۔ سواری پر سوار ہے۔ چند حاجب اور سپاہی ساتھ ہیں۔ بعض اوقات تفقد (حالات کا جائزہ لیا کرتے) کیا کرتے۔ رعیت کے حالات دیکھیں۔ کوئی شکایت ہو، کوئی براہ راست بات کرنے والا مل جائے، یہ ایک تفقد کی شکل ہوتی تھی۔ تو بغداد کی سڑکوں میں گھوم رہے ہیں۔ زبیدہ نے ایک چیز نوٹ کی کہ نوجوان اپنی بغلوں میں کتابیں اور کاپیاں تھامے ایک طرف چلے جا رہے ہیں۔ ہاتھوں میں دواتیں ہیں، قلمیں ہیں، ایک طرف چلے جا رہے ہیں۔ انھیں معلوم ہے ان کا خلیفہ ان کے بیچ گھوم رہا ہے، خلیفے کی طرف کسی کی نگاہ نہیں۔ ٹھیک ہے گھوم رہا ہے۔ لیکن ان پر ایک دھن سوار ہے۔ سب کے چہرے کی سمت ایک ہی طرف ہے۔ زبیدہ نے پوچھا: یہ رش کہاں جا رہا

[1] المعجم الكبير للطبراني: 92/1.

ہے؟ اتنا ہجوم، یہ ازدحام کہاں جارہا ہے؟ ان پر کیا دھن سوار ہے؟ کہا کہ زبیدہ! آج جامعہ بغداد میں ایک محدث کا درس ہے۔ اس کا نام ہے عبداللہ بن مبارک۔ یہ اس کے درس کو سننے کے لیے، حدیثیں لکھنے کے لیے جارہے ہیں۔ زبیدہ نے کیا کہا؟ «فَهُمُ الْمُلُوكُ» پھر بادشاہ تو یہ ہوئے نا۔ تم پھر کس چیز کے بادشاہ ہو؟ تمھارے ساتھ چند سپاہی ہیں بس۔ اور وہ جو جامع بغداد میں بیٹھا ہے، جس کی طرف یہ پروانے دوڑے جارہے ہیں۔ بادشاہ تو وہ ہوا۔ تم کیا بادشاہ ہو؟ جس ترقی کو تم ترقی سمجھتے ہو ہمارے نزدیک اس کی یہ حیثیت ہے۔ ہمارے نزدیک یہ ملوک ہیں جو دنیا کے بادشاہ ہیں۔ ان کی حکومت ابدان پر ہے اور جو دین کے بادشاہ ہیں ان کی حکومت دلوں پر ہے۔ وہ ملوک الابدان ہیں اور یہ ملوک القلوب ہیں۔ دلوں کے بادشاہ۔ ان کے مقام تک کون پہنچ سکتا ہے۔

تمام دنیا ملعون ہے

تو حقیقت یہ ہے کہ یہ پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کا ورثہ جو آپ نے چھوڑا، اس کی طلب کا جو اہتمام ہو رہا ہے، علماء، طلبہ یقیناً وہ بڑے کامیاب اور فائز المقام ہیں۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے پوری دنیا کو ملعون کہا ہے، پوری دنیا مستحق لعنت ہے۔ سوائے اللہ کے ذکر کے اور سوائے علماء کے اور سوائے طلبہ کے اور پھر چوتھا وہ شامل ہوگیا جو ان کا خادم ہے۔ جو ان کے جوتے اٹھاتا ہے، ان کی خدمت کرتا ہے۔ یہ اصل مقام علم کا اور ذکر کا ہے، جو ذاکرین ہیں، متعلمین ہیں، علماء ہیں، ان کے سوا پوری دنیا ملعون ہے، البتہ جو ان کا خادم بن جائے، ان کا محبّ بن جائے وہ بھی اس لعنت سے باہر نکل آتا ہے۔ [1] یہ

[1] جامع الترمذي، حديث:2322.

مقام تو وہ ہے کہ اس میں عظمت ہی عظمت ہے۔ رحمتیں ہی رحمتیں ہیں۔ اللہ کے بندو! جو سب سے پہلے مدرسہ دینیہ قائم ہوا، کس نے قائم کیا؟ جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے۔ اصحاب صفہ کیا تھے؟ یہ مسجد نبوی کے طلّابِ علم کیا تھے؟ اس قائم ہونے والے پہلے مدرسے کے طالب علم اور اس مدرسے کا انتظام کیسا تھا؟ صحیح بخاری میں یہ روایت ہے، بئر معونہ کا قصہ۔ رِعل اور ذکوان کے قبائل نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے پاس آئے اور کہا کہ ہماری جھڑپیں بھی ہوتی ہیں اور قوم اسلام قبول کررہی ہے۔ ہمیں کچھ قراء دیں جن کی تعداد زیادہ ہوتا کہ وقت آنے پر جہاد بھی کریں، ہماری تربیت بھی کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے ستر قراء ان کو دیے، ستر قراء۔ صحیح بخاری میں ان کے بارے میں تعارف اس طرح ہے کہ «كَانُوا يَحْتَطِبُونَ بِالنَّهَارِ وَيُصَلُّونَ بِاللَّيْلِ» ان کا کردار یہ تھا کہ دن کو جنگلوں میں جاتے، ایندھن اکٹھا کرتے، کاٹتے، اس کو بیچتے، کچھ معیشت کا انتظام کرلیتے اور پھر رات مسجد نبوی میں آجاتے۔ مسجد نبوی میں پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کے طلبہ ہوتے اصحاب صفہ۔ [1] وہ کمایا ہوا مال ان دوسرے طلبہ پر خرچ کرتے، ان کو کھلاتے، ان کی خدمت کرتے، اور ان سے وہ علم نافع حاصل کرتے جو دن بھر انھوں نے حاصل کیا ہوتا۔ اصحاب صفہ منتظر رہتے کہ اللہ کے پیغمبر پر وحی آئے، آپ ہمیں پڑھ کر سنائیں، کوئی پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کا عمل، کوئی آپ کا فرمان ہم تک پہنچے۔ اس کو جمع کرتے، سمیٹتے، سمجھتے، یاد کرتے، اپنے سینوں میں محفوظ کرتے، پھر یہ لوگ لکڑیاں کاٹ کر بیچ کر کچھ کماکر رات کو پہنچ جاتے، پھر ساتھ مل کر کھاتے، علم کا مذاکرہ کرتے، اللہ کی وحی سنتے، حدیثیں سنتے اور پھر کچھ وقت سوکر قیام اللیل کے لیے اٹھتے۔ یہ ان کا وتیرۂ حیات تھا۔ جن کو

[1] صحيح البخاري، حديث:4090.

لوگ مذاق کرتے ہیں کہ ان کا کیا فائدہ، انھوں نے قوم کو کیا دیا؟ پاکستان کو کیا دیا؟

اللہ کے بندو! تم بدو لوگ کیا سمجھو کہ یہ لوگ کیا ہیں؟ اصحاب صفہ کے یہ طالب علم کسریٰ اور قیصر کے فاتح بنے یا نہیں بنے؟ کفار کی کمر ٹوٹی اور اسلام پھیلا۔ مرکزی کردار کس کا تھا؟ تم ان کو معمولی اور حقیر سمجھتے ہو کہ یہ فقیر ہیں، ٹھکرائے ہوئے ہیں، پسماندہ ہیں۔ ارے اللہ کے بندو! ان کی آنکھوں میں وہ بصیرت ہے جس کو تم پہچان ہی نہیں سکتے۔ تو یہ نہیں کہ صرف اسی دور کی بات ہے۔ میں جانتا ہوں کہ افغانستان میں روس سے ٹکر لینے والے ان مدارس کے طلبہ تھے۔

دین کے کسی ایک مسئلے پر جماعت بنانا

آج لوگ مدارس کے خلاف باتیں کرتے ہیں کہ یہ کیا قال قال رسول اللہ ہو رہا ہے؟ نکلو، جہاد کرو۔ نبی ﷺ کے دور میں ایسی کوئی تبلیغ نہیں تھی۔ ایسی کوئی الگ جماعت نہیں تھی جو جماعۃ المجاہدین ہو، جو جہاد کے لیے وقف ہوں۔ نہیں، سارے کام کرتے تھے۔ پڑھتے بھی تھے، کاروبار بھی کرتے تھے، جب وقتِ جہاد آتا تو جہاد کرتے۔ الگ سے کوئی جماعت نہیں تھی۔ دینی مدارس کے طلبہ نے یہ ثابت کر دکھایا کہ روس جیسی طاقت بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اصل بات یہ ہے کہ ﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ﴾[1] تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرلو اللہ تمھیں ہر چیز سکھا دے گا۔ سیاست کیسے کرنی ہے؟ جہاد کیسے کرنا ہے؟ ایجادات کیسے کرنی ہیں؟ اللہ وقت آنے پر تمھیں سب کچھ سکھا دے گا۔ یہ ضروری نہیں کہ سب کچھ چھوڑ کر تم ایک مقام پر بیٹھ جاؤ کہ ہم

[1] البقرۃ 2:282.

نے صرف یہ کام کرنا ہے۔ نہیں، اللہ کے خوف اور تقویٰ کی اساس پر سب کچھ کرو۔ وقت آئے گا تمھیں اللہ ہر چیز سکھا دے گا۔ وقت آیا ان مدارس کے طلبہ نے روس کے دانت کھٹے کر دیے۔ تو بعد میں لوگ آگئے ان پر سیاست چمکانے والے لیکن اس وقت اصل کردار انھی طلبہ کا تھا۔ تو یہ مدرسہ نبی ﷺ کے دور میں، اصحاب صفہ یہ اللہ کے پیغمبر کے طلبہ، یعنی یہ مدرسہ کس طرح چل رہا ہے۔ معاشرے کے کچھ لوگوں کی کمائی کے ساتھ چل رہا ہے۔ وہ دن بھر ایندھن اکٹھا کرتے، اسے بیچتے اور پھر جو کماتے وہ لے آتے، خود بھی کھاتے، ان طلبہ کو ساتھ شامل کر لیتے۔ انھیں یہ جسمانی غذا دیتے اور وہ انھیں روحانی غذا دیتے۔ کہ تم نے دن بھر لکڑیاں کاٹیں، ہمارے لیے کمایا اور ہم نے دن بھر اللہ کے پیغمبر کے فرامین سنے، ہم تمھیں یہ فرامین سناتے ہیں۔ ان کا کردار زیادہ اہم ہے جو روحانی غذا دیتے ہیں تو اس طرح یہ مدارس قائم ہوگئے۔

ایک محدث ایک مدرسہ ہے

جہاں ایک محدث بیٹھا ہے وہ ایک مدرسہ ہے۔ ایک محدث اپنے مقام پر ایک انجمن ہے۔ ایک دینی ادارہ ہے۔ طلبہ وہاں آتے اور علم حاصل کرتے۔ اور یہ سلسلہ اب تک قائم ہے اور قیامت تک قائم رہے گا کیونکہ پیغمبر ﷺ کا فرمان ہے: اس علم کو تم مجھ سے سنتے ہو، آگے لوگ سنیں گے اور آگے سنتے رہیں گے۔[1] قیامت تک یہ علم کا سماع قائم رہے گا۔ جہاں یہ سماع ہوگا وہ دینی ادارہ اور مدرسہ ہے۔ چاہے وہاں کوئی اینٹیں نہ ہوں، درخت کے سائے تلے بیٹھے ہوں، اپنے گھر میں بیٹھے ہوں۔

[1] سنن أبي داود، حديث:3659.

سفیان ثوری ﷫ کے بقول «لَوْ أَنَّ فَقِيهًا عَلَى رَأْسِ جَبَلٍ لَكَانَ هُوَالْجَمَاعَةَ» اگر ایک عالم دین پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھا ہے تو لوگو سنو! وہ جماعت ہے۔[1] اپنے سارے دھندے چھوڑ کر پہاڑ کی چوٹی پر چڑھو اور جاکے اس سے علم حاصل کرو۔ تم اس کے محتاج ہو، وہ تمھارا محتاج نہیں ہے۔ تم اس کے پاس جاؤ اور علم نافع حاصل کرو کیونکہ علم نافع تمھاری بقا اور اخروی کامیابی کی ضمانت ہے۔

طلبائے دین کا مقام

اور اللہ پاک نے کیا فرمایا: ﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ﴾[2] اے محمد ﷺ! آپ انھی کے ساتھ بیٹھیں، یہ طلبہ، اصحاب صفہ، بلال حبشی، صہیب رومی، عمار بن یاسر، عبداللہ بن مسعود، ان کے ساتھ بیٹھو۔ کچھ کفار نے کہا تھا کہ اگر ہمیں دعوت دینی ہے تو ان فقراء کو اٹھادو، الگ سے بیٹھو ہمارے ساتھ۔ ان کے ساتھ ہم نہیں بیٹھ سکتے۔ ان کی کیا جرأت کہ ہمارے ساتھ ہمارے برابر بیٹھیں۔ ان کو اٹھادو۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ نہیں، ﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ﴾ آپ صبر کے ساتھ بیٹھیں ان لوگوں کے ساتھ جو صبح وشام اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں۔ اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔

طلبہ کے لیے نصیحت

اے میرے طلبہ! علم نافع کو حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ صبح وشام اپنے پروردگار کو پکارو۔ اللہ کا ذکر کرو۔ صبح وشام کے اذکار پڑھو۔ اور ﴿يُرِيدُونَ وَجْهَهُ﴾ ان کی ایک

[1] حلاوة العلم: 11/1. [2] الكهف 18:28.

ہی طلب ہے کہ اللہ کی رضا حاصل ہوجائے۔ ان کی نیتیں خالص ہیں۔ دین کے تعلق سے یہ نیتیں خالص ہیں۔ ایک ڈاکٹر کی نیت کیا ہے؟ ایک انجینئر کی نیت کیا ہے؟ الا ماشاء اللہ۔ بس مال کمانا ہے۔ ہم نے اتنا پیسہ انویسٹ کیا ہے۔ اب کمانے کا وقت آ گیا۔ بے تحاشا فیسیں۔ یہی ایک حرص ہے نا؟ الا ماشاء اللہ۔ لیکن ایک دین کا طالب علم، اس کی نیت ہمیشہ استقامت ہوتی ہے کہ جو کچھ ہے اللہ کی رضا کے لیے ہے۔ اور یہ پورے دین کا نچوڑ اور خلاصہ ہے۔ تو اے پیغمبر! آپ ان کے ساتھ بیٹھیں۔ ان کے ساتھ بیٹھنا ہی ترقی ہے۔ یہ دنیادار، بڑے بڑے عہدوں کے مالک اور بڑے بڑے درہم و دینار کے مالک، ان کے ساتھ نہیں، ان (طلبہ) کے ساتھ بیٹھو۔ اسی مدرسے کا ایک طالب علم نبی ﷺ کے پاس آیا۔ ایک تو وہ قبیصہ بن مخارق، دوسرا ایک اور طالب علم لاٹھی ٹیکتے ٹیکتے اللہ کے پیغمبر تک پہنچا، آنکھوں سے نابینا تھا۔ گھر کہیں دور تھا۔ ایک بار پیغمبر ﷺ کے پاس آیا، کہا کہ یارسول اللہ! میرا کوئی قائد نہیں، گھر دور ہے، مجھے اجازت دیں کہ نماز گھر پڑھ لوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اذان سنتے ہو؟ کہا کہ جی ہاں۔ فرمایا کہ پھر آنا پڑے گا۔ کہا کہ راستے میں جانور ہیں، درندے ہیں، کوئی قائد نہیں ہے، تکلیف ہوسکتی ہے۔ فرمایا: آنا پڑے گا۔[1]

اب یہ عبداللہ بن ام مکتوم نبی علیہ السلام کے پاس آیا۔ لاٹھی ٹیکتے ٹیکتے اللہ کے پیغمبر تک پہنچا۔ بڑی تکلیف سے آیا ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ اس وقت سلاطین قریش کو دعوت دے رہے تھے۔ اس نے آکر اپنی حاجت پیش کردی۔ یارسول اللہ! مجھے فلاں مسئلے کا حل چاہیے۔ پیغمبر ﷺ کو کچھ ناگوار گزرا اور آپ نے اس سے اعراض کرلیا۔ آپ کی خواہش

[1] سنن النسائي، حديث: 851، 852.

یہ تھی کہ ان تک پوری بات پہنچا دوں، پھر بعد میں اس کی بات بھی سن لوں گا۔ یہ آپ نے اس لیے کہا ہوگا کہ جن سے بات کر رہا ہوں ان سے بات پوری ہو جائے بعد میں اس کی بات سن لوں گا۔ دوسری وجہ یہ بھی ہوگی یہ جو آیا ہے یہ تو مسلمان ہے، اس کے پاس علم ہے، کوئی جز اس کے پاس نہیں ہے۔ جن کو سمجھا رہا ہوں ان کے پاس تو کل کا کل نہیں ہے۔ جن کے پاس کل نہیں انھیں زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ اللہ کو یہ بات ناپسند آئی اور کچھ خفگی کا اظہار کیا، کچھ ناراضی کا اظہار کیا۔ اس صحابی عبداللہ کی طرف توجہ نہیں دی۔ ماتھے پر بل آ گئے۔ فرمایا کہ جو مستغنی ہیں ان کی آپ فکر کر رہے ہیں اور جو آپ کے پاس آیا ﴿يَسْعٰى﴾ بڑی کوشش سے پہنچا ﴿وَهُوَ يَخْشٰى﴾ اس کے دل میں خشیت ہے۔ یہ مستغنی لوگ ہیں ان کو کوئی پروا نہیں، اسلام قبول کرنے کی کوئی خواہش، کوئی حرص نہیں اور یہ شخص جو بڑی محنت سے، کوشش سے پہنچا، اس کا دل اللہ کی خشیت سے لبریز ہے۔[1] اللہ رب العزت نے اس طالب علم کی خاطر کچھ اظہار خفگی کیا۔ اپنے پیغمبر کو اس طالب علم کی خاطر کچھ تنبیہ کر دی۔ تو یہ طلبہ کا مقام ہے کہ ان کو وقت دو، ان پر توجہ دو، جو علم نافع کے تعلق سے یہ سوال کرتے ہیں اس کا جواب دو، ان کے مسائل حل کرو۔ یہ طلبہ کا مقام ہے۔

دینی مدارس کا سلیبس

حقیقت یہ ہے کہ دینی مدارس بنیادی طور پر اسلام کے قلعے ہیں۔ یہاں آپ کو وہ کچھ ملے گا جو کہیں اور نہیں مل سکتا۔ یہ میرا دعویٰ ہے۔ بڑی بڑی درسگاہیں، بڑے بڑے

[1] تفسیر ابن کثیر: 8/319.

ان کے بجٹ ہیں، لیکن جو تعلیم یہاں قائم اور موجود ہے، یہ کہیں بھی نہیں ہے۔ اور خاص طور پر جو ہمارے پاکستان کے مدارس ہیں، سلفی مدارس، ان کے سلیبس اور مناہج آپ اٹھا کر دیکھیں اتنے قوی ہیں کہ جو روحانی غذا، علمِ نافع کی غذا یہاں ملتی ہے اور کہیں نظر نہیں آئے گی۔ ہم علم حاصل کرنے کے لیے باہر گئے جامعۃ الامام میں، مدینہ یونیورسٹی میں، وہاں کے سلیبس بھی یہاں کے مقابلے میں ادھورے ہیں۔ علمی تشنگی وہاں بھی نہیں بجھی جو یہاں بجھی، جو ہمارے مشائخ نے ہمیں یہاں دیا، وہاں نظر نہیں آیا۔ کچھ مسائل ایسے ہیں جن میں وہاں بڑی محنت ہے جیسے توحید ہے، عقیدہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو علم نافع ان مدارس میں ہم کو حاصل ہوا وہ بڑا گہرا، انتہائی تعمق کے ساتھ ہے۔

یونیورسٹیوں کا سلیبس

اور یہاں کی جو یونیورسٹیاں ہیں وہ تو بالکل سطحی اور کچھ نہیں ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ رحمانیہ (سولجر بازار کراچی) میں ہمارا یہ سلیبس نو سال کا تھا اور میں تیسری جماعت کا طالب علم تھا، کراچی یونیورسٹی کا ایک طالب علم ایم۔ اے کر رہا تھا۔ وہ عربی اور اسلامیات مجھ سے پڑھنے آتا تھا، حالانکہ میں درجہ ثالثہ کا چھوٹا سا طالب علم تھا اور وہ عمر میں بہت بڑا، ایم۔ اے کر رہا تھا۔ تو کتنا سطحی سلیبس ہے کہ ہمارے ابتدائی طالب علم اس کو پڑھا سکتے ہیں۔

تو ان مدارس کے پیچھے کیوں پڑے ہیں آپ؟ آپ سے یہ کیا مانگتے ہیں؟ گورنمنٹ سے کیا مانگتے ہیں؟ تم جو مرضی کرو، حکومتیں کرو، ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ ہم جانیں ہمارے طلبہ جانیں۔ اور بحمد اللہ نظام چل رہا ہے۔ ہزاروں مدارس ہیں اور لاکھوں طلبہ

بحمداللہ فارغ ہوئے اور دین کا کام کررہے ہیں۔ مسجدیں آباد ہیں، مدارس آباد ہیں، دعوت کا کام ہورہا ہے، دروس کا کام ہورہا ہے۔ یہ کس کا رہینِ منت ہے؟ یہ پروگرام ان مدارس سے آیا، بڑی ان کی قیمت ہے، بڑا ان کا مقام ہے۔ تحفظِ دین کے قلعے ہیں۔ ورنہ آج صحیح بخاری صرف لائبریریوں میں پڑی رہ جائے۔ بخاری شریف کون پڑھتا، کون پڑھاتا ہے؟ کوئی ادارہ ہے تو پیش کرو۔ صرف دینی مدارس صحیح بخاری پڑھاتے ہیں، صحیح مسلم پڑھاتے ہیں۔ ورنہ یہ کتابیں صرف لائبریری کی زینت ہوتیں۔ ان کو پڑھا جارہا ہے، پڑھایا جارہا ہے اور یہ نور طلبہ کے سینوں میں منتقل کیا جارہا ہے۔ یہ صرف اللہ پاک کی توفیق سے ان مدارس کا کمال ہے، اس لیے علماء کا مقام ہے۔ طلبہ کا مقام ہے۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے ہر چیز کو ملعون قرار دیا سوائے علماء اور طلبہ کے جن کے ساتھ تعلق اللہ کی رحمت کا موجب ہے۔ اس کے حصول کا موجب ہے۔ تو یہ مدارس انتہائی اعلیٰ اور گراں قدر ادارے ہیں اور ان سے بحمداللہ علمِ نافع کا سلسلہ جاری اور قائم ہے۔ اللہ ان کو قائم اور آباد رکھے اور یہ تعلق بڑھتا رہے اور یہ علم اور یہ عمل پھیلتا رہے ورنہ میرے دوستو اور بھائیو! ﴿اِنَّ الْاِنْسٰنَ لَفِیْ خُسْرٍ﴾ انسان گھاٹے میں ہے۔ ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ [1] صحیح ایمان، صحیح عقیدہ، عمل صالح یہ چیزیں گھاٹے سے نکالنے والی ہیں۔ ان کا حصول ان مدارس اور علماء کا رہینِ منت ہے۔

وَأَقُولُ قَوْلِي هٰذَا وَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِي وَلَكُمْ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

[1] العصر 103: 2، 3.

دونوں جہانوں کی کامیابی دینی علم میں پوشیدہ ہے

دونوں جہانوں کی کامیابی دینی علم میں پوشیدہ ہے

خطبہ مسنونہ:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ ﴾ [1]

اس نشست کے لیے جو موضوع ساتھیوں نے تجویز کیا ہے، وہ ہے: دونوں جہانوں کی کامیابی علم میں مضمر ہے۔ یہ موضوع بالکل درست ہے۔ اور اس موقف سے ہمیں پوری طرح اتفاق ہے۔ اس کی دلیل صحیح بخاری کی حدیث ہے۔ امیر المومنین امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اس کے راوی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: «مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ» [2] اللہ تعالیٰ جس شخص کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرمالے، جس شخص کی بہتری کا، کامیابی کا، سعادت کا فیصلہ فرمالے تو اسے کیا دیتا ہے؟ «يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ» اللہ تعالیٰ اس کو دین کا علم اور دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے۔ یہاں مطلقاً خیر کا ذکر ہے۔ یہ خیر دنیا کی بھی ہوسکتی ہے اور آخرت کی بھی، یعنی دونوں جہانوں کی ہر قسم کی کامیابی اور سعادت۔ تو یہاں خیر کو کسی شعبے کے ساتھ مقید

[1] الأنفال 8:29. [2] صحیح البخاري، حدیث:71.

نہیں کیا گیا۔ ہر قسم کی ترقی، رفعت، عروج، خیر، بھلائی، سعادت اور کامیابی مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ جس شخص کے بارے میں یہ فیصلہ فرمالے اور جس شخص کو ہر قسم کی خیر کے لیے چن لے، اسے اللہ کیا دیتا ہے؟ کوئی دنیا کے کاروبار اور فیکٹریاں نہیں دیتا اور نہ ہی دنیا کی ٹیکنالوجی کی مہارت دیتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اس کو دین کی سمجھ اور دین کا علم عطا فرمادیتا ہے۔ یہ تو ایک ظاہری مفہوم ہے کہ اللہ رب العزت جس کے ساتھ بھلائی کا فیصلہ فرمالے، اسے دین کی سمجھ دے دیتا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کا مفہوم مخالف یہ ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا فیصلہ نہ فرمائے اسے دین کی سمجھ نہیں دیتا۔ یعنی یہ اس حدیث کا مفہوم مخالف ہے۔ اور یہ مفہوم بالکل درست اور واضح ہے۔ سلف صالحین نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی نصوص (احادیث مبارکہ کی عبارتوں) سے مفہوم ظاہر اور مفہوم مخالف لیا کرتے تھے۔ جیسے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے: ایک بات نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمائی ہے، دوسری بات میں کہتا ہوں۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا ہے: جو شخص شرک کرتا ہوا مرے وہ دوزخ میں جائے گا۔ یہ تو نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے فرمان کا ظاہری مفہوم ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو اس حال میں مرے کہ وہ شرک نہ کرتا ہو وہ جنت میں جائے گا۔ [1] یعنی توحید ایک ایسی چیز ہے جو دخول جنت کا ایک مؤکد سبب ہے۔ جو توحید پر مرے گا وہ جنت میں یقیناً جائے گا۔ کیونکہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا: جو اللہ کے ساتھ "ند" اور شریک مقرر کرے گا وہ جنت میں داخل نہیں ہوسکتا تو جو مقرر نہیں کرے گا وہ یقیناً جنت میں جائے گا۔ یہ مفہوم مخالف ہے۔ تو اس حدیث کا معنی ظاہر کیا ہے؟ کہ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا فیصلہ فرمالے اسے دین کا علم

[1] صحیح البخاري، حدیث:1238.

دیتا ہے۔ مفہوم مخالف کیا ہوا کہ اللہ تعالیٰ جس کو دین کا علم اور دین کی فقاہت نہ دے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ بھلائی کا فیصلہ نہیں فرمایا، خواہ دنیاوی اعتبار سے وہ کتنا اونچا ہو، اس کے پاس عہدے ہوں، ملازم ہوں اور کتنی ترقی کر جائے، وہ کتنے عروج پر ہو، رفعت پر ہو، اس کے پاس دنیا کی صنعتیں اور حرفتیں ہوں لیکن اس کا صاف معنی یہ ہے کہ اگر دین کا علم اور دین کی فقاہت نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ کا اس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ سب سے اہم نکتہ ہے کہ کسی شخص کو علم عطا فرمانا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے حق میں سب سے بڑی بھلائی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ امام بخاری ؒ نے ایک باب قائم کیا ہے۔ اور اس باب کی ایک علت بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ «بَابُ الْعِلْمِ قَبْلَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ لِقَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى: ﴿فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ [1]» باب یہ ہے کہ علم پہلے ہے قول سے بھی اور عمل سے بھی۔ کوئی بھی قول ہو، زبان سے کچھ بھی آپ نے کہنا ہو اور کوئی بھی عمل آپ نے کرنا ہو ان سب سے پہلے ایک چیز ہے اور وہ علم ہے۔ کیونکہ اللہ پاک نے فرمایا کہ ﴿فَاعْلَمْ﴾ جان لو! ﴿اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ کہ کوئی معبود نہیں صرف ایک اللہ ہے۔ یعنی توحید بھی معرفت اور علم پر قائم ہے۔ اگر معرفت نہ ہو، علم نہ ہو تو آپ یہ کیسے عقیدہ رکھیں گے کہ اللہ ایک ہے۔ اس کی معرفت چاہیے، اس کا علم چاہیے۔ تو گویا عقیدہ ہو، عمل ہو، قول ہو، زبان سے کچھ کہنا ہو، کچھ کرنا ہو اس سب کی بنیاد علم ہے۔ سفیان بن عیینہ ؒ اس آیت کریمہ سے علم کی فضیلت پر استدلال کیا کرتے تھے۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ علم ہر چیز سے مقدم ہے۔ بلکہ ہر چیز علم پر قائم ہے۔ اب یہاں تین مناہج ہیں،

[1] محمد 19:47.

سورۂ فاتحہ ان تینوں کو بیان کر رہی ہے۔ دو منہج خلاف شریعت ہیں۔ ایسے خلاف شریعت ہیں کہ ایک منہج کو اللہ تعالیٰ نے مستحق غضب قرار دیا اور دوسرے منہج کو مطلقاً گمراہی کہا۔ اور تیسرے کو حق، صدق، نور اور جنت کا پروگرام قرار دیا۔ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ آپ دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ! ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت دے۔ صراط مستقیم کیا ہے؟ کن لوگوں کا ہے؟ فرمایا کہ ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ [1] ان لوگوں کا راستہ جن پر تیرا انعام ہوا۔ ان کا راستہ نہیں جن پر تیرا غضب نازل ہوا، تیری پھٹکاریں، غصہ اور ناراضی اتری، ان کا راستہ نہیں۔ اور نہ ہی گمراہوں کا راستہ۔ یہاں تین راستے سامنے آتے ہیں: ایک ہے انعام یافتہ لوگوں کا راستہ، سبیل انعام۔ وہ راستہ جس پر چلنے سے اللہ تعالیٰ کا انعام، رحمت، اجر اور ثواب حاصل ہوتا ہے۔ دوسرا وہ راستہ جس پر چلنے سے اللہ کا غضب نازل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پھٹکاریں اترتی ہیں۔ اور تیسرا وہ راستہ جس پر چلنا گمراہی ہے۔ ضلالت اور حق سے دوری ہے۔ جو سراسر جہنم کا طریق ہے۔ یہ تین راستے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ کا مصداق یہودی ہیں۔ نصاً یہ بات ثابت ہے کہ جن لوگوں پر اللہ کا غضب اترا وہ یہودی ہیں۔ یہ راستہ یہودیوں کا ہے۔ اور الضالین کا مصداق عیسائی ہیں۔ یہود کا منہج کیا تھا کہ ان کے پاس علم تھا، معرفت تھی لیکن اس علم کے لیے قبول نہیں تھا، عمل نہیں تھا۔ اور نصاریٰ کا منہج کیا تھا؟ ان کے پاس عمل تھا، عمل کی حرص تھی، جدوجہد تھی، عمل کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے عمل کی اساس علم نہیں تھا۔ اپنی خواہشات، اپنی پسند، اپنا میلان طبیعت ہی ان کا

[1] الفاتحہ 7:1.

اساس تھا کہ جو چیز ہم کو بھاتی ہو، اچھی لگتی ہو وہ کرتے جاؤ۔ اس کو اپناتے جاؤ۔ یہ منہج نصاریٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے منہج یہود کو اپنے غضب اور پھٹکار کا مستحق قرار دیا اور منہج نصاریٰ کو گمراہی اور ضلالت کہا ہے۔ یعنی علم ہو اور عمل نہ ہو یہ یہودیت ہے اور عمل ہو اور اس کی اساس وہ علم نہ ہو جو علم اللہ کا نور ہے، جو اللہ نے اتارا، اللہ کی وحی، کتاب و سنت، قرآن و حدیث تو یہ منہجِ نصاریٰ ہے۔ جو منہج یہود کو اپنائے گا وہ دن رات اللہ کی لعنت، اس کی پھٹکار اور اس کے غضب کا مستحق بنے گا۔ اور جو منہج نصاریٰ کو اپنائے گا وہ گمراہی کا شکار ہے۔ منہج حق کیا ہے؟ ﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ ان لوگوں کا راستہ جن پر تیرا انعام ہوا۔ انعام کن پر ہوا؟ «اَلْقُرْآنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهُ بَعْضًا» قرآن نے اس کی خود تفسیر کردی۔ اللہ نے خود وضاحت فرمادی کہ اللہ کا انعام کن پر اترا۔ فرمایا کہ ﴿مَن يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ﴾ [1] کہ انعام اترا انبیاء پر، صدیقین پر، شہدا پر اور صالحین پر۔ یہ لوگ ہیں «مُنعَمْ عَلَيْهِمْ» جن پر اللہ کا انعام اترا۔ انعام کیوں اترا؟ اس کی ایک ہی اساس ہے۔ اور وہ اساس کیا ہے؟ ﴿مَن يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ﴾ تو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے، یعنی انعام یافتہ لوگ انعام کے مستحق کیوں بنے؟ کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی۔ اب اطاعت میں دونوں باتیں ہیں۔ جو چیزیں یہود و نصاریٰ کے منہج میں نہیں ہیں وہ دونوں لفظ اطاعت میں ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت علم پر قائم ہے۔ اور اطاعت کرنا عمل ہے، یعنی اطاعت میں علم نافع بھی ہے اور عمل صالح بھی ہے۔ اللہ اور

[1] النساء 4:69.

اس کے رسول کی یہ اطاعت کون کرے گا؟ جس کو اللہ اور اس کے رسول کے احکام کا علم ہوگا۔ جس کو کتاب و سنت کی معرفت ہو، وہی اطاعت کرے گا۔ تو اطاعت علم بھی اور عمل بھی۔ جو اس علم نافع کو اپنائے گا اور بالکل اس کے مطابق اس کا عمل ہوگا تو یہ منہج ان لوگوں کا ہے جو دن رات اللہ کے انعام، اس کی رحمتوں، اس کی محبتوں کے مستحق بنتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے جو یہ باب قائم کیا: «اَلْعِلْمُ قَبْلَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ» کہ قول اور عمل سے پہلے علم ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ کوئی بات کرنا چاہو اس کو علم نافع کی میزان پر تول لو کہ یہ بات کرنی چاہیے یا نہیں۔ کوئی بھی بات ہو، کوئی بھی گفتگو ہو۔ اسے علم نافع کی میزان پر تو لو۔ اور کوئی بھی عمل کرنا چاہو تو اس عمل کو بھی علم نافع کی میزان پر پرکھو۔ اچھی طرح تولو اور پرکھو۔ اگر علم نافع کی اساس نہیں ہوگی اور عمل کرتے جاؤ گے تو یہ منہج نصاریٰ ہے۔ دیکھیں شریعت نے خود علم کی تقسیم کر دی ہے۔ نبی علیہ السلام کی احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ علم کی دو قسمیں ہیں۔ نبی علیہ السلام کی ایک دعا ہے: «اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ عِلْمًا نَافِعًا» اے اللہ! میں تجھ سے علم نافع کا سوال کرتا ہوں۔ [1] نبی علیہ السلام کی دعا ہے جس سے یہ ثابت ہوا کہ ایک علم نافع ہوتا ہے۔ نفع دینے والا اور فائدہ دینے والا۔ نبی علیہ السلام کی ایک اور دعا ہے: «اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ» اے اللہ! میں ایسے علم سے تیری پناہ چاہتا ہوں جو نافع نہ ہو۔ [2] ان دونوں حدیثوں سے ثابت ہوا کہ خود نبی ﷺ فرما رہے ہیں کہ علم کی دو قسمیں ہیں: ایک ہے علمِ نافع اور ایک ہے علمِ غیر نافع۔ ایک علم وہ ہے جو نفع دینے والا ہے، دوسرا وہ جو نفع دینے والا نہیں، جو نقصان دینے والا ہے۔ یہ تقسیم خود اللہ کے پیغمبر

[1] سنن ابن ماجہ، حدیث:925. [2] صحیح ابن حبان، حدیث:2440.

نے فرمائی۔ اب علم نافع کیا ہے؟ پہلے یہ بات سمجھیں کہ شریعت کی نگاہوں میں نفع کیا ہے؟ کیا دنیا کی کامیابی ہو، دنیا کی حرص ہو، دنیا کی دولت ہو، بندہ سمیٹتا جائے، دنیا میں ترقی کرتا جائے، کیا یہ نفع ہے؟ یعنی شریعت اس کو نفع مانتی ہے؟ اس کو خیر مانتی ہے؟ شریعت نے تو دنیا کو متاع کہا ہے۔ امام اصمعی لغت کے بڑے امام گزرے ہیں۔ جب انھوں نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پڑھا کہ آخرت کے مقابلے میں دنیا ایک متاع ہے تو انھوں نے سوچا کہ یہ متاع کیا ہوسکتا ہے، یعنی یہ گھاٹے کا سودا، ایک معمولی سامان، یہ معنی جچتا نہیں ہے تاکہ آخرت کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی جو منشا ہے کہ دنیا کی خِسّت اور دنیا کی کم حیثیت وہ اچھے طریقے سے سامنے آئے۔ تو یہ سیدھے سادھے معنی سے پوری نہیں ہوتی۔ یقیناً متاع کا کوئی ایسا معنی ہے جو دنیا کی خست کو اور اس کی نجاست کو واضح کرے۔ تو معنی ان کو سجھائی نہ دیا، چنانچہ انھوں نے سوچا کہ دیہاتوں کی زبان اب تک خالص ہے۔ کسی دیہات میں جاؤں ہوسکتا ہے مجھے متاع کا معنی کسی دیہاتی سے، کسی بوڑھے سے مل جائے کہ پرانی لغت میں متاع کا استعمال کہاں ہوتا ہے۔ ایک دیہات میں چلے گئے تو چونکہ نیت خالص تھی، نیک تھی، اللہ نے فوراً کامیابی دے دی۔ ایک عورت اپنی بیٹی کو آواز دیتی ہے کہ «يَا بُنَيَّتِي! هَاتِ الْمَتَاعَ» بیٹی! متاع لے کر آؤ۔ وہاں پر رک گئے کہ مقصد اللہ نے پورا کردیا۔ اب دیکھوں بیٹی کیا لاتی ہے۔ تو بیٹی کیا لائی؟ وہ کپڑا جو عورت بوقت ضرورت اپنے ایام میں استعمال کرتی ہے، وہ کپڑا لے کر آئی۔ یہ ہے متاع۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ دنیا بمقابلہ آخرت متاع ہے۔ اس کی یہ حیثیت ہے۔ اب اس دنیا کی ترقی اور دنیا کی کامیابی اگر حاصل ہو تو کیا شریعت اسے کامیابی مانتی ہے؟ نفع مانتی ہے؟ شریعت تو کہتی ہے:

﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ﴾ [1] ہماری فہرست میں کامیاب وہ ہے جسے جہنم سے بچا کر جنت میں داخل کردیا جائے۔ جس کے پاس خزانے ہوں، دولتیں ہوں وہ کامیاب نہیں۔ دولتیں تو قارون کے پاس بھی تھیں۔ اتنی دولتیں تھیں کہ اس کی چابیاں اونٹوں کی ایک جماعت اٹھا پاتی تھی۔ لیکن زمین میں دھنسایا جارہا ہے۔ یہ دنیا کی کامیابیاں اور ترقیاں اسے اللہ کی پکڑ سے بچا نہ سکیں۔ تو پھر تقابل کرو کہ شریعت دنیا کی ترقی کو نافع سمجھتی ہے یا آخرت کی کامیابی کو؟ قرآن کا یہ مقام واضح ہے کہ کامیاب تو وہ ہے جسے اللہ جہنم سے بچالے اور جنت میں داخل کردے۔ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ عید کے دن روکھی سوکھی روٹی کھارہے تھے۔ کسی نے کہا: آج تو عید کا دن ہے۔ اور اکثر لوگ گلچھرے اڑا رہے ہیں اور آپ روکھی روٹی کھارہے ہیں۔ فرمایا:

لَيْسَ الْعِيدُ لِمَنْ رَكِبَ الْمَطَايَا   وَ إِنَّمَا الْعِيدُ لِمَنْ تَرَكَ الْخَطَايَا
لَيْسَ الْعِيدُ لِمَنْ لَبِسَ الْجَدِيدَ   وَ إِنَّمَا الْعِيدُ لِمَنْ خَافَ الْوَعِيدَ

عید اس کی نہیں جو اعلیٰ گاڑیوں اور خوبصورت جانوروں پر سواری کرے، عید تو اس کی ہے جو معاصی وخطایا کو ترک کردے، عید اس کی نہیں جو نئے کپڑے پہن لے، عید اس کی ہے جس کے دل میں اللہ کی وعید کا خوف پیوست ہوجائے۔ جو رمضان میں ایسی تربیت کرلے کہ اللہ کی وعیدیں، اللہ کے عذاب، اللہ کا خوف اس کے دل میں بیٹھ جائے اور گھر کر جائے، عید تو اس کی ہے جو توبہ کرلے۔ توبۂ نصوح کرلے، سچی توبہ کرلے۔ تو شریعت ان ظاہری امور کو کامیابی نہیں مانتی۔ شریعت اخروی کامیابی کو کامیابی مانتی ہے۔ اور یہ صحابہ کی تربیت ہے۔ یہ صحابہ کا فہم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے

[1] آل عمران 3:185.

اسی اساس پر صحابہ کی تربیت کی۔ ایک دفعہ جا رہے تھے، ایک قوم کی کچرا گاہ پر جہاں وہ اپنے کچرے پھینکتے تھے ایک مردہ بکری اللہ کے پیغمبر نے دیکھی جس سے تعفن پھوٹ رہا تھا۔ ایک مربی اور مصلح چاہتا ہے کہ اپنے شاگردوں کی، اپنے ساتھیوں کی تربیت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ جب وہ بکری اللہ کے پیغمبر نے دیکھی تو اس بکری کے تعلق سے آپ نے صحابہ کی تربیت کرنا چاہی، چنانچہ کائنات کا سردار اس کچرا گاہ پر کھڑا ہے اور آپ کا مبارک ہاتھ اس بکری کے کان پر ہے اور آپ پوچھتے ہیں کہ «أَيُّكُمْ يُحِبُّ أَنَّ هٰذَا لَهُ بِدِرْهَمٍ؟» تم میں سے کون ہے جو یہ بکری ایک درہم میں خرید لے؟ صحابہ نے کہا کہ یارسول اللہ! یہ مردار ہے، متعفن ہے، اسے تو کوئی دیکھنا گوارا نہیں کرے گا چہ جائیکہ خریدے اور خرید کر گھر لے جائے۔ اسے کون خریدے گا؟ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «فَوَاللّٰهِ لَلدُّنْيَا أَهْوَنُ عَلَى اللّٰهِ مِنْ هٰذَا عَلَيْكُمْ» [1] کہ تمھارے نزدیک جو قیمت اس بکری کی ہے کہ تم اس کو دیکھنا گوارا نہیں کرتے، دنیا اللہ کے نزدیک اس سے بھی گئی گزری اور ہلکی ہے۔ اس لیے فرمایا کہ دنیا کی قیمت اللہ کے نزدیک اگر ایک مچھر کے پَر کے برابر ہوتی، مچھر نہیں مچھر کے پَر کے برابر تو اللہ تعالیٰ کسی بے ایمان کو، کسی کافر یا مشرک کو پانی کا ایک قطرہ بھی نہ دیتا۔ [2] اللہ نے خزانے دے دیے۔ کوئی قدر و قیمت نہیں ان کی۔ تو نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی دعا ہے کہ یا اللہ! مجھے علم نافع عطا فرما اور ایسے علم سے تیری پناہ جو نافع نہ ہو۔ تو نفع کا پہلے تعین کرو کہ نفع دنیا کی کامیابی کا نام ہے یا آخرت کی کامیابی کا نام ہے۔ شریعت یہی کہتی ہے کہ نفع یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ عمل صالح کی توفیق دے دے، آخرت

[1] صحيح مسلم، حديث:2957. [2] جامع الترمذي، حديث:2320.

کی کامیابی عطا فرما دے، جہنم سے بچا لے۔ اپنی رحمتوں کا مستحق قرار دے دے۔ جس شخص کو یہ حاصل ہو جائے وہ نفع میں ہے۔ باقی دنیا کی کامیابی یہ چند دنوں کی راحت کا سامان ہے۔ یہ کامیابی بعض اوقات خیر پر منتج ہوسکتی ہے، لیکن اکثر اس کا نتیجہ ناکامی، نامرادی بلکہ بربادی ہے۔ اس لیے صحابہ دنیا کے خواہش مند نہیں تھے۔ اللہ پاک نے فرمایا ﴿مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا﴾ [1] کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے خواہش مند ہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ایک عجیب قول ہے کہ میرا یہ عقیدہ تھا کہ اسلام لانے کے بعد دنیا کی حرص آ ہی نہیں سکتی۔ طلب ہوگی تو آخرت کی ہوگی۔ اور چونکہ اللہ پاک نے فرمایا کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کی حرص رکھتے ہیں، ان کے اندر دنیا کی خواہش ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس آیت کے نزول کے بعد مجھے یہ ماننا پڑا کہ کچھ دنیا کے حریص بھی ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے میرا یہ عقیدہ تھا اور میں یہ سمجھتا تھا کہ مسلمان دنیا کا حریص نہیں ہوسکتا۔ تو پھر بھائی! نفع جس کو شریعت نفع مانتی ہے وہ دنیا کا نہیں وہ آخرت کا ہے۔ اب جو اللہ کے نبی ﷺ علمِ نافع کا سوال کرتے کہ یا اللہ! مجھے علم نافع عطا فرما دے، یہ کون سا علم ہے؟ یہ وہ علم ہے جس کا فائدہ مَعاد میں ہے۔ یہ وہ علم ہے جو بلند درجات کے حصول کا باعث ہے، جس سے جنت ملتی ہے، جس پر عمل کر کے کامیابی ملتی ہے، جہنم سے بچاؤ، جنت کا حصول، اللہ کی رحمت اور محبت حاصل ہوتی ہے۔ یہ وہ علم ہے جو انسان کو دنیا میں ترقی سے ہمکنار کرتا ہے۔ دنیا کے منصب ملتے ہیں، دنیا کے عہدے ملتے ہیں، دولت کی بہتات اور مال کی کثرت حاصل ہوتی ہے۔ تو اب علمِ نافع کیا ہے؟ یہ بات طے ہوگئی کہ دنیا کی کامیابی، دنیا کا

[1] آلِ عمرٰن:3:152.

نفع اسے شریعت نفع نہیں مانتی۔ نفع تو آخرت کی کامیابی ہے۔ تو پھر وہ علم علم نافع ہے جس کا فائدہ آخرت میں ہو۔

جس علم کا مفاد دنیا کی کثرت ہے وہ علم علم نافع نہیں۔ اب نبی علیہ الصلاۃ والسلام علم نافع کا سوال کرتے ہیں کہ یا اللہ! مجھے علم نافع عطا فرما۔ ثابت یہ ہوا کہ یہ علم نافع دو چیزوں کا نام ہے۔ ایک علم دوسرا اس پر عمل۔ اگر علم آ جائے عمل نہ ہو یہ یہودیت ہے، ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ ان کو معرفت تھی، علم تھا۔ ﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ﴾ [1] اللہ پاک فرماتا ہے کہ ان کے دلوں میں معرفت تھی، یقین تھا، شعور تھا، لیکن زبانوں سے انکار کرتے تھے، مانتے نہیں تھے، قبول نہیں تھا، عمل نہیں تھا۔ اگر علم ہو عمل نہ ہو تو یہ یہودیت ہے۔ بلکہ یہ انسان اللہ کے غضب کا نشانہ بنے گا، کیوں؟ اس لیے کہ ایک جاہل جانتا نہیں اور ایک عالم جانتا ہے۔ جاننے کا معنی یہ کہ اس کے علم کی حجت اس پر قائم ہو چکی ہے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے کچھ طبقات قائم کیے، اس طبقے کو سب سے خطرناک قرار دیا۔ کچھ لوگ علم حاصل نہیں کرتے، عمل بھی نہیں کرتے۔ کچھ علم حاصل نہیں کرتے، اپنی خواہشات کے مطابق عمل کرتے ہیں اور کچھ لوگ علم حاصل کرتے ہیں مگر عمل نہیں کرتے، سب سے خطرناک یہ لوگ ہیں۔ جنھوں نے علم حاصل کیا اور اپنے اوپر علم کی حجت قائم کر لی لیکن عمل نہیں ہے۔ تو ایسا علم علم نافع نہیں ہے۔ ایسا انسان جو اپنے ذہن میں علم اٹھائے پھر رہا ہے، اللہ پاک نے فرمایا: اس کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس کی پشت پر کتابیں لادی ہیں۔ [2] کتابوں کا ذخیرہ کسی گدھے کی پشت پر لاد دو، وہ کتابیں اٹھائے ہوئے جا رہا ہے۔ اس گدھے کو اس میں سے کسی

[1] النمل 14:27. [2] الجمعۃ 5:62.

ایک کتاب کے کسی ایک حرف کا کوئی فائدہ نہیں۔ ایک بوجھ کو اٹھائے پھر رہا ہے۔ اس طرح ایک عالم یا ایک متعلم علم حاصل کرتا ہے، اس کا ذہن علم سے بھرا ہوا ہے۔ اگر عمل نہیں ہے تو اس گدھے کی مانند ہے جو اپنے دماغ پر، اپنے وجود پر اس علم کا ایک بوجھ اٹھائے پھر رہا ہے۔ جدوجہد کی اس نے، گھر بار چھوڑا، محنت کی، علم حاصل کیا، عمل نہیں۔ اگر عالم ربانی ہو تو اس کی بڑی شان ہے۔ بڑی عظمت ہے۔ اللہ اکبر۔ اتنی عظمت کہ دنیا کی ہر بھلائی اس عظمت پہ قربان۔ ابن منیر جنھوں نے تراجم البخاری یعنی ابواب صحیح البخاری لکھے۔ انھوں نے امام بخاری کے ایک ترجمے (باب) سے، اس ترجمے میں ایک حدیث ہے، اس سے علماء کی شان بیان کی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ شان ہم جیسے طلبہ کے لیے کافی ہے۔ وہ شان ہمارا سرمایہ اور ہمارا فخر ہے۔ باب قائم کیا: «بَابُ فَضْلِ الْعِلْمِ» امام بخاری نے یہ باب دو دفعہ قائم کیا۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں یہ تکرار ہے۔ یہ تکرار نہیں ہے۔ دونوں کے الگ معانی ہیں۔ جو پہلا باب فضل العلم ہے۔ (جو ایک نمبر پر ہے) وہ فضل فضیلت سے ہے۔ علم کی فضیلت۔ اور جو دوسرا باب ہے: باب فضل العلم (جو بائیس نمبر پر ہے)، وہ فضل معنی زائد شے ہے۔ فضلہ، یعنی زائد شے، بچی ہوئی چیز۔ اس کے تحت جو حدیث ذکر کی ہے وہ اللہ کے نبی ﷺ کا ایک خواب ہے۔ آپ ﷺ نے فجر کی نماز پڑھائی اور نماز کے بعد آپ نے اپنا ایک خواب بیان کیا کہ میں نے خواب دیکھا، «أُتِيتُ بِقَدَحِ لَبَنٍ» مجھے دودھ کا پیالہ پیش کیا گیا۔ «فَشَرِبْتُ» میں نے دودھ پیا حتیٰ کہ سیراب ہو گیا۔ مجھے کہا گیا کہ اور پیو، میں نے اور پیا۔ اتنا پیا کہ «حَتّٰي إِنِّي لَأَرَى الرِّيَّ يَخْرُجُ فِي أَظْفَارِي» حتیٰ کہ میں نے دیکھا کہ سیرابی میرے ناخنوں تک آ گئی۔ ایک تو سیرابی پیٹ تک ہوتی

ہے لیکن میں نے اتنا دودھ پیا کہ سیرابی بڑھتے بڑھتے ناخنوں تک پہنچ گئی۔ ہاتھ اور پاؤں کے ناخنوں تک۔ اور کافی دودھ باقی بچ گیا، میرے پاس ایک شخصیت بیٹھی ہوئی تھی، وہ دودھ میں نے اس کو پیش کردیا۔ یہ دودھ تم پیو۔ یہ شخصیت امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تھے۔ وہ بقیہ دودھ میں نے عمر کو دے دیا۔ انھوں نے پیا پھر آنکھ کھل گئی۔ صحابہ نے پوچھا: «فَمَا أَوَّلْتَهُ يَارَسُولَ اللّٰهِ؟» یارسول اللہ! آپ نے اس کی تعبیر کیا کی؟ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «اَلْعِلْمَ» [1] اس خواب میں دودھ سے مراد علم ہے۔ جو دودھ میں نے پیا اور بقیہ عمر کو دیا تو یہاں دودھ سے مراد علم ہے۔ اب اکثر علماء اس حدیث سے جو نکتہ سمجھتے ہیں وہ عمر رضی اللہ عنہ کی شان ہے۔ بات درست ہے۔ یہ حدیث جناب عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے مناقب میں شامل ہے۔ لیکن اس سے بھی پہلے یہ حدیث علم اور علماء کی شان ہے۔ میرے بھائی! اگر آپ کا ارتکاز (جماؤ اور ٹھہراؤ) اس علم پر قائم ہو جو اللہ کے نبی کا علم ہے، قرآن و حدیث۔ اگر اس علم پر آپ کا ارتکاز ہے، یہ چونکہ چنانچہ، دائیں بائیں اور یہ فقہ کی موشگافیاں اور یہ فلسفۂ یونانی اور پھر یہ اور راہیں جو آج علمِ صحیح کے نور میں شامل کی جاتی ہیں، اگر یہ نہ ہوں، تمہارا ارتکاز اگر اس خالص علم پر ہو جو مشکاۃِ نبوت سے برآمد ہوا۔ تو گویا آپ اس پیالے سے دودھ پی رہے ہیں جس پیالے سے اللہ کے پیغمبر نے پیا۔ اور اگر اسی علم پر ارتکاز اور اکتفا ہو تو گویا آپ کے ہونٹ اسی مقام پر چسپاں اور لگے ہوئے ہیں جہاں اللہ کے پیغمبر کے ہونٹ لگے۔ «وَنَاهِيكَ بِذٰلِكَ» [2] ابن منیر کے الفاظ ہیں کہ یہ فضل ہمارے لیے کافی ہے اور ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ بس شرط یہ ہے کہ ان علماء اور طلبہ کی صبح و شام قال اللہ

[1] صحيح البخاري، حديث: 82. [2] فتح الباري: 1:237.

اور قال الرسول کے سائے میں گزرے۔ یہ علم خالص ہے۔ یہ نور نبوت ہے۔ یہ منہج خالص ہے۔ بحمداللہ آج اس کے پاسبان مدارس اہل حدیث ہیں۔ یہ سلفی مدارس ہیں۔ باقی مدارس میں یہ چیز بالکل ناپید اور مفقود ہے۔ وہاں ارتکاز علم نبوت پر نہیں ہے۔ وہاں تو چھ چھ سال فلسفہ اور علمِ کلام پڑھایا جاتا ہے۔ جس کا معنی ومقصود اللہ کے پیغمبر کے علم میں تشکیک پیدا کرنا ہے۔ یہ مدارس صحیح اساس پر قائم نہیں ہیں۔ یہ مدارس کتاب وسنت کے انکار پر قائم ہیں کیونکہ ان کی اساس عقل ہے۔ ہمارے مدرسے کی اساس وہ علم ہے جو اللہ کے پیغمبر سے منتقل ہوا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ انسانی عقل وہاں پہنچ کر ختم ہوجاتی ہے جہاں سے اللہ کی وحی شروع ہوتی ہے۔ لیکن باقی لوگ، ان کے مدارس، ان کے مراکز بڑے خطرناک اور بڑے موذی ہیں۔ وہ تو انکار شریعت پر منتج ہیں۔ ایک مثال آپ کو دیتا ہوں۔ وہ شرعی نصوص جو اس چیز کو واضح کرتی ہیں کہ اللہ رب العزت نے بنی آدم کی روحوں کو پہلے پیدا کردیا۔ آپ جانتے ہیں اس پر قرآنی آیات بھی ہیں اور اللہ کے پیغمبر ﷺ کی احادیث بھی۔ بلکہ جو اللہ نے عہد لیا: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ وہ انسانوں کی ارواح سے لیا۔ پھر جیسے یہ انسان پیدا ہوتے گئے وہ روحیں ان کے بدن میں منتقل ہوتی گئیں۔ فلسفہ یونانی اس کو نہیں مانتا۔ انھوں نے خود ایک تقسیم کی کہ ایک چیز ہے جوہر اور ایک چیز ہے جسم اور ایک چیز ہے عرض۔ جسم وہ ہے جو بعض اجزاء سے مل کر بنے اور جوہر وہ چیز ہے جو اپنے قدموں پر قائم ہو اور عرض کو اٹھالے۔ اور عرض وہ ہے جس کا وجود نہ ہو اور وہ جوہر پر قائم ہو۔ یہ تقسیمیں باطل ہیں۔ کوئی پوچھے، اس کا فائدہ؟ عرض وہ ہے جس کا جسم نہ ہو اور وہ جوہر پر قائم ہو۔ اب وہ کہتے ہیں کہ عقل یہ کہتی ہے کہ جوہر کے بغیر عرض کا وجود محال ہے۔ بھئی عرض آئے گا تو جوہر موجود

ہو گا جیسے چینی کی مٹھاس ہے۔مٹھاس ایک عرض ہے۔چینی کا دانہ جوہر ہے۔ یہ مٹھاس تب ہوگی جب یہ دانہ ہوگا۔ یہ دانہ اس مٹھاس کو اٹھاتا ہے۔ اگر کوئی چیز کڑوی ہے تو اس کڑوی چیز کا پہلے وجود ہوگا۔ یہ جوہر ہے اور وہ کڑواہٹ عرض ہے۔ اب یہ کڑواہٹ کڑوی چیز کی محتاج ہے، یعنی جوہر کی محتاج ہے۔اب وہ کہتے ہیں کہ جی اس حدیث کو ہم کیسے مانیں کہ اللہ نے ارواح کو پہلے پیدا کیا کہ روح عرض ہے۔ اس کا جسم نہیں، اس کا وجود نہیں۔ یہ ایک عرض ہے۔ نہ اس کا وزن ہے۔ نہ اس کا جسم ہے۔ نہ اس کا وجود ہے۔ اور روح قائم ہونے کے لیے اس جسم کی محتاج ہے۔جسم بعد میں پیدا ہورہا ہے، ارواح پہلے پیدا ہوچکی ہیں، اس کو ہم کیسے مانیں؟ یعنی شریعت کا فہم ان کے نزدیک ذاتی عقل پر موقوف اور قائم ہے۔ اور حیرانگی کی بات ہے کہ احناف کے یہ مدارس اب تک اس علمِ کلام اور فلسفہ کی سرپرستی کررہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کتاب و سنت کو اس وقت تک پڑھنا ناجائز ہے جب تک فلسفہ نہ پڑھو، علم کلام نہ پڑھو۔ بلکہ اٹھارہ علوم کا تعین کیا کہ جب تک یہ علوم نہ پڑھ لو اس وقت تک اس علم خالص کے قریب نہ جاؤ، چنانچہ سات آٹھ سال ان علوم کی بارش، ان کی بہتات اور پھر آٹھویں سال پورا صحاح ستہ، دیگر کتابیں پڑھتے جاؤ، پڑھتے جاؤ، فہم کی ضرورت نہیں ہے، بس برکت کے لیے کافی ہے۔ میرے بھائی! یہ علم خالص سے عداوت ہے۔ یہ علم خالص نہیں، یہ علم نافع نہیں۔ اتنی سی بات تم نہیں سمجھ سکتے کہ جو اللہ ارواح کو پیدا کررہا ہے، ارواح کو پیدا کرنے پر قادر ہے وہ ان ارواح کو رکھنے پر قادر نہیں؟ کہتے ہیں کہ کہاں رکھنا ہے جسم تو ہے نہیں۔ اللہ تعالیٰ محتاج ہے کیا؟ روح عرض ہے، جسم کی محتاج ہے، اللہ تعالیٰ بھی کسی کا محتاج ہے؟ جس نے ارواح کو پیدا کیا وہ ان کو رکھنے پر قادر نہیں؟

جگہ دینے پر قادر نہیں؟ وہ اللہ کی قدرت کو انسان کی قدرت پر قیاس کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ شریعت کا انکار کرتے ہیں۔ یہ بالکل ایک ظلمت ہے، تاریکی ہے۔ یہ ان لوگوں کے مدارس کے مناہج کا حصہ ہے۔تو میرے بھائی! جو علمِ نافع ہے اس کی سرپرستی بحمداللہ آج یہ بڑے بڑے سلفی مدارس کررہے ہیں، جس کے ترجمان اس علمِ نافع کو عوام الناس تک منتقل کرتے ہیں۔ تو یہ علم نافع ہے۔علم نافع کیا ہے؟ وہ علم جس کی اساس کتاب وسنت ہے اور وہ علم جس پر عمل ہو۔ یہ دو چیزیں اگر جمع ہوجائیں تو وہ علم علم نافع بنتا ہے۔تو بھائی! یہ دونوں جہانوں کی سعادت کی بنیاد ہے، ﴿يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ﴾[1] کہ اللہ تعالیٰ بلندی عطا فرماتا ہے اہل ایمان کو اور خاص طور پر ان لوگوں کو جن کو اللہ نے علم دیا۔ ان کے درجات اللہ بلند فرماتا ہے۔ ان کے لیے رفعت، بلندی اور عروج ہے۔ یہ عروج دنیا کا بھی۔ دنیا میں ان کی عزت اور رفعت۔ اس کی اساس رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «إِنَّ اللَّهَ يَرْفَعُ بِهَذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهِ آخَرِينَ»[2] اللہ تعالیٰ اس کتاب کی برکت سے، اس نورِ علم کی برکت سے قوموں کو ترقی دیتا ہے اور اسی کتاب کے ذریعے قوموں کو ذلیل بھی کرتا ہے۔معنی جو لوگ اس کو پڑھیں گے، اس کو حاصل کریں گے، اس کو اپنالیں گے ان کے لیے ترقی، رفعت اور عروج ہے۔عسفان کے مقام پر امیر عمر رضی اللہ عنہ نافع سے ملتے ہیں۔ یہ نافع بن عبدالحارث رضی اللہ عنہ ہیں، ان کو امیر عمر رضی اللہ عنہ نے مکہ کا امیر بنایا تھا۔عسفان پر آکر یہ ان کو ملے۔فرمایا کہ تم یہاں کیوں؟ اپنے کام کا ذکر کیا۔فرمایا: تمھیں مکہ کا امیر بنایا تھا، اپنی جگہ کس کو امیر بنا کر آئے ہو؟ کہا کہ ابن ابزی

[1] المجادلة 11:58. [2] صحیح مسلم، حدیث: 817.

کو۔ وہ تو غلام ہے، تم نے ایک غلام کو امیر بنا دیا؟ تو نافع نے عرض کیا: وہ غلام تو ہے لیکن «إِنَّهُ قَارِئٌ لِكِتَابِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ، وَ إِنَّهُ عَالِمٌ بِالْفَرَائِضِ» [1] اس کے پاس اللہ کی وحی کا علم بہت ہے۔ اور خاص طور پر علم میراث کا حافظ ہے۔ قرآن کا علم، احادیث کا علم، ان علوم سے اس کا سینہ منور ہے۔ اس لیے میں نے اس غلام کو اپنے بعد امارت کا اہل سمجھا۔ امیر عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے تمھارے نبی ﷺ سے سنا تھا: اللہ تعالیٰ اس کتاب کی برکت سے قوموں کو ترقی دیتا ہے۔ اسی کتاب سے اللہ تعالیٰ قوموں کو ذلت اور تنزل بھی دیتا ہے۔ تو یہ علم دونوں جہانوں کی کامیابی کی اساس ہے۔ دنیا کی سیادتیں اس علم پر قائم ہیں۔ اس لیے امیر عمر کا قول ہے کہ «تَفَقَّهُوا قَبْلَ أَنْ تُسَوَّدُوا» امام بخاری اس کو مکمل کرتے ہیں «وَبَعْدَ أَنْ تُسَوَّدُوا» [2] کہ علم حاصل کرو قبل اس کے کہ تم سردار بنائے جاؤ۔ گویا اگر چاہتے ہو کہ یہ دنیا کی سرداریاں، دنیا کے مناصب صحیح طریقے سے چلیں، اخروی مسئولیت سے بچ سکیں تو اس سے پہلے علم حاصل کرو۔ معنی یہ کہ مناصب بھی اس علم اور فقہ پر قائم ہیں، اس فقاہت پر قائم ہیں کہ سردار بنائے جانے سے پہلے علم حاصل کرو۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ سردار بنائے جانے کے بعد بھی علم حاصل کرو۔ یہ نہیں کہ منصب مل گیا، اب کافی ہے۔ اب طلبہ کے بیچ میں کون بیٹھے؟ نہیں۔ اب بھی بیٹھو، اب بھی علم حاصل کرو۔ اس میں ایک لطیف اشارہ ہے کہ ایک شخص پوری زندگی طلب علم کا محتاج ہے۔ اس لیے اعلم الامۃ محمد رسول اللہ ﷺ صحیح علم اور زیادتِ علم کی دعا کرتے تھے۔ جس سے علم کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اور یہ بات سامنے آتی ہے کہ بندہ ہر حال میں اضافۂ علم کا محتاج ہے۔ ورنہ اللہ کے پیغمبر سے

[1] صحيح مسلم، حديث: 817. [2] صحيح البخاري، قبل حديث: 73.

بڑا عالم کون ہوسکتا ہے! تو کوئی اسٹیج ایسا نہیں ہے کہ بندہ اپنے آپ کو علم میں کامل سمجھے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کیا فرمایا تھا؟ جب لوگوں نے پوچھا: کوئی آپ سے بڑا عالم ہے؟ فرمایا کہ نہیں۔ یہ سوچ کر کہ میں اللہ کا نبی ہوں، اللہ کے نبی کے پاس براہ راست اللہ کے احکام آتے ہیں۔ اور اللہ اپنے پیغمبر کے علم کی اور اس کے فہم کی حفاظت کرتا ہے۔ تو مجھ سے بڑا عالم کون ہوسکتا ہے؟ اللہ پاک نے فرمایا کہ فلاں مقام پر ایک شخصیت بیٹھی ہے خضر علیہ السلام۔ جو علم اس کے پاس ہے وہ تمھارے پاس نہیں ہے۔ جاؤ اس کے پاس اور جا کر علم حاصل کرو۔ چنانچہ لمبا سفر کیا۔ طویل قصہ ہے۔ [1] تو ہر وقت انسان علم کا محتاج ہے اور کسی لمحے وہ اپنے آپ کو علم میں کامل نہیں سمجھ سکتا کہ میں نے مکمل علم حاصل کر لیا۔ اللہ پاک اپنے پیغمبر کو فرماتا ہے: ﴿وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا﴾ یہ مقام بھی علم کی فضیلت کی بڑی قوی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو زیادتِ علم کی دعا کا حکم دے رہا ہے، حالانکہ نعمتیں بہت سی ہیں: صحت ہے، جوانی ہے، دولت ہے۔ بہت سی نعمتیں ہیں مگر اللہ رب العزت کیا حکم دیتا ہے کہ صرف اضافۂ علم کی دعا کرو، یعنی یہ نعمت سب سے بڑی ہے۔ تو بات تھوڑی سی پھیل گئی۔ عرض یہ کرنا چاہ رہا تھا کہ یہ علم، جو آپ نے عنوان قائم کیا، اس میں دونوں جہانوں کی کامیابی مضمر ہے، کیوں؟ میں نے امام بخاری کا ترجمہ آپ کے سامنے پیش کیا، ترجمۃ الباب۔ «بَابُ الْعِلْمِ قَبْلَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ» کہ قول اور عمل سے پہلے علم ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ قول کی صحت اور عمل کی صحت بھی علم پر قائم ہے۔ اگر ایک عمل کا علم صحیح نہ ہو تو عمل قابل قبول نہیں۔ آپ کتنے بڑے بن جائیں اگر آپ کا عمل علمِ خطا پر قائم ہے تو آپ کا وہ عمل قابل قبول

[1] صحيح البخاري، حديث: 4725، و صحيح مسلم، حديث: 2380.

نہیں ہے۔ اس کائنات میں پیغمبر علیہ السلام کے بعد سب سے افضل صحابہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «لَنْ تَمَسَّ النَّارُ مُسْلِمًا» [1] جس آنکھ نے مجھے بحالت ایمان دیکھ لیا اس آنکھ کو جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی۔ اب صحابی سے افضل کون ہوسکتا ہے؟ ایک صحابی نے نماز پڑھی۔ نماز پڑھ کر سلام پھیرنے کے بعد اللہ کے پیغمبر کے پاس آیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا کہ «اِرْجِعْ فَصَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ» جاؤ پھر نماز پڑھو، تم نے نماز نہیں پڑھی، حالانکہ پڑھ چکا ہے۔ فرمایا کہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔ دوبارہ پڑھی۔ پھر فرمایا کہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔ تیسری بار پڑھی۔ پھر فرمایا کہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔ تین بار فرمایا، حالانکہ صحابی ہے۔ پھر اس نے کہا: یارسول اللہ! مجھے سکھا دیجیے۔ جو میں نے پڑھا مجھے یہی معلوم ہے۔ مجھے سکھا دیجیے۔ پھر اللہ کے پیغمبر نے سکھایا۔ اسے پوری نماز معلوم تھی صرف ایک چیز کا علم نہیں تھا اور وہ ہے نماز میں اعتدال۔ رکوع میں جاتا تو کمر سیدھی ہونے سے پہلے کھڑا ہو جاتا۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ رکوع کا لغوی معنی اِنْحِنَاء ہے، جھک جانا۔ ایک بندہ جھک گیا تو رکوع ہوگیا۔ کیا تک ہے اس بات کی۔ کیوں، اس بات کا مقصد کیا ہے؟ اب یہاں دیکھو! نبی علیہ الصلاۃ والسلام فرمارہے ہیں کہ چونکہ تمھارے رکوع میں اعتدال نہیں تھا، تمھاری نماز نہیں ہوئی۔ [2] پوری نماز کا انکار۔ یہاں بندے کا مرتبہ بھی پیش نظر نہیں ہے۔ یہ اللہ کے پیغمبر کا صحابی ہے۔ کوئی بھی ہو۔ تو آپ نے جب اس کو نماز کے بارے میں صحیح علم دیا، پھر اس نے نماز پڑھی اس علمِ صحیح کے مطابق تو اب وہ نماز درست ہوگئی اور قابل قبول ہوگئی۔ تو اس سے کیا ثابت ہوا؟ صحیح عمل قائم ہے صحیح علم پر۔ حج کرنے جاؤ اور حج کا علمِ صحیح نہ ہوتو صحیح حج کیسے کریں

[1] السنة لعمرو الشهباني، حديث: 1484. [2] صحيح البخاري، حديث: 757، و صحيح مسلم، حديث: 397.

گے؟ اب حج کی قبولیت صحیح حج پر قائم ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «وَالْحَجُّ الْمَبْرُورُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلَّا الْجَنَّةُ» [1] کہ حج مبرور کا بدلہ صرف جنت ہے، حج مبرور کیا ہے؟ حج مبرور وہ حج ہے جو اللہ کے پیغمبر کی سنت کے مطابق ہو۔ اب جب تک حج کے تعلق سے اللہ کے پیغمبر کا طریقہ معلوم نہ ہو، اس وقت تک صحیح حج کیسے ہوگا؟ جب حج صحیح نہیں ہوگا تو قابل قبول کیسے ہوگا؟ جب قابل قبول نہیں ہوگا تو پھر وہ سعادتیں اور فضیلتیں جو حج پر قائم ہیں، وہ کیسے حاصل ہوں گی۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: جو شخص صحیح حج کر کے لوٹے وہ ایسے لوٹتا ہے جیسا اس دن تھا جس دن اس کو اس کی ماں نے جنم دیا تھا۔ [2] اس دن اس کے پاس کوئی گناہ نہیں تھا، جیسے اس دن وہ گناہوں سے بالکل پاک صاف تھا، ویسا بن کر لوٹتا ہے۔ تو ویسا کب بنے گا؟ جب حج کے بارے میں اس کی معرفت، اس کا ادراک، اس کا علمِ صحیح ہوگا۔ «عَلٰى هٰذَا الْقِيَاسِ» ام المسائل جو ہے وہ عقیدۂ توحید ہے۔ اگر توحید کی معرفت نہ ہو، توحید کیسے درست ہوگی؟ جبکہ توحید میں خلل آگیا تو اللہ تعالیٰ کوئی نیکی قبول نہیں کرے گا۔ اس سے کیا ثابت ہوا کہ معرفت اور علم یہ اساس ہے صحیح عمل کی، صحیح عقیدے کی اور صحیح نطق اور صحیح گفتگو کی۔ ایک بندے کو معلوم ہے کہ زبان کی بڑی اہمیت ہے تو اپنی زبان سے وہ غلط بول نہیں بول سکتا۔ ایک طرف زنا ہے، زنا کی بڑی بھیانک سزا ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ کو برزخ کا منظر دکھایا گیا کہ اس امت کے زانی ایسے تندور میں بند ہیں جس کا پیٹ بڑا ہے اور منہ چھوٹا ہے۔ پیٹ بڑا اس لیے کہ ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہے۔ وہ تعداد اس کا پیٹ بھر دے گی۔ اور منہ چھوٹا اس لیے کہ اس سے نکل نہیں سکیں گے۔

[1] صحيح البخاري، حديث: 1773، و صحيح مسلم، حديث: 1349. [2] صحيح البخاري، حديث: 1521، و صحيح مسلم، حديث: 1350.

اتنی بڑی سزا، یہ ایک زانی کا انجام ہے۔ [1] مگر پیغمبر علیہ السلام کا فرمان ہے کہ سود کا ایک لقمہ «دِرْهَمُ رِبًا أَشَدُّ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ سِتَّةٍ وَّثَلَاثِينَ زَنْيَةً» ایک درہم سود چھتیس بار کے زنا پر بھاری ہے۔ جسے معلوم ہو کہ زنا کی یہ ہیبت ہے وہ زنا کرے گا؟ نہیں کرے گا۔ جسے معلوم ہو کہ سود کی یہ ہیبت ہے تو وہ سود کھائے گا؟ نہیں کھائے گا۔ اور آگے چلو۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «إِنَّ أَرْبَى الرِّبَا عِرْضُ الرَّجُلِ الْمُسْلِمِ» [2] سب سے بڑا سود یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی زبان سے اپنے کسی بھائی کی عزت سے کھیلے، اس کی غیبت کرے، اس کا نمیمہ کرے، اس کی چغلی کھائے، اور کوشش کرے کہ اپنی زبان سے اس کی عزت کو خراب کرے۔

آپ شرعی احکام کی ترتیب کو دیکھیں تو اس علم کا کتنا فائدہ ہے۔ یعنی ایک بندے کو اگر ساری وعیدیں معلوم ہوں تو وہ زنا کے قریب جائے گا؟ وہ سود کھائے گا؟ کسی کی غیبت کرے گا؟ یعنی گناہوں سے تحرز (بچاؤ)، اور یہ جو تقویٰ اور ورع ہے یہ بھی علم صحیح پر قائم ہے۔ جن لوگوں کو اس کا علم نہیں، جاہل ہیں، وہ یہ سارے کام کر رہے ہیں۔ زنا بھی کر رہے ہیں، سود بھی کھا رہے ہیں، سودی کاروبار بھی کر رہے ہیں اور غیبتیں بھی کرتے ہیں لیکن جس شخص کو شرعی وعیدوں کی معرفت ہو، وہ یہ گناہ نہیں کرے گا۔ «اَلْعِلْمُ قَبْلَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ» کہ قول سے پہلے اور ہر عمل سے پہلے علم ہے۔ جس کے پاس علم کی میزان ہوگی، وہ اپنی ہر گفتگو کو، اپنے ہر بول کو اس میزان پر تولے گا۔ اپنے ہر عمل کو اس میزان پر تولے گا۔ تو پھر دونوں جہانوں کی بہتری کس چیز پر قائم ہے؟ اس استقامت پر کہ بندے کا نطق اور بندے کا عمل بالکل درست ہو۔ اس کا عقیدہ بالکل

[1] صحيح البخاري، حديث: 7047. [2] ضعيف الجامع للألباني، حديث: 2970.

درست ہو۔ الغرض نطق ہو، عمل ہو، عقیدہ ہو، منہج ہو، ان تمام چیزوں کی صحت علم کی صحت پر قائم ہے۔ گویا علم ایک ایسی چیز ہے جو دونوں جہانوں کی کامیابی کی اساس ہے۔ دونوں جہانوں کی کامیابی اس علم نافع میں مضمر ہے۔ تو اس علم کے ساتھ تعلق قائم کریں۔

میرے سامنے طلبہ ہیں۔ میں طلبہ کو نصیحت کروں گا کہ تمھارا علم سے ربط کیسا ہونا چاہیے؟ اس کے لیے بہت سی باتیں ہوسکتی ہیں۔ لیکن میرے عزیز طلبہ! صرف ایک بات کو پلے سے باندھیں بس۔ اللہ پاک نے ارشاد فرمایا کہ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَانًا﴾ [1] اے ایمان والو! اگر تم تقویٰ، پرہیزگاری، ورع اور اللہ کا خوف اختیار کرو تو اللہ تم کو فرقان دے دے گا۔ بس یہ سب سے عظیم دولت ہے۔ فرقان: «اَلشَّيْءُ الَّذِي يُفَرِّقُ بَيْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ، اَلَّذِي يُفَرِّقُ بَيْنَ الْخَطَأِ وَ الصَّوَابِ، اَلَّذِي يُفَرِّقُ بَيْنَ النَّفْعِ وَالضَّرِّ، اَلَّذِي يُفَرِّقُ بَيْنَ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ» یہ فرقان ہے۔ اللہ تم کو فرقان دے گا، کب؟ جب تم تقویٰ اختیار کرو گے، تو اس علمی میدان میں تمھارے لیے جو سب سے قوی ہتھیار ہے وہ تقویٰ ہے۔ یہ تقویٰ اختیار کرلو گے تو جو علم تم کو حاصل ہوگا وہ اتنا مبارک ہوگا کہ وہ فرقان بنے گا۔ حق و باطل میں فرق، نفع و نقصان میں فرق، جنت اور جہنم میں فرق، قبول اور رد میں فرق، مقبول اور مردود میں فرق، صحیح اور غلط میں فرق بتائے گا۔ اور یہی تو علم کی شان ہے۔ یہ علم کثرت مسائل کا نام نہیں ہے۔ امام مالک فرمایا کرتے تھے: «لَيْسَ الْعِلْمُ بِكَثْرَةِ الْمَسَائِلِ» یہ علم کثرت مسائل کا نام نہیں ہے کہ آپ فلسفیانہ موشگافیاں، منطق اور جناب اس قسم کے جو اصول اور قواعد ہیں ان کی بہتات کو علم سمجھیں۔ یہ

[1] الأنفال 8:29.

سوال، اس کا یہ جواب، یہ سوال یہ جواب۔ یہ علم نہیں ہے۔ علم، وہ نور ہے کہ تم کو ایک ایسا ملکہ حاصل ہو جائے، جو حق و باطل میں فرق کرے تا کہ حق کو قبول کرو اور باطل کو چھوڑ دو۔ خطا اور صواب میں فرق کر دے تا کہ صواب کو سینے سے لگا لو اور خطا کو مسترد کر دو۔ مقبول اور مردود میں فرق کر دے تا کہ مقبول کو اختیار کر لو اور مردود کو چھوڑ دو۔

اور ہمیں کیا چاہیے! تو اے عزیز طلبہ! تمھارے طلبِ علم میں سب سے قوی ہتھیار تقویٰ ہے۔ اور تقویٰ کیا ہے؟ گناہوں سے اپنے آپ کو بچانا۔ تمھاری زندگی پاک صاف ہو۔ تقویٰ اور طہارت کے آئینہ دار بن جاؤ۔ تبھی تو اللہ پاک نے فرمایا کہ ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَٰٓؤُا﴾ [1] کہ صحیح خشیت علماء کے دل میں ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ عالم وہ ہے جس میں خشیت ہو۔ اور اگر علم کے خزانے تو ہوں، خشیت نہ ہو، اس کا علم اس کو اللہ کے ساتھ مربوط نہ کر سکے، اللہ کے ساتھ جوڑ نہ سکے تو وہ عالم نہیں ہے۔ پھر اس کا معنی یہ ہوگا کہ علم کا بوجھ تو ہے لیکن یہ مانند اس گدھے کے ہے جس کے اوپر کتابوں کا بوجھ ہے۔ وہ گدھا کسی ایک کتاب سے بھی مستفید نہیں ہو سکتا۔

اور یہاں میرے بہت سے دوست اور احباب باہر سے آئے ہیں۔ اس طلبِ علم کے تعلق سے ان کے لیے بھی ایک نصیحت ہے۔ پہلے وہ میرے لیے، پھر آپ کے لیے۔ وہ نصیحت یہ ہے کہ علماء کے ساتھ تعلق جوڑ کر اس علم نافع سے آپ منسلک ہوں۔ یہ بات یاد رکھو کہ طلب علم کا جو سب سے قوی راستہ ہے، وہ علماء ہیں۔ علماء کے پاس جانا، ان سے سماع کرنا، ان کے سامنے بیٹھنا، ان کی صحبت اختیار کرنا، حصولِ علم میں یہ سب سے قوی طریق ہے۔ اس کی دلیل اللہ پاک کا فرمان ہے۔ فرمایا کہ ﴿فَسْئَلُوٓا أَهْلَ الذِّكْرِ

[1] فاطر 28:35.

إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ [1] جب تمھیں کہیں کسی چیز کا علم نہ ہو تو اہل ذکر سے سوال کرو۔ ذکر کا معنی ہے قرآن و حدیث۔ ایسے علماء سے جن کے سینے قرآن و حدیث کے زیور سے آراستہ ہیں، ان سے سوال کرو۔ ان کی صحبت میں بیٹھو، ان سے تعلق جوڑو، ان سے استفادہ کرو۔ یہ طلبِ علم کا سب سے مبارک اور قوی راستہ ہے۔ اس میں ایک مرفوع حدیث بھی ہے۔ امام طبرانی اور دیگر محدثین نے ذکر کی ہے۔ ابن حجر ؒ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے کہ «إِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ وَالْفِقْهُ بِالتَّفَقُّهِ» [2] کہ علم تعلم سے حاصل ہوتا ہے اور فقہ تفقہ سے آتی ہے۔ یہ علم اور فقاہت علماء سے حاصل کی جائے۔ یہ مرفوع حدیث ہے۔ پیغمبر علیہ السلام کا فرمان ہے: «تَسْمَعُونَ وَيُسْمَعُ مِنْكُمْ وَيُسْمَعُ مِنَ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ مِنْكُمْ» [3] کہ یہ علم تم مجھ سے سنتے ہو، تم سے آگے لوگ سنیں گے، ان سے آگے سنیں گے اور یہ سماع کا سلسلہ قیامت تک قائم رہے گا۔ تو سماع کب ہوگا؟ جب علماء کے پاس جاؤ گے۔ ان کی صحبت اختیار کرو گے تب یہ سماع ہوگا۔ وہ لوگ غلطی پر ہیں جو سمجھتے ہیں کہ کتابیں لے آؤ، وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔ سارا دن ڈیوٹی۔ اب رات کو کچھ گھنٹے نکال کر وہ کتابیں پڑھ لیں گے اور علم حاصل ہو جائے گا۔ میرے بھائی! تیرے پاس ٹائم کیوں نہیں؟ وہ دنیا کا عمل جو تجھے علم نافع سے اور علم معاد سے غافل کر دے تو اس کاروبار پر لعنت۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے کہ «طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ» [4] یہ طلبِ علم ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔ تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ ہمارے پاس طلب علم کا وقت نہیں؟ کیسے یہ کہہ سکتے ہو؟ میرے بھائی! یہ ایک بڑی لعنت ہے کہ ایک شخص کے پاس علماء کے پاس جانے کا اور طلبِ علم

[1] النحل 43:16. [2] المعجم الكبير للطبراني: 394/14. [3] المستدرك للحاكم: 132/1.
[4] سنن ابن ماجه، حديث: 224.

کا وقت نہ ہو۔ یہ بڑی نحوست بلکہ ایک نجاست ہے کہ ٹائم کیوں نہیں؟ تم دنیا کے پہلو
کو دین کے پہلو پر مقدم کیوں سمجھتے ہو؟ یہ شریعت تمھاری تربیت کرنا چاہتی ہے کہ یہ
دنیا تو اس مردہ بکری سے بدتر ہے۔ اس کی خاطر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمھارے پاس علماء کے
پاس جانے کا وقت نہیں، چنانچہ رات کو ایک ایک گھنٹہ نکال کر ہم کتابیں پڑھ لیں۔
کتابیں پڑھنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کتابیں پڑھنے کے دو مرکزی نقصان ہیں:
ایک نقصان تو یہ کہ اس میں وقت کا ضیاع ہے۔ مثال کے طور پر آپ نے ایک مسئلہ
معلوم کرنا ہے اور آپ تلاش کر رہے ہیں، ورق گردانی کر رہے ہیں، گھنٹہ گزر گیا،
دو گھنٹے گزر گئے، چار گھنٹے گزر گئے آپ کو مطلوب حاصل نہیں ہوا۔ وقت ضائع ہوا یا
نہیں؟ یہی سوال اگر آپ کسی عالمِ ربانی کے پاس جا کر کریں ایک منٹ میں جواب
دے دے گا۔ تو وقت کے ضیاع سے محفوظ ہو جاؤ گے۔ ایک طرف آپ کہتے ہیں کہ
میرے پاس وقت نہیں کہ علماء کے پاس جا کر سیکھوں، دوسری طرف گھنٹوں آپ یہاں
صرف کر سکتے ہیں۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ کتابوں کی کوئی قیمت نہیں، کتابوں کی قیمت
ہے لیکن علماء کے ربط کے ساتھ کتابوں کی قیمت ہے، علماء سے ربط کے بغیر کتابوں کی
کوئی قیمت نہیں۔ امام اوزاعی ﷫ بڑے محدثین میں سے ہیں، تابعی ہیں، امام مالک
کے شیخ ہیں۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ «كَانَ هٰذَا الْعِلْمُ كَرِيمًا يَتَلَقَّاهُ الرِّجَالُ
بَيْنَهُمْ حَتّٰى دَخَلَ فِي الْكُتُبِ، فَإِذَا دَخَلَ فِي الْكُتُبِ دَخَلَ فِيهِ غَيْرُ أَهْلِهِ»[1]
کہ یہ علم بڑا محترم تھا۔ علم حدیث بڑا پاکیزہ، بڑا محترم حتی کہ یہ علم آہستہ آہستہ کتابوں
میں داخل ہو گیا۔ جب کتابوں میں داخل ہوا تو ان کتابوں کے ذریعے سے علم میں بہت

[1] المدخل إلى السنن الكبرىٰ للبيهقي: 2/123، رقم 606.

سے نااہل لوگ داخل ہو گئے۔ جب کتابوں میں داخل ہوا تو بہت سے لوگوں نے
کتابیں خریدیں، حاصل کیں، خود ہی پڑھا، خود ہی سمجھا، اپنے فہم کے مطابق عمل کیا،
فتوے دیے، فتویٰ غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔ اس لیے سماع بڑا بابرکت ہے۔ علماء کے پاس
جانا، ان سے سماع کرنا یہ بڑی مبارک چیز ہے۔ ان علماء کا عمل، تقویٰ اور ورع بھی
اس گفتگو کے ساتھ آپ کے سینے میں منتقل ہوگا۔ کتابوں میں یہ شان نہیں ہے۔ اس کی
افادیت ہے لیکن یہ افادیت علماء کے ساتھ تعلق سے ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بہت
سے ایسے نام مل سکتے ہیں جنھوں نے مدارس کا رخ نہیں کیا، علماء سے نہیں پڑھا بلکہ
کتابیں لے لیں۔ لائبریری بہت بڑی ہے، ان میں بیٹھ گئے اور پڑھنا شروع کر دیا۔
مرضی کا پڑھا، مرضی کا سمجھا اور مفتی بن گئے، ان لوگوں کے بڑے نقصانات ہیں۔ یہ
امت کے لیے مہلک ہیں۔ امت کے لیے تباہی اور بربادی کا باعث ہیں۔ تو کتابوں
کی افادیت ربط بالعلماء کے ساتھ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جب تمھیں کسی
چیز کا علم نہ ہو تو یہ نہیں کہا کہ کتاب خرید کر لے آؤ اور اس سے اپنی تشنگی دور کر لو، فرمایا:
﴿فَسْـَٔلُوْٓا﴾ سوال کرو۔ اہل ذکر سے، علماء سے سوال کرو، ان سے پوچھو، ان سے مسائل
حل کراؤ۔ تو یہ ایک نصیحت ہے کہ آپ علماء سے تعلق رکھیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ آپ
کے دلوں میں علماء کی محبت اور ان کا احترام اجاگر ہو۔ یاد رکھو کہ یہ طبقہ بڑا رفیع القدر
طبقہ ہے۔ ایک طالب عالم ہونے کی حیثیت سے مجھ پر بھی یہ فرض ہے کہ علماء کا احترام
کروں۔ یہ سب سے اونچا طبقہ ہے۔ براہِ راست اللہ کے پیغمبر کے ترکے کا وارث۔
اور کوئی وارث نہیں۔ براہِ راست اللہ کا محبوب طبقہ، اللہ پاک نے فرمایا: ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ
وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی۔ یا اللہ تو راضی کن سے ہوتا ہے؟

یہ مقام رضا کس کے لیے؟ فرمایا کہ ﴿ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ﴾ [1] یہ ان کے لیے ہے جو اللہ سے ڈر جائے۔ اور اللہ سے ڈرنے والے کون ہیں؟ ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ [2] تو جن کے دلوں میں خشیت ہے ان سے اللہ راضی ہے۔ تو اللہ کی رضا علماء کے لیے ہے۔ یہ اللہ کے پیغمبر کے وارث ہیں۔ اللہ کے بھی قریب، کے پیغمبر کے بھی قریب۔ اس حدیث کا مصداق آپ نے دیکھا کہ یہ لوگ وہ لوگ ہیں جو اس پیالے سے پی رہے ہیں جس پیالے سے اللہ کے پیغمبر نے پیا۔ اور وہ چیز پی رہے ہیں جو اللہ کے پیغمبر نے پی ہے اور اس مقام پر اپنے ہونٹ رکھے ہوئے ہیں جہاں اللہ کے پیغمبر کے ہونٹ تھے۔ کتنا محترم ہے یہ طبقہ! کتنا مبارک ہے یہ طبقہ! اسی لیے بہت سے علماء کا یہ قول ہے، خاص طور پر محمد بن سیرین کا، فرماتے ہیں: کوئی عالم فوت ہو جائے اسلام میں شگاف پڑ جاتا ہے، اس شگاف کو کوئی چیز پُر نہیں کر سکتی۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا: لوگوں کی ہلاکت کی نشانی کیا ہے؟ قومیں کب برباد ہوتی ہیں؟ تو مقصد یہ تھا کہ بعض اوقات زلزلہ آتا ہے، طوفان آتا ہے، سیلاب آتا ہے، لوگوں کو لے ڈوبتا ہے تو اصل ہلاکت کیا ہے؟ فرمایا کہ «إِذَا مَاتَ عَالِمُهُمْ» جب ان کا عالم فوت ہو جائے۔ علماء کی قدر، ان کی مصاحبت، ان کے علم سے استفادہ، یہ آپ کے لیے سب سے ایک قیمتی اثاثہ ہے۔ فتنوں کے اس دور میں خاص طور پر علم کی اہمیت بڑھتی ہے، علماء کی اہمیت بڑھتی ہے، ان مدارس کو قائم ہونا چاہیے، علماء پیدا ہونے چاہئیں۔ اپنی اولاد کو طلب علم کے لیے وقف کرو۔ اپنی اولاد کو آپ سائنس پڑھائیں، جدید ٹیکنالوجی سے متعارف کرائیں، اس کو منصب مل سکتا ہے، دنیا کی دولتیں مل سکتی ہیں، کروڑ ہا روپے

[1] البینۃ 98:8. [2] فاطر 35:28.

کا وہ مالک بن سکتا ہے لیکن جب آپ کی میت سامنے ہو اور آپ کے بیٹے کو آپ کے جنازے پر پڑھنے کے لیے جنازے کی دعا بھی یاد نہ ہو تو لعنت ہے اس سارے کاروبار پر۔ آپ نے سکھا دیا، پڑھا دیا، ڈاکٹر بنا دیا اور ٹیکنالوجی سے متعارف کرا دیا۔ آج تیری لاش پڑی ہے اور تیرے بیٹے کو تجھ پر پڑھنے کے لیے دعا یاد نہیں۔ اور تیرے لیے یہ سرمایہ افتخار ہے کہ میرا بیٹا ڈاکٹر ہے۔ یہ میرے موضوع کا دوسرا رخ ہے۔ یہ سنا ہے کہ بی بی سی پر کچھ پروگرام نشر ہوئے ہیں جن میں علمِ جدید کا، علمِ دین سے، علمِ نبوت سے بڑے گھٹیا طریقے سے تقابل پیش کیا گیا ہے۔ یہ لوگ بڑے احساس کمتری میں مبتلا ہیں جن کی سوچ اور فکر ان کی پشتوں سے بڑی بیمار ہے اور انتہائی گھٹیا ہیں۔ میں نے یہ مکمل پروگرام نہیں سنا، سنوں گا ان شاء اللہ۔ اس لیے ہمارے اس پروگرام کا دوسرا رخ جو ہے اس کا موضوع اور پہلو یہ ہے کہ علم حدیث کا اور علم جدید کا تقابل۔ علم جدید دنیا میں اور آخرت میں بھی ہمارے لیے نافع ہے یا علم دین؟ ہم صرف آخرت کی بات نہیں کرتے، ہم یہ ثابت کریں گے کہ علم دین ہی دنیا کی اصلاح کا پروگرام ہے۔ یہ دنیا کا علم نہیں، علم دین ہی ہے۔ تو یہ بڑا اہم حصہ ہے۔ ان شاء اللہ جو آئندہ پروگرام ہوگا وہ اسی موضوع کی تکمیل ہوگا۔ اس میں ان شاء اللہ یہ ساری بیمار سوچ اور دھوکا دہی شریعت کی روشنی میں آپ کے سامنے پیش کی جائے گی۔ ابھی اسی پر اکتفا کرتا ہوں، اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہم کو علم نافع اور عمل صالح پر قائم رکھے۔

«وَأَقُولُ قَوْلِي هٰذَا وَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِي وَلَكُمْ وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ»

کیا نیکی بھی تباہی و بربادی کا سبب بن سکتی ہے؟

کیا نیکی بھی تباہی و بربادی کا سبب بن سکتی ہے؟

خطبہ مسنونہ:

﴿قُلۡ هَلۡ نُنَبِّئُكُمۡ بِالۡاَخۡسَرِيۡنَ اَعۡمَالًا ○ اَلَّذِيۡنَ ضَلَّ سَعۡيُهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَهُمۡ يَحۡسَبُوۡنَ اَنَّهُمۡ يُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمۡ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فَلَا نُقِيۡمُ لَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وَزۡنًا ○ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمۡ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوۡا وَاتَّخَذُوۡۤا اٰيٰتِىۡ وَرُسُلِىۡ هُزُوًا ○﴾ [1]

محترم سامعین حضرات! آج کا موضوع آپ نے سن لیا ہے: کیا نیکی بھی بربادی کا باعث بن سکتی ہے؟ جو بات عمومی ادلہ سے ثابت ہے وہ تو یہی ہے کہ نیکی شرعاً مطلوب اور ہم سب کی ضرورت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی پوری برادری، اپنی پھوپھی، اپنی بیٹی سب کو مخاطب کر کے فرمایا تھا: عمل کرو اور اپنے آپ کو جہنم سے بچالو، یعنی عمل جہنم سے بچاتا ہے۔ نیک اعمال دنیا اور آخرت کی بہتری کا باعث ہیں۔ ﴿اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجۡعَلُ لَهُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا ○﴾ [2] جو لوگ ایمان لاتے ہیں، عمل صالح کرتے ہیں رحمٰن، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے لیے محبتیں پیدا

[1] الکہف 18:103-106. [2] مریم 19:96.

فرماتا ہے۔ ان سے محبت کرتا ہے اور پوری دنیا کے دل میں ان کی محبت ڈال دیتا ہے۔ تو یہ نیک عمل کا فائدہ ہے۔ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۝﴾ [1] کہ جو لوگ ایمان لاتے ہیں، نیک عمل کرتے ہیں ان کی مہمان نوازی جنت الفردوس میں ہے۔ یہ نیک عمل کا فائدہ ہے۔ سورۃ المومنون، اٹھارہواں پارہ جہاں سے شروع ہوتا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ نے بہت سے نیک اعمال کا ذکر کیا، نماز کا، زکاۃ کا، دیگر بہت اعمال صالحہ کا اور آخر میں فرمایا کہ ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ﴾ [2] یہ وہ لوگ ہیں جو جنت الفردوس کے وارث ہیں۔ یہ سب نیک اعمال کے فائدے ہیں۔ سورۂ معارج میں اسی طرح کا مضمون ہے۔ بہت سے نیک اعمال کا ذکر کیا اور آخر میں اللہ رب العزت نے اخروی کامیابی کی خبر دی۔ یوں بھی فرمایا: ﴿وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ [3] نیک عمل انسانوں کو خسارے سے بچاتا ہے۔ یہ خسارہ خواہ دنیا کا ہو خواہ آخرت کا ہو۔ تو عمل صالح جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا یہ تو محض خیر ہی خیر ہے۔ لیکن اس کے باوجود اللہ رب العزت نے کچھ بندوں کے اعمال کے حوالے سے خبر دی ہے کہ وہ اعمال ان کے کام نہیں آئیں گے۔ نیکی ہر حال میں کارآمد ہے۔ لیکن کچھ بندوں کی نیکی کسی صورت کارآمد نہیں ہے۔ بلکہ ان کے لیے نقصان دہ ہے۔ جیسے سورۃ الغاشیہ کا مضمون ہے: ﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَةِ ۝ وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝ تَصْلٰى نَارًا حَامِیَةً ۝﴾ [4] اللہ تعالیٰ نے بہت سے لوگوں کی خبر دی کہ ان کے چہرے ذلیل ہوں گے اور انتہائی سیاہ ہوں گے۔ آگے فرمایا کہ ﴿عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝﴾ یہ عمل

[1] الکہف 107:18۔ [2] المؤمنون 10:23، 11۔ [3] العصر 103:1-3۔ [4] الغاشیۃ 88:1-4۔

کرنے والے تھے اور عمل بھی تھوڑے نہیں بلکہ کرکر کے تھک جاتے تھے۔ بے پناہ محنتیں، ریاضتیں، مشقتیں لیکن ﴿تَصْلٰى نَارًا حَامِیَةً ۝﴾ ان کے چہرے سیاہ ہوں گے اور جہنم کی آگ ان کا مقدر ہوگی، یعنی عمل صالح کے باوجود۔ ﴿وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ۝﴾ [1] قیامت کے دن بہت سے لوگ بہت زیادہ نیکیاں لائیں گے، ان نیکیوں کو ھباءً منثوراً کر دیا جائے گا، ذروں میں بکھیر دیا جائے گا، ضائع کر دیا جائے گا۔ تو بہت سے لوگوں کے اعمال ان کے لیے بربادی کا پیغام ہیں۔ یہ کون لوگ ہیں اور کون سے عمل ہیں؟ کون سی نیکیاں ہیں؟ دراصل یہ جو اعمال ہم کرتے ہیں اچھے ہوں یا برے، ان اعمال کو دیکھنے والا اور ان اعمال کی جزا دینے والا اللہ رب العزت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمارے عمل سے کیا دیکھتا ہے؟ یہ ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ رب العزت ہر چیز سے باخبر ہے اور بڑا باریک بین ہے۔ ﴿لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ﴾ انتہائی باریک بین اور ہر چیز سے باخبر۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَخْفٰى عَلَیْهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ ۝﴾ [2] یہ ساتوں آسمان ہیں، ساتوں زمینیں ہیں، اللہ رب العزت پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ سیاہ رات ہو اور پہاڑ کی سیاہ چٹان ہو اور اس کی تہ میں سیاہ رنگ کا کیڑا رینگ رہا ہو، چیونٹی چل رہی ہو، اللہ اپنے عرش پر اسے دیکھتا بھی ہے اور اس کے رینگنے کی آواز سنتا بھی ہے۔ اس سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ اب وہ باریک بین، لطیف وخبیر ذات جو بندے کے ہر عمل سے واقف ہے۔ بندے کی نیکیوں سے وہ کیا دیکھنا چاہتا ہے؟

① ایمان، کہ عمل کرنے والا مومن ہے۔ کافر کا عمل قابل قبول نہیں۔ یا ایسا مومن جو

[1] الفرقان 23:25۔ [2] آلِ عمرٰن 5:3۔

ایمان کا دعویٰ کرے، لیکن اس کے ایمان میں انحراف ہو یا کوئی بگاڑ ہو کوئی خرابی ہو، اس کا عمل قابل قبول نہیں ہے۔ اللہ پاک کا فرمان ہے: ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً﴾ [1] کہ جو نیک عمل کرے خواہ مرد ہو یا عورت، اتنا کافی نہیں بلکہ وہ مومن بھی ہو، یعنی عمل صالح کرنے والے کا مومن ہونا ضروری ہے۔ ﴿مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا﴾ [2] کہ جو نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت ہو اور وہ مومن بھی ہو تو یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ ایک کھجور کی گٹھلی کے پردے کے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا، یعنی مومن ہونا ضروری ہے۔ ﴿وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا﴾ [3] یہ جو لوگ ارادۂ آخرت کریں اور اس کے لیے عمل کریں اور مومن بھی ہوں۔ معلوم ہوا کہ یہ عمل کافی نہیں بلکہ عمل کی اساس ایمان ہے، اس کا مومن ہونا ضروری ہے۔ تو ﴿فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا﴾ ان لوگوں کی ہر کوشش کی قدر کی جائے گی، ورنہ نہیں۔ اگر عمل کرتے ہیں لیکن ایمان نہیں یا ایمان صحیح نہیں ہے، ایمان درست نہیں ہے تو ان کی کوئی کوشش قابل قبول نہیں، ہر کوشش ضائع ہے، برباد ہے۔ لیکن اگر مومن ہیں تو عمل کے ساتھ ساتھ ان کی ہر کوشش کی قدر کی جائے گی۔ تو اللہ رب العزت ہر عمل کرنے والے سے پہلے تو اس کا ایمان دیکھتا ہے کہ بندہ مومن ہے یا نہیں۔ اس کا ایمان صحیح ہے یا نہیں۔ ایمان کے چھ ارکان ہیں جن کا ذکر حدیث جبریل میں ہے۔ جو انسانی شکل میں آئے تھے اور نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے ایمان کی تعریف

[1] النحل 16:97. [2] النسآء 4:124. [3] بني إسراء يل 17:19.

پوچھی تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ» [1] اللہ کو مانو، اللہ کے رسولوں کو مانو، کتابوں کو، فرشتوں کو مانو، آخرت کو اور اچھی و بری تقدیر کو مانو۔ یہ چھ اصولِ ایمان ہیں۔ ان تمام چیزوں کے بارے میں صحیح علم ہو، وہ علم جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مراد اور منشا کے مطابق ہو۔ ان چھ ارکان کے بارے میں کوئی خرابی نہ ہو اور کسی لمحے اللہ اور اس کے رسول کی منشا اور مراد سے انحراف نہ ہو، یہ ایمان ہے۔ جیسا ایمان مطلوب ہے اللہ تعالیٰ کے بارے میں، اللہ کے رسولوں کے بارے میں، اللہ تعالیٰ کی کتابوں کے بارے میں، اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کے بارے میں وہ ایمان ہے جس کی اللہ نے خبر دی ہے۔ جس کا احادیث میں ذکر اور بیان ہے۔ وہ ایمان قطعاً اپنی مرضی کا نہ ہو، اپنی خواہشات کا نہ ہو۔ رات لیاری کے پروگرام میں میں نے مثال دی تھی کہ جیسے یہودی ہیں، عیسائی ہیں یہ اپنے نبی کو مانتے ہیں۔ عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں، یہودی عزیر علیہ السلام کو مانتے ہیں، لیکن ان کا ماننا کیسا ہے؟ عیسائیوں نے کہا کہ عیسیٰ اللہ کا بیٹا ہے اور یہودیوں نے کہا کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے۔ اب مانتے تو ہیں، ایمان کا دعویٰ تو ہے لیکن یہ دعویٰ اللہ کی منشا کے خلاف ہے۔ یہ ایمان صحیح نہیں ہے۔ ایسا شخص عمل کرتا رہے، محنتیں کرتا رہے، سجدوں پر سجدے کرے، قیام اللیل کرے، اس کی کوئی نیکی، کوئی عبادت عنداللہ مقبول نہیں۔ تو ایمان ایک بنیادی شرط ہے۔ جیسے آج کل لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کا ایمان کیسا ہے؟ ایک شعر مروج اور مشہور ہے:

وہی جو مستویٔ عرش تھا خدا ہو کر اتر پڑا مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

[1] صحیح مسلم، حدیث: 8.

اللہ کے بارے میں نظریہ کہ وہ مستوی عرش تھا، اب نہیں ہے۔ وہ خدا تھا، اس کا اپنا مفہوم ہے، خدا اب نہیں ہے۔ اور جب نبی کی بعثت کا ذکر آیا تو وہ مصطفیٰ بن کر مدینے میں اتر آیا۔ جو اب تک خالق تھا آج مخلوق بن کے مدینے میں آ گیا۔ اب عرش پر کوئی نہیں ہے۔ مدینے میں آیا، ایک عمر گزاری اور پھر قبر میں چلا گیا۔ اب بتائیں اس کہنے والے کا ایمان مقبول ہے؟ نہ اس نے اللہ کو مانا نہ اللہ کے رسول کو مانا۔ دعویٰ ہے اس کا۔ لیکن یہ ایمان خالق کائنات کی منشا کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مراد کے خلاف ہے۔ اب یہ شخص یا جو بھی اس عقیدے کا حامل ہے ہر سال حج کرے، عمرے کرے، نفل پڑھے، فرض پڑھے، زکاتیں دے، صدقات دے، نمازیں پڑھے، سجدے کرے، اس کی کوئی نیکی عنداللہ مقبول نہیں ہے۔ تو جس باریک بین ذات نے عمل کو قبول کرنا ہے، عمل کا اجر دینا ہے، وہ دیکھ رہا ہے کہ اس کا ایمان صحیح نہیں ہے۔

ایمان کا دعویٰ تو ہے لیکن اس کے ایمان میں اللہ کی توہین ہے، اللہ کے رسول کی توہین ہے۔ نبی علیہ الصلوۃ والسلام کا فرمان ہے: «لَاتُطْرُونِي كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارَى ابْنَ مَرْيَمَ» مجھے میری حد سے آگے نہ بڑھاؤ، جیسے عیسائیوں نے مریم کے بیٹے کو ان کی حد سے بڑھا دیا۔ «فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدُهُ» [1] میں اللہ کا بندہ ہوں، «فَقُولُوا: عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُولُهُ» تم بھی مجھے یہی کہو: اللہ کا بندہ اور اللہ کا رسول۔ ان حیثیتوں کے ساتھ مجھے مانو۔ یہ کہتے ہیں کہ نہیں ہمیں ان حیثیتوں سے نہیں ماننا۔ ہمیں تو تب چین آئے گا جب اس مخلوق کو ہم خالق بنا دیں، الٰہ بنا دیں، تو یہ ایمان مستقیم نہیں ہے۔ قطعاً غیر مقبول ہے۔ تو ایسا بندہ جو عمل کرے گا وہ عمل اس کے کسی کام نہ آئے گا بلکہ وبال جان بن جائے گا۔ یہ بندہ

[1] صحيح البخاري، حديث:3445.

مبتلائے شرک ہے جو خالق کائنات کی جناب میں سب سے بڑی معصیت ہے۔ مشرک کے لیے جنت حرام ہے۔ اور ہمیشہ کے لیے جہنم واجب ہے۔ اب ایک شخص عمل کر رہا ہے۔ حاصل کچھ نہیں بلکہ دائمی جہنمی ہے۔ جنت ہمیشہ کے لیے حرام ہے۔ تو اس کا عمل کس کام کا؟ تو اللہ تعالیٰ ہر عمل کرنے والے کی اساس کو دیکھتا ہے، اس کی بنیاد کو دیکھتا ہے کہ یہ مومن ہے یا نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: «لَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ حَتّٰى تُؤْمِنُوا» [1] اس وقت تک تم جنت میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک تمھارا ایمان صحیح نہ ہو۔ خیبر کے موقع پر آپ نے صحابہ کو بھیج کر منادی کرائی تھی، اعلان کرایا تھا کہ «لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ إِلَّا مُؤْمِنٌ» [2] لوگو! جنت میں صرف مومن داخل ہوگا۔ تو اللہ رب العزت جو بندوں کے اعمال دیکھتا ہے، چیک کرتا ہے، وہ ہر عمل کرنے والے کی اس بنیاد کو دیکھتا ہے کہ مومن ہے یا نہیں۔ اس کے ایمان میں گڑبڑ تو نہیں، اس کے ایمان میں انحراف تو نہیں۔ اس موقع پر ہم یہ نصیحت کریں گے کہ اپنے ایمان کی اصلاح کیجیے۔ ایمان کے چھ ارکان ہیں۔ ایمان باللہ کیا ہے؟ اس کے تقاضے کیا ہیں؟ خالق کائنات کی توحید، اس کی عظمت، اس کے رسولوں پر ایمان، کتابوں پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، روزِ آخرت پر ایمان، تقدیر پر ایمان۔ ان سارے امور کو پڑھیں، کتب موجود ہیں۔ مشائخ موجود ہیں۔ اور ایمان بالکل درست ہونا چاہیے۔ اب ایک شخص فرشتوں کو مانتا ہے اور ان کو متصرف ہونے کی حیثیت سے مانتا ہے۔ ہم نے کئی تعویذ دیکھے ہیں: یا جبریل، یا میکائیل ان کو پکارا جا رہا ہے۔ تو ملائکہ کا نام تو لے رہا ہے۔ لیکن ملائکہ کی جو صفات ہیں ان صفات میں غلو ہے۔ یہ ماننا، ماننا نہیں ہے۔ یہ

[1] شعب الإيمان للبيهقي، حديث:8746. [2] صحيح البخاري، حديث:4204.

مانا قابل قبول نہیں ہے۔ یہ گستاخی ہے۔ ایک چپڑاسی کو آپ کہیں کہ یہ پی، ایچ، ڈی ہے۔ اس کی آپ نے عزت نہیں کی، اس کا آپ نے مذاق اڑایا۔ فرشتے اللہ کے بندے ہیں، متواضع ہیں، جن کے تواضع کا عالم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی امر کا فیصلہ فرماتا ہے تو ان پر بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے۔ قرآن کہتا ہے: فرشتوں کو اطلاع ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی فیصلہ صادر فرمانے والا ہے تو یہ سنتے ہی فرشتوں پر بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے، پھر آہستہ آہستہ ہوش آتی ہے۔ تب تک اللہ کا فیصلہ جاری ہو جاتا ہے اور وہ ملائکہ تک پہنچتا ہے اور تب ان کو سکون ملتا ہے۔[1] ادھر ہم نے ان کو متصرف اور قاضی الحاجات بنا لیا، ان کو پکارنا، ان سے حاجات طلب کرنا اور کیا کچھ بنا دیا۔ تو ملائکہ کا نام تو لیا، لیکن ملائکہ پر ایمان مستقیم نہیں ہے۔ اب ایسا شخص نمازیں پڑھے، روزے رکھے، کسی کام کے نہیں ہیں۔ ان کی نیکیاں سب برباد ہیں۔ ایمان کے چھ ارکان ہیں ان کی معرفت، صحیح فکر، صحیح ایمان ضروری ہے۔ ورنہ کوئی نیکی قبول نہیں ہوگی۔

ایمان بالقدر، تقدیر پر ایمان، صحیح مسلم میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے، اور اس قسم کا قول رائے سے نہیں کہا جا سکتا۔ محدثین نے اس کو مرفوع کا حکم دیا ہے کہ «لَوْ أَنَّ لِأَحَدِهِمْ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا فَأَنْفَقَهُ مَا قَبِلَ اللّٰهُ مِنْهُ حَتّٰى يُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ»[2] اگر کوئی احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کر دے، تو اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرے گا جب تک اس کا تقدیر پر ایمان نہ ہو۔ تقدیر پر ایمان بھی ایمان کا رکن ہے۔ جب تک تقدیر پر صحیح ایمان نہ ہو احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کر دے، اللہ قبول نہیں کرے گا۔ یہ چھ ارکان ہیں۔ ایمان ہے لیکن اللہ اور اس کے رسول کی منشا کے خلاف ہے تو اللہ تعالیٰ کسی نیکی کو

[1] سبا 23:34، و صحیح البخاري، حدیث:4701. [2] صحیح مسلم، حدیث:8.

قبول نہیں کرے گا۔ الٹا اس انسان کے لیے وہ نیکی نقصان دہ ثابت ہوگی۔ یہ ہم آخر میں بتائیں گے کہ نقصان دہ کیسے ہے۔

دوسری چیز جو اللہ تعالیٰ ہر عمل کرنے والے سے دیکھتا ہے کہ عمل کرنے والے کا اخلاص کیسا ہے؟ اس کی نیت کیا ہے؟ میرے لیے مخلص ہے یا نہیں؟ ﴿وَمَآ أُمِرُوٓا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾[1] لوگوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کریں۔ ﴿فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾[2] اخلاص کے ساتھ اللہ کو پکارو۔ اخلاص ایک شرط ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ» سارے اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ «وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى»[3] ہر شخص کو اس کے عمل سے کیا ملے گا؟ جو وہ نیت کرے گا۔ جو اس کے عمل کی نیت ہوگی وہ اس کو مل جائے گا۔ عمل چھوٹا ہو، بڑا ہو، نیت اگر اللہ کی رضا ہے، اللہ کو خوش کرنا، اللہ کو دکھانا تو اللہ راضی ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ اس کا اجر دے گا۔ نیت اگر ریاکاری کی ہے، دنیا کو دکھانا، دنیا کی واہ واہ، دنیا کی تعریفیں تو اس کو وہی کچھ حاصل ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی ثواب نہیں، کوئی اجر نہیں۔ «رُبَّ قَتِيلٍ بَيْنَ الصَّفَّيْنِ اللّٰهُ أَعْلَمُ بِنِيَّتِهِ»[4] ایک شخص قتل ہو کر دو صفوں کے بیچ میں گر جاتا ہے۔ ایک اسلامی صف، دوسری کفار کی صف تو یہ دو صفوں کے بیچ میں قتل ہو کر گر گیا۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام اشارہ یہ دے رہے ہیں کہ یہ صف اول کا غازی تھا، صف اول کا مجاہد اور جم کر وہیں لڑتا رہا حتی کہ شہید ہو کر وہیں گر گیا۔ نیکی بہت بڑی ہے لیکن «اَللّٰهُ أَعْلَمُ بِنِيَّتِهِ» اس کی نیت کا حال اللہ جانتا ہے۔ یہ عمل کافی نہیں ہے۔ اس کی نیت کیا تھی یہ دیکھا جائے گا۔ اتنا بڑا عمل،

[1] البينة 5:98. [2] المؤمن 14:40. [3] صحيح البخاري، حديث:1. [4] ضعيف الجامع، حديث:1404.

زخموں سے چور ہوگیا، خون بہا دیا، جان قربان کردی لیکن ابھی تک اس نیکی کی کوئی حقیقت نہیں جب تک یہ نیکی اخلاص پر قائم نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کی نیت دیکھے گا۔ اس سارے عمل میں یہ بندہ اگر اللہ کے ساتھ مخلص تھا تو اللہ قبول کرلے گا۔ مخلص نہیں تھا تو اللہ فرعون اور ہامان سے پہلے اسے جہنم میں ڈال دے گا۔ عمل بہت بڑا ہے مگر اخلاص نہیں تھا۔ تو اللہ لطیف وخبیر ہے۔ عمل کرنے والے کے دل کو دیکھتا ہے کہ اس میں اخلاص ہے یا نہیں۔ ریاکاری ہوگی تو عمل برباد ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کچھ بندوں کو پکارے گا، ان کو مرائین کہہ کر پکارے گا۔ ریاکارو! جن کو تم نے دکھایا تھا، جن کے لیے تم نے نیکیاں کی تھیں، ان کے پاس چلے جاؤ، کچھ ملتا ہے تو لے لو۔ میرے پاس کوئی جزا نہیں، کوئی بدلہ نہیں۔ [1] کتنی بڑی بربادی ہے، ہلاکت ہے۔ یہ بندے بظاہر خوش ہوں گے کہ ہمارے پاس ڈھیروں نیکیاں ہیں، لیکن کسی نیکی کا ثواب نہیں ملے گا۔ اچانک یہ صورت حال بن جائے گی، ان کو علم ہوگا کہ ہماری سب نیکیاں برباد، ہمیں جنت کی طلب کی امید تھی اور ہم جہنم میں داخل کیے جارہے ہیں۔ بلکہ یہ ریاکار وہ لوگ ہیں جن پر جہنم سب سے پہلے بھڑکائی جائے گی۔ صحیح مسلم کی حدیث معروف ہے، آپ سنتے رہتے ہیں۔ جس میں ایک قاریِ قرآن کا، ایک سخی اور ایک شہید کا قصہ موجود ہے۔ تینوں اللہ کے سامنے پیش ہوں گے۔ کیا عمل کیا؟ قاری قرآن کہے گا: «تَعَلَّمْتُ الْعِلْمَ وَ عَلَّمْتُهُ وَ قَرَأْتُ فِيكَ الْقُرْآنَ» میں نے تیری خاطر علم اور قرآن سیکھا۔ فرشتے کہیں گے: «كَذَبْتَ» تو جھوٹ بولتا ہے۔ حالانکہ پوری زندگی سیکھا اور سکھایا۔ فرشتے جھوٹا کیوں کہہ رہے ہیں؟ اس لیے کہ فرشتوں کی لسٹ میں اس کا نام

[1] المعجم الكبير للطبراني: 4/213.

ہی نہیں۔ اگر تو نے پوری زندگی قرآن سیکھنے اور سکھانے کی اتنی بڑی نیکی کی ہوتی تو تیرا نام ہمارے پاس ہوتا۔ تیرا نام تو ہے ہی نہیں۔ تو جھوٹ بول رہا ہے۔ تو نے کیا پڑھا اور پڑھایا، تیرا تو نام ہی نہیں۔ کسی اندراج کے قابل نہیں ہے، حالانکہ نیکی بہت بڑی ہے۔ دوسرا سخی، تم نے کیا عمل کیا؟ میں نے مال خرچ کیا۔ ہر مناسب جگہ پر اپنا مال خرچ کیا، بلکہ مال لٹا دیا۔ فرشتے پھر «كَذَبْتَ» کہیں گے۔ جھوٹا ہے۔ تیرا نام تو ہے ہی نہیں۔ تیسرا، تم نے کیا عمل کیا؟ «قَاتَلْتُ فِيكَ حَتَّى اسْتُشْهِدْتُ» تیری راہ میں قتال کیا، جہاد کیا حتیٰ کہ شہید ہوگیا۔ فرشتے پھر «كَذَبْتَ» کہیں گے۔ تیرے نام کا اندراج ہی نہیں ہے۔ اللہ فرمائے گا کہ نہیں، تینوں درست کہہ رہے ہیں۔ انھوں نے عمل کیے ہیں۔ اس نے قرآن پڑھا اور پڑھایا۔ اس نے سخاوتیں کیں اور یہ میدان جہاد میں گیا، لڑا حتیٰ کہ پورا خون بہادیا۔ جان قربان کردی۔ عمل تینوں کا موجود ہے۔ لیکن تینوں کا عمل اخلاص سے خالی ہے۔ اس کی نیت یہ تھی: مجھے قاریِ قرآن کہا جائے۔ علامہ اور فہامہ کہا جائے۔ دوسرے کی نیت یہ تھی کہ مجھے سخی کہا جائے، حاتم طائی کہا جائے۔ اور تیسرے کی نیت یہ تھی کہ میری بہادری کے چرچے ہوں، بہادری کی داستانیں بنیں۔ تینوں کو ان کی نیتیں حاصل ہوچکیں۔ فرشتو! ان کو پکڑ لو اور چہروں کے بل گھسیٹتے ہوئے لے جاؤ اور جہنم میں ڈال دو۔ فرمایا کہ یہ وہ تین افراد ہیں جن پر سب سے پہلے جہنم کو بھڑکایا جائے گا۔ [1] یہ ایک عمل ہے لیکن قبولِ عمل کی بنیادی شرط سے عاری ہے۔ اللہ تعالیٰ عمل کرنے والے کے دل کو دیکھتا ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث ہے کہ «إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُوَرِكُمْ وَ أَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلَى

[1] صحيح مسلم، حديث: 1905.

قُلُوبِكُمْ وَ أَعْمَالِكُمْ»[1] اللہ رب العزت تمھاری صورتیں نہیں دیکھتا، تمھارے جسم نہیں دیکھتا، تمھارے مال نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمھارے دلوں کو دیکھتا ہے، پھر اعمال کو دیکھتا ہے۔ پہلے دل پھر اعمال۔ عمل کرنے والے کا دل کیسا ہے؟ سچا ایمان ہے یا نہیں؟ سچی توحید ہے یا نہیں؟ ایمان میں کوئی دراڑ تو نہیں؟ اخلاص ہے یا نہیں؟ اگر یہ ساری باتیں شریعت کی مرضی اور مراد کے مطابق موجود ہیں تو اس کی نیکی قابل قبول ہے اور اگر نہیں تو اس کی نیکی مردود ہے۔ تو اللہ رب العزت عمل کرنے والے کے ایمان کو دیکھتا ہے۔ اللہ رب العزت عمل کرنے والے کے اخلاص کو دیکھتا ہے۔

تیسری چیز اللہ تعالیٰ عمل کرنے کے لیے احتساب کی شرط لگاتا ہے۔ احتساب کا معنی کیا ہے؟ اس سے اکثر لوگ غافل ہیں۔ احتساب کا معنی یہ ہے کہ میں نے اس عمل کا اجر اللہ سے لینا ہے۔ احتساب، اللہ تعالیٰ سے اجر کی امید سے نیکی کی جائے۔ اگر اجر کی امید نہیں ہے، اجر کا طمع نہیں ہے تو پھر نیک عمل اور عمل معتاد، وہ عمل جو آپ عادتاً کرتے ہیں، اس میں فرق نہیں۔ عملِ معتاد اور عمل صالح کے درمیان جو نقطۂ فارق ہے وہ احتساب ہے۔ عادتاً جو عمل ہوتا ہے اس میں ثواب کی نیت نہیں ہوتی۔ لیکن جو اللہ کے لیے نیکی ہوتی ہے اس میں ثواب کی نیت ہونی چاہیے۔ یہ ایک شرط ہے۔ امام بخاری نے باب قائم کیا: «بَابُ مَاجَاءَ أَنَّ الْأَعْمَالَ بِالنِّيَّةِ وَالْحِسْبَةِ» عمل کرنا نیت کے ساتھ اور حِسبہ کے ساتھ احتساب ہی سے ہے، یعنی اجر کی امید سے۔ نیت کا مفہوم آپ نے سن لیا کہ نیت میں اخلاص ہو، احتساب کیا ہے؟ کہ آپ عمل کریں اجر کی نیت سے۔ امام بخاری نے آگے حدیث ذکر کی کہ «نَفَقَةُ الرَّجُلِ عَلَى أَهْلِهِ

[1] صحيح مسلم، حديث:2564.

يَحْتَسِبُهَا فَهُوَلَهُ صَدَقَةٌ»[1] اللہ کے نبی نے فرمایا کہ ایک شخص کا اپنے اہل پر خرچ کرنا، ان کو کھلانا، ان کو پلانا، ان کو پہنانا، ان کا علاج کرنا، اپنے اہل پر، اپنے بچوں پر، اپنی بیوی پر، فرمایا کہ یہ صدقہ ہے بشرطیکہ اس خرچ میں اس کی ثواب کی نیت ہو۔ امام بخاری کی فقاہت آپ دیکھیں۔ امام بخاری کیا بتانا چاہتے ہیں؟ کہ اپنے اہل پر خرچ کرنے والے لوگ دو طرح کے ہیں۔ کچھ وہ لوگ ہیں جو خرچ کرتے ہیں لیکن ثواب کی نیت نہیں ہوتی، عادتاً، ہر معاشرے میں بچوں پر خرچ کرنا، کھلانا پلانا ضروری ہے۔ یہ ایک امرِ معتاد ہے۔ اکثر لوگ خرچ کرتے ہیں لیکن احتساب کی نیت بہت تھوڑے لوگوں کی ہوتی ہے۔ ایک امر معتاد ہے۔ پوری فیملی ہے ان کو کھلانا ہے، پلانا ہے۔ ان کے لیے کمانا ہے۔ بیمار ہوں تو علاج کرنا ہے۔ سب یہ کام کرتے ہیں لیکن ثواب کی نیت بہت تھوڑے لوگوں کی ہوتی ہے۔ احتساب شرط ہے۔ اس عمل کا ثواب کب ملے گا؟ جب اللہ سے اجر کی امید ہو۔ تبھی پیغمبر علیہ السلام نے یہاں «يَحْتَسِبُهَا» کہ یہ شخص اپنے اہل پر خرچ کرے، ان کو کھلائے، ان کو پلائے، ان کا علاج و معالجہ کرے اور یہ سب کام کرے احتساب کی نیت سے کہ اللہ سے اس کا اجر لینا ہے۔ جب احتساب کی نیت ہوگی تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «فَهُوَلَهُ صَدَقَةٌ» یہ صدقہ ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے صدقے کا ثواب دے گا۔ یہ شریعت کی خیر و برکت ہے کہ کھلا اپنے بچوں کو رہا ہے اور اللہ فرما رہا ہے کہ تو نے ہمیں صدقہ دیا۔ اور ہر صدقہ مجھ پر قرض ہے۔ اس کا میں نے صلہ دینا ہے۔ جو اللہ نے قرض لینا ہے تو اللہ کیسے لوٹائے گا؟ کتنا دے گا؟ کتنا بڑا بدلہ دے گا؟ غور کیجیے! تو اللہ تعالیٰ اس نفقے کو صدقہ بنا رہا ہے۔ جو نفقہ آپ

[1] صحيح البخاري، قبل حديث:54.

نے اپنے بچوں پر کیا لیکن ثواب کی نیت سے۔ اکثر لوگ ثواب کی نیت نہیں رکھتے۔ ایک امر عادی سمجھ کر یہ کام کرتے ہیں، کھلاتے ہیں، پلاتے ہیں۔ سبھی کرتے ہیں لیکن احتساب کی نیت بہت کم ہی لوگوں کی ہوتی ہے۔ تو قبولِ عمل میں، عمل کے اجر میں احتساب شرط ہے۔ نبی ﷺ کی بہت سی احادیث میں اس کی شرط موجود اور قائم ہے۔ جیسے: «مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَلَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ» [1] جو رمضان کے روزے رکھے دو شرطوں کے ساتھ: ایک ایمان کی حالت میں، اس کا پہلے ذکر کیا، دوسری احتساب کی، جس کا ذکر ہو رہا ہے۔ دو شرطیں ضروری ہیں۔ صحت ایمان بھی ضروری ہے اور احتساب بھی کہ روزہ رکھ رہا ہوں، روزے کا اجر اور صلہ میں نے اللہ سے لینا ہے۔ یہ نیت ہو، میں نے گناہوں کی بخشش کے، جنت کے اللہ کے وعدے لینے ہیں۔ جنت الفردوس میں نے حاصل کرنی ہے۔ یہ نیت ہو۔ احتساب «مَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ إِيمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَلَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ» [2] ایک ہی معنی ہے۔ وہی دو شرطیں ہیں۔ اور ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «مَنِ اتَّبَعَ جَنَازَةَ مُسْلِمٍ إِيمَانًا وَّاحْتِسَابًا» [3] اپنے کسی مسلمان بھائی کے جنازے میں شریک ہوا ایمان کے ساتھ اور احتساب کے ساتھ، وہی دو شرطیں۔ تو پھر اس کے لیے قیراط لکھا جائے گا، قیراط ایک اجر ہے جس کا حجم احد پہاڑ کے برابر ہے۔ اپنے بھائی کے جنازے میں شریک ہو جائے اللہ اس کو ایک قیراط اجر دے گا۔ ایک قیراط لکھا جائے گا۔ وہی دو شرطیں: ایمان اور احتساب۔ اکثر لوگ اس سے غافل ہیں۔ ہر عمل آپ کریں، ضرور کریں لیکن احتساب کے ساتھ کہ یا اللہ! یہ عمل کر رہا ہوں تجھ سے اس

[1] صحيح البخاري، حديث: 38. [2] صحيح البخاري، حديث: 1901. [3] صحيح البخاري، حديث: 47.

کا اجر لینا ہے۔ بہت سی احادیث میں اس احتساب کا ذکر ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے، اللہ فرماتا ہے: «إِذَا أَخَذْتُ كَرِيمَتَيْ عَبْدِي وَاحْتَسَبَ لَمْ أَرْضَ لَهُ ثَوَابًا دُونَ الْجَنَّةِ» [1] جب میں اپنے بندے کی دو محبوب چیزوں کو لے لوں، یعنی اس کی دو آنکھیں لے لوں، اس کو نابینا کر دوں، پھر وہ صبر کرے «وَاحْتَسَبَ» اور اپنے نابینا ہونے پر اللہ سے اجر کی امید لگا لے۔ نابینا ہو گیا، ایک بڑی خوفناک تکلیف ہے اس پر صبر کر لے اور اللہ سے اجر کی امید لگا لے، یہ دو شرطیں ہیں ساتھ۔ فرمایا کہ «لَمْ أَرْضَ لَهُ ثَوَابًا دُونَ الْجَنَّةِ» میں اس کے بدلے اسے جنت دے دوں گا۔ اس کا بدلہ جنت کے سوا کچھ نہیں۔ یہاں بھی احتساب کی شرط ہے۔ بہت سی احادیث میں یہ شرط آپ کو ملے گی۔

اگر آپ معجم کا مطالعہ کریں احتساب کے باب میں، حسبہ کے باب میں تو ایسی بے شمار حدیثیں آپ کو ملیں گی۔ رسول اللہ ﷺ نے بہت سے اعمال کے لیے احتساب کی شرط لگائی ہے۔ انسان اللہ سے اجر لینے کی امید سے نیکی کرے۔ میں نے قدرے تفصیل اس لیے کر دی کہ بہت سے لوگوں کا ایک عجیب عقیدہ ہے، جیسے صوفیاء کا۔ صوفی کہتے ہیں کہ اگر ہم عمل کریں جنت کے حصول کے لیے تو یہ لالچ ہوگی۔ ہمیں لالچ نہیں ہے۔ ہم تو اللہ کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔ جہنم میں جاؤ۔ لالچ؟ اللہ تعالیٰ ایک عظیم انعام کا وعدہ کرے اور آپ اس کی ناقدری کریں کہ ہمیں جنت نہیں چاہیے۔ ہمیں جنت کی طلب نہیں ہے یہ لالچ ہے اور یہ عمل لالچ پر قائم ہوگا۔ کہاں سے یہ سوچ آ گئی؟ یہ باطل فکر کہاں سے آ گئی؟ اللہ تعالیٰ انعام کے وعدے کر رہا ہے، اپنی اس نعمت

[1] صحيح ابن حبان، حديث: 2930.

کو پیش کر رہا ہے اور آپ کہتے ہیں: ہمیں اس کی طلب نہیں۔ بتاؤ تو ان احادیث کا کیا معنی کرو گے کہ احتساب کیا ہے؟ یہ ساری نیکیاں احتساب کے لیے، اللہ سے اجر لینے کے لیے، جنت لینے کے لیے، اس کی رضا لینے کے لیے۔ تو صوفیوں کی یہ فکر باطل ہے۔ عمل میں احتساب شرط ہے۔ تو آپ جب بھی عمل کریں، نماز پڑھیں، روزہ رکھیں، حج کرنے جائیں تو احتساب کی نیت آپ کے ساتھ ساتھ ہو۔ اس نیت کو قائم رکھیں کہ اس عمل کا اللہ سے اجر لینا ہے۔ اللہ سے جزا لینی ہے۔ جو اس عمل کی جزا کے وعدے ہیں، وہ لینے ہیں۔ اس کی امید ہے، اس کا طمع ہے۔ اس کی لالچ ہے۔ اس کے حصول کی کوشش ہے۔ احتساب کی یہ نیت ساتھ ساتھ ہو۔ اگر دل احتساب کی نیت سے خالی ہے تو ایک بنیادی شرط سے آپ محروم ہیں جس کا بے شمار مقامات پر ذکر ہوا ہے۔ یہ تین چیزیں ہوگئیں۔ اللہ رب العزت عمل کرنے والے کے ان امور کو دیکھتا ہے: اس کا ایمان وعقیدہ، پھر اس کا اخلاص، پھر اس کا احتساب۔

چوتھی چیز: اللہ تعالیٰ نے ہر عمل کے لیے ایک ہستی کو نمونہ بنا کر بھیجا ہے۔ ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ [1] تمھارے لیے ہر عمل میں علی الاطلاق ایک ہستی نمونہ ہے۔ عقیدہ ہو، احکام ہوں، معاملات ہوں، عبادات ہوں، کوئی عمل ہو۔ ایک ہستی نمونہ ہے۔ اس کی تم نے اتباع کرنی ہے۔ اس کی پیروی کرنی ہے۔ تمھارا ہر عمل اس نمونے کے مطابق ہونا ضروری ہے جس کو میں نے نمونہ بنا کر بھیجا ہے۔ میں نے یہ شرط لگادی ہے کہ ﴿وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا﴾ [2] اگر میرے پیغمبر کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے ورنہ نہیں۔ ﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا

[1] الأحزاب 21:33. [2] النور 54:24.

اَعْمَالَكُمْ﴾ [1] اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو برباد نہ کرو۔ نتیجہ آپ کے سامنے واضح ہے۔ اطاعت کرو گے اعمال مقبول اور محفوظ ہیں۔ اطاعت نہیں کرو گے اعمال برباد ہیں، ضائع ہیں۔ تو اللہ رب العزت نے ہر عمل کے لیے اس شخصیت کو نمونہ بنایا۔ اب اللہ تعالیٰ ہر شخص کے عمل میں اس نمونے کو دیکھتا ہے۔ یہ بندہ نماز پڑھ رہا ہے، یہ نماز میرے پیغمبر کی نماز کے مطابق ہے یا نہیں۔ یہ حج کرنے جارہا ہے، اس کا طریقۂ حج میرے پیغمبر کے طریقۂ حج کے مطابق ہے یا نہیں۔ ہر عمل میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع دیکھی جائے گی۔ اگر پیغمبر علیہ السلام کی اتباع کارفرما ہے تو عمل قابل قبول ہے۔ اگر اتباع کارفرما نہیں ہے تو وہ عمل مردود ہے۔ نہ صرف یہ کہ مردود ہے بلکہ اس عمل کو بدعت کہا گیا ہے۔ ہر نئی چیز بدعت ہے۔ ہر بدعت گمراہی ہے۔ ہر گمراہی جہنم کی آگ ہے۔ اس سے بڑی بربادی کیا ہوسکتی ہے۔ بندہ نیکیاں کر رہا ہے بڑے شوق سے لیکن جہنم کی آگ اس کا مقدر ہے۔ وجہ کیا ہے؟ اس کا عمل ایک بنیادی جوہر سے محروم ہے اور وہ جوہر محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع ہے۔

اللہ پاک نے ہمیں اس لیے پیدا کیا تاکہ ہمارے عمل کو دیکھے۔ ﴿الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ [2] کہ احسن عمل کون کرتا ہے؟ اور احسن عمل اللہ کے پیغمبر کی اتباع ہے۔ فضیل بن عیاض رحمہ اللہ احسن عمل کی تعریف کرتے ہیں کہ احسن عمل کے دو معنی ہیں: ایک اَخْلَصَ دوسرا اَصْوَبَ۔ اخلص کا معنی اللہ کے لیے خالص ہو اور اصوب کا معنی رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپ کے طریقے کے مطابق ہو۔ امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے: «اَلسُّنَّةُ كَسَفِينَةِ نُوحٍ» رسول اللہ ﷺ کی سنت نوح علیہ السلام

[1] محمد 33:47. [2] الملك 2:67.

کی کشتی کی طرح ہے۔ اللہ اکبر۔ بڑی تاریخی بات ہے۔ کیوں، کشتی کی طرح کیوں؟ نوح علیہ السلام کی کشتی جب تیار ہوگئی اس وقت نجات کا اور کوئی راستہ نہیں تھا سوائے کشتی کی سواری کے۔کوئی شخص پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جائے پانی وہاں بھی آجائے گا۔ کھجور کے اونچے تنے پر چڑھ جائے پانی وہاں بھی آئے گا۔ جہاں مرضی چلا جائے پانی اس کا تعاقب کرکے اس کو غرق کرے گا۔ آج کے دن نجات دہندہ ایک ہی چیز ہے اور وہ کشتیِ نوح ہے، سفینۂ نوح علیہ السلام ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لوگو! ہر دور میں نبی علیہ الصلوۃ والسلام کی سنت کی حیثیت نوح علیہ السلام کے سفینے کی ہے۔ تمھارے لیے نجات اللہ کے پیغمبر کی سنت کی سواری پر ہے۔ «مَنْ رَّكِبَهَا نَجَا وَ مَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرِقَ» جو اس سفینے پر سوار ہوگا، سنت کو اپنائے گا، وہ نجات پائے گا اور جو اس سفینے سے پیچھے رہ گیا جہاں مرضی چلا جائے، کسی قلعے میں چلا جائے، پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جائے آخر کار وہ برباد ہوگا، تباہ ہوگا، غرق ہوگا۔ بڑی عظیم بات ہے۔ تو یہ نبی علیہ الصلوۃ والسلام کی سنت کی اہمیت ہے۔ جو عمل نبی علیہ الصلوۃ والسلام کے طریقے اور آپ کی سنت کے خلاف ہوگا وہ عمل قابل قبول نہیں ہے۔ اس عمل کو بدعت کہا گیا ہے اور کامیابی کا راستہ سنت پیغمبر علیہ السلام کی اتباع ہے۔ دیکھیں یہ دعا ہے: «رَضِيتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّ بِالْإِسْلَامِ دِينًا وَّ بِمُحَمَّدٍ رَّسُولًا وَّجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ» [1] کہ میں راضی ہوں اللہ کو رب مان کر، اسلام کو دین مان کر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول مان کر تو اس کے لیے جنت واجب ہوگئی۔ یہ عقیدے کی باتیں ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میرے رسول ہیں۔ میں اس کو مانتا ہوں، اس پر راضی ہوں۔ یہ راضی ہونا کیا ہے؟ اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کے طریقے پر اکتفا کرنا راضی ہونا ہے۔ نہ

[1] سنن أبي داود، حديث: 1529.

اس کے آگے کچھ اور نہ اس کے پیچھے کچھ۔ آپ کے طریقے کی پیروی کرنا، اس کو اپنا لینا کہ میں اس پر راضی ہوں۔ بندہ ایسا ہی بن جائے۔ ہر عمل میں نبی علیہ الصلوۃ والسلام کی سنت کو قائم کرے۔ تو اللہ رب العزت ہر عمل کرنے والے کے عمل کو دیکھتا ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو قابل قبول ہے اور اگر نہیں تو پھر کیا ہے؟ وہی جو اللہ کے پیغمبر نے فرما دیا: «مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَّيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ» [1] کہ جو شخص کوئی ایسا عمل کرے جس پر ہمارا امر نہیں ہے، وہ عمل ہمارے امر کے خلاف ہے۔ اس عمل کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ عمل مردود، ضائع اور برباد ہے۔

صحابہ کی مثالیں آپ کے سامنے موجود ہیں۔ بعض موقعوں پر ایسا عمل ہوگیا جو اللہ کے پیغمبر کی سنت اور طریقے کے خلاف تھا۔ آپ نے رد فرما دیا۔ آپ کے سامنے ایک شخص نے نماز پڑھی۔ پوری نماز درست تھی صرف ایک غلطی کر گیا اعتدال کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اِرْجِعْ فَصَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ» [2] جاؤ پھر نماز پڑھو، یہ نماز ہوئی ہی نہیں۔ تو کیا اہمیت ہے اس عمل کی۔ کئی آج نمازیں پڑھنے والے نماز کی بیسیوں سنتوں کے تارک ہیں۔ اس نے تو ایک عمل میں غلطی کی۔ فرمایا: نماز ہوئی ہی نہیں۔ جو رسول اللہ کی بیسیوں سنتوں کے تارک ہیں۔ یہ نمازیں کیسے ہوں گی۔ کہاں قابل قبول ہوں گی۔ تبھی رسول اللہ کا فرمان ہے: «رُبَّ مُصَلٍّ لَّا خَلَاقَ لَهُ عِنْدَ اللّٰهِ تَعَالٰى» [3] قرب قیامت نمازی بے تحاشا ہوں گے، لیکن اکثر نمازی وہ ہوں گے جن کے لیے اللہ کے ہاں کچھ نہیں ہوگا۔ کیوں؟ فرمایا: لوگ نمازیں پڑھیں گے، ہر روز پڑھیں گے لیکن نماز روح سے خالی ہوگی اور وہ روح اللہ کے پیغمبر کی اتباع ہے۔ جن کا یہ ارشاد

[1] صحيح مسلم، حديث: 1718، و صحيح البخاري، قبل الحديث: 2142. [2] صحيح البخاري، حديث: 793. [3] صحيح الجامع، حديث: 2575.

ہے کہ «وَصَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي» [1] نماز پڑھو بالکل میرے طریقے کے مطابق، کوئی فرق نہ ہو۔ تو اتباعِ سنت یہ ایک لازمی امر ہے۔ ہمارا عمل نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی سنت کے مطابق ہو۔ اور اگر عمل میں بدعت آگئی تو وہ مردود ہے اور عمل کرنے والا بھی مردود ہے۔ اس عمل کی کوئی حیثیت نہیں، برباد ہے۔ یہ بنیادی شرط ہے قبول عمل کی۔

ایک پانچویں چیز بھی ہے اور وہ ہے صدقِ ارادہ۔ یہ شرط تو نہیں ہے لیکن اس سے عمل کی شان میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک بندہ کسی عمل کا قصد کرے اور اس کی نیت اسی عمل کی ہو۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی ایک حدیث ہے جس میں آپ نے نماز باجماعت کو پچیس گنا اور ستائیس گنا زیادہ اجر کا مستحق قرار دیا۔ باجماعت نماز تنہا نماز سے پچیس، ستائیس گنا زیادہ اجر کی مستحق ہے۔ اور آگے رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «ذٰلِكَ أَنَّهُ إِذَا تَوَضَّأَ فَأَحْسَنَ الْوُضُوءَ ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الْمَسْجِدِ لَا يُخْرِجُهُ إِلَّا الصَّلٰوةُ» [2] کہ انسان اپنے گھر میں اچھا وضو کرے، گھر سے مسجد کی طرف نکلے، اس کا ارادہ نماز کے سوا کچھ نہیں، یعنی یہ نکلنا صرف نماز کے لیے، یہ صدق ارادہ ہے۔ ارادہ صرف نماز ہے اور کوئی چیز نہیں۔ یہ چیز زیادہ فضیلت اور عمل کی قبولیت کا باعث ہوتی ہے۔ صدقِ ارادہ جیسے ایک حدیث میں آتا ہے کہ جب مومن نماز پڑھ لے اور اپنی اسی جگہ بیٹھا رہے «لَا يَحْبِسُهُ إِلَّا الصَّلَاةُ» [3] حدیث کے الفاظ ہیں کہ وہاں اس کو کسی چیز نے نہیں بٹھائے رکھا سوائے نماز کے۔ بیٹھا ہے صرف نماز کے انتظار میں۔ اور کوئی نیت نہیں، کوئی مقصد نہیں۔ تو صدقِ عمل میں بندے کا یہ عمل ملحوظ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کا اجر و ثواب دیتا ہے کہ بندہ اپنے گھر سے ایک عمل کی نیت سے نکلے۔ گو اگر کوئی دوسری نیتیں

[1] صحيح البخاري، حديث: 631. [2] صحيح البخاري، حديث: 647. [3] سنن ابن ماجه، حديث: 1139.

ساتھ شامل ہیں تو عمل کی حقیقت میں فرق نہیں آتا لیکن ایک بندہ اگر یہ ٹھان لے کہ میں نے یہ سفر صرف فلاں کام کے لیے کرنا ہے۔ محدثین اس چیز کی حفاظت کرتے تھے۔ اور اپنی نیتوں کی استقامت پر توجہ دیتے تھے۔ تو یہ صدقِ ارادہ اور صدقِ عمل کا بھی بڑا دخل ہے قبول عمل میں، عمل کے ثواب میں اور اضافے میں۔

چھٹی چیز اس بارے میں بڑی اہم ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کے امر کی اقتداء اور اتباع۔ یہ عمل میں کیوں کررہا ہوں؟ اس لیے کہ میرے اللہ کا امر ہے۔ یہ ہر دل میں نیت ہونی چاہیے، یہ ضروری ہے۔ اپنے خالق اور مالک کے امر کی اقتداء کرنا، یہ ضروری چیز ہے۔ اور یہ ایک ایسا نکتہ ہے جس میں آج بہت سے لوگ ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ اکثر لوگوں کے دل کی کیفیت، اللہ کے امر کی اقتداء نہیں بلکہ اپنے اپنے سلسلوں، اپنے طریقوں، اپنے اپنے مذاہب کی پیروی کی نیت ہوتی ہے۔ بات کو سمجھیے، اور یہ چیز عمل کو برباد کرنے والی ہے۔ بندے کی اساس باطل ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کسی بھی عمل کی صحت کی ایک ہی اساس ہے کہ وہ عمل خالق اور مالک کا امر ہے۔ ﴿اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ [1] نماز کیوں پڑھ رہا ہوں؟ خالق کا امر ہے۔ نماز کیسے پڑھ رہا ہوں؟ جیسے اللہ کے پیغمبر ﷺ نے پڑھی۔ کیوں پڑھ رہا ہوں؟ اس لیے کہ خالق کا امر ہے کہ ﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ﴾ [2] «صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي» [3] تو عمل میں اللہ کے امر کی اقتدا کی نیت، یہ ضروری ہے ورنہ بہت سے لوگ اس نیت سے محروم ہیں۔ آج صوفیوں کی، پیروں کی اور اصحاب سلاسل کی بیعتیں ہورہی ہیں۔ ان بیعتوں میں صاحب بیعت کی اقتدا کی نیت ہوتی ہے، یہ ظلم ہے۔ بہت سے اوراد اور وظیفے یہ

[1] البقرة 2:43. [2] البقرة 2:239. [3] صحيح البخاري، حديث: 631.

لوگ کب پڑھتے ہیں؟ کہ جب ان کے پیر صاحب اجازت دیں۔ آپ نے سنا ہوگا: حضرت یہ وظیفہ پڑھ سکتا ہوں، آپ کی اجازت ہے؟ اگر وہ کہے کہ ہاں پڑھ لو، تمھارے حق میں ہے، پھر پڑھتے ہیں۔ اگر کہے نہ پڑھو، یہ وظیفہ جلالی ہے تو پھر نہیں۔ یا پڑھ لو لیکن ہر روز تسبیح کو دھویا کرو تاکہ ٹھنڈی رہے، جلال نہ آئے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ جہالتوں کی انتہا ہے۔ اور یہ نیت باطل ہے۔ یہ وظیفہ مجھے پیر صاحب نے، یہ وظیفہ مجھے حضرت صاحب نے دیا جن کی میں بیعت میں ہوں، چنانچہ اکثر عمل آج اقتداءً بامر اللہ نہیں ہوتے بلکہ اپنے اپنے مذاہب کی خاطر ہوتے ہیں۔ یہ نیکیاں کر رہا ہوں، یہ طریقہ اس لیے ہے کہ میرے امام سے ثابت ہے۔ ایسا عمل ہمارے ابا جان کیا کرتے تھے۔ برادری میں ایسا ہوتا ہے۔ کیا یہ نیت مستقیم ہے؟ نہیں، یہ نیت باطل ہے۔ یہ شرعی نیت نہیں۔ آپ عمل کریں، اس لیے کہ آباء و اجداد ایسا عمل کرتے تھے، یہ باطل ہے۔ آپ عمل کریں اس لیے کہ پیر صاحب اور حضرت صاحب یوں کرتے ہیں، یہ باطل ہے۔ یہ برادریاں، قومیں، امام، مذاہب یہ سلسلے ان کی دین میں کوئی حیثیت نہیں۔ ایک ہی نیت مستقیم ہے اور عدل کی مستحق ہے۔ جب آپ یہ سوچیں اور یہ سمجھیں گے اور مطلع ہو جائیں کہ یہ امر اللہ کا ہے اور یہ طریقہ محمد رسول اللہ ﷺ کا ہے۔ اور محمد رسول اللہ ﷺ کا طریقہ اس لیے لائقِ قبول اور لائق اطاعت ہے کہ یہ اللہ کا امر ہے: ﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ [1] اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اور اللہ کا فرمان ہے: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ [2] جو رسول کی اطاعت کرتا ہے اس نے اللہ کی اطاعت کرلی۔ «فَمَنْ أَطَاعَ مُحَمَّدًا ﷺ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ وَ مَنْ

[1] محمد 33:47. [2] النسآء 4:80.

عَصٰى مُحَمَّدًا ﷺ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ» [1] جو محمد ﷺ کی اطاعت کرتا ہے اس نے اللہ کی اطاعت کرلی اور جو محمد ﷺ کی نافرمانی کرتا ہے اس نے اللہ کی نافرمانی کرلی، یہ نیت مستقیم ہے۔ اور آج لوگ اس صحیح شرعی امر سے محروم ہیں۔ عمل تو کرتے ہیں لیکن ان کی نیات میں تفاوت ہے، اسی کے پیش نظر آباء و اجداد کی پیروی، اسی کے پیش نظر امام کی تقلید، اسی کے پیش نظر اپنے مفتی یا پیر کی اتباع، اسی کے پیش نظر برادری اور قوم کی پیروی، حالانکہ یہ سارے امور باطل ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس عمل کو قبول فرماتا ہے جس عمل میں اللہ کی اطاعت ہو اور طریقۂ عمل بھی اللہ کی اطاعت ہو۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی سنت کی پیروی ہے۔ تو یہ وہ کچھ امور تھے جن کا تعلق نفس عمل سے ہے۔ عمل کرنے والا مومن ہو، عمل کرنے والا مخلص ہو، عمل کرنے والا اپنے عمل میں اللہ کے نبی کی سنت کا متبع ہو۔ عمل کرنے والا محتسب ہو، احتساب کی نیت کہ اللہ سے اس کا اجر لینا ہے۔ کوئی مایوسی نہ ہو کہ مجھے اس کا کیا ثواب مل سکتا ہے؟ نہیں، یقین کے ساتھ اس کا اجر اللہ سے لینا ہے، جنت لینی ہے۔ ہم صوفیوں کی طرح خشک نہیں کہ جنت کی اگر نیت ہوگی تو یہ لالچ ہے۔ یہ اللہ نے ایک وعدہ کیا ہے اگر ہم اس کو قبول نہ کریں تو یہ ناقدری ہے اور عمل کرنے والا واقعتاً اللہ کے امر سے متاثر ہو، اور اس کے امر کا مقتدی ہو اور طریقۂ عمل میں بھی اللہ کے امر کا فرمانبردار ہو۔ کیونکہ اللہ کا امر یہ ہے کہ میرے پیغمبر کی اتباع کرو۔ بلکہ اللہ کا امر یہ ہے: اگر میری محبت چاہتے ہو تو میرے پیغمبر کی اتباع کرو۔ کیوں نہ اتباع کریں، اس اتباع کے بغیر محبت حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ تو وہ امور ہیں جن کا تعلق نفس عمل کے ساتھ ہے۔ قبول عمل کے لیے

[1] صحيح البخاري، حديث:7281.

کچھ خارجی امور بھی ہیں۔ مثال کے طور پر اکل حرام۔ اگر بندہ حرام کی روزی کماتا ہے، کھاتا ہے تو اس کی عبادات قبول نہیں ہوں گی۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے حج کی مثال دی۔ «رَجلٌ يُطِيلُ السَّفرَ أَشْعثَ أَغْبرَ» کہ ایک شخص لمبا سفر کرتا ہے، سر خاک آلود، پاؤں غبار آلود، لمبا سفر «يَمُدُّ يَدَيْهِ إِلَى السَّمَاءِ» اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف پھیلائے ہوئے ہے۔ اور یارب! یارب کر رہا ہے۔ لمبا سفر، سب سے لمبا سفر دنیا میں حج کا ہوتا ہے۔ اور سر خاک آلود ہے، پاؤں خاک آلود ہیں۔ یہ کیفیت سب سے زیادہ عرفہ کے میدان میں ہوتی ہے۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی حدیث ہے: «اَلْحجُّ عرفَةُ» حج عرفہ کا نام ہے۔[1] عرفہ کے میدان میں یہ کیفیت ہوتی ہے۔ اور اپنے ہاتھوں کو پھیلائے ہوئے دعائیں کر رہا ہے۔ سب سے اعلیٰ مقام ہے۔ یہاں اللہ گناہوں کو خوب معاف کرتا ہے۔ دعائیں کر رہا ہے: یارب! یارب! پکار رہا ہے اور فرشتے اس دعا پر کہتے ہیں: «وَ مطْعمُهُ حرامٌ، وَّ مشْربُهُ حرامٌ، وَّ ملْبسُهُ حرامٌ، وَّ غُذِيَ بِالْحرامِ فَأَنّٰي يُسْتجابُ لِذٰلِكَ»[2] اس کا کھانا حرام کا، پینا حرام کا، لباس حرام کا، غذا حرام کی، تیری دعا کہاں قبول ہوگی؟ تیرا عمل کہاں مقبول ہوگا؟ اتنا قیمتی عمل۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی حدیث ہے: «مَنْ حجَّ هٰذَا الْبيْتَ فلَمْ يرْفُثْ ولَمْ يفْسُقْ رجع كيوْمِ وَّلَدتْهُ أُمُّهُ»[3] جو بیت اللہ کا حج کرے اور کسی گناہ کا ارتکاب نہ کرے تو وہ حج کر کے یوں لوٹتا ہے جیسے آج ہی پیدا ہوا ہے، بالکل معصوم، گناہوں سے پاک صاف۔ لیکن اس شخص کا حج قبول نہیں ہے۔ دعائیں قبول نہیں، اس لیے کہ کھانا پینا حرام کا ہے۔ اور اللہ پاک کا فرمان ہے: ﴿كُلُوا مِن طَيِّبَٰتِ مَا رَزَقۡنَٰكُمۡ﴾[4] کہ طیب اور حلال چیز

[1] جامع الترمذي، حديث: 889. [2] صحيح مسلم، حديث: 1015. [3] صحيح البخاري، حديث: 1820. [4] البقرة 2:172.

کھاؤ۔ حلال پیو، حلال پہنو۔ ایک انسان عبادت کرتا ہے، اس کے لباس میں ایک درہم کے بقدر حرام ہے تو اس کی عبادت قبول نہیں ہوگی۔[1] یہ ایک خارجی چیز ہے کہ حرام سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ حرام بول سے بھی اجتناب کرنا ضروری ہے۔ مقاصد حلال کے ہوں۔ کھانا پینا حلال کا ہو تو دعائیں قبول ہوں گی بلکہ یہ حلال دعاؤں اور عبادات کو، ان کی قبولیت کو زیادہ قریب کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکت آتی ہے عمل میں، نیکی میں، عرف میں تو یہ ایک خارجی امر ہے، اجتنابِ حرام۔ دوسری چیز گناہوں سے بچنا۔ اگرچہ یہ گناہ نیکی کی قبولیت میں رکاوٹ نہیں۔ گناہ اپنی جگہ، نیکیاں اپنی جگہ۔ قیامت کے دن وزن ہوگا اگر گناہ بھاری ہو گئے، بندہ ناکام ہوجائے گا اور اگر نیکیاں بھاری ہو گئیں، بندہ کامیاب ہوجائے گا۔ لیکن کچھ گناہ شریعت میں ایسے ہیں جو نیکیوں کو برباد کر سکتے ہیں۔ جیسے رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے: «مَنْ شرِبَ الْخمْرَ لَمْ تُقْبلْ لَهُ صلَاةٌ أَرْبعِينَ ليْلَةً»[2] کہ جو شخص شراب پیتا ہے چالیس دن تک اس کی کوئی نماز قبول نہیں ہوتی۔ یہ شراب پینا ایک گناہ ہے۔ لیکن چالیس دن تک نیکیاں مقبول نہیں ہوتیں بلکہ مردود ہیں، کوئی نماز قبول نہیں ہوتی۔ تو کچھ گناہ ایسے ہیں جن کے ارتکاب سے نیکیاں برباد ہوتی ہیں۔ جیسے رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «فَلَا يَقْبلُ عملَ قاطِعِ رحِمٍ»[3] جو شخص قطع رحمی کرتا ہے، رشتوں کو توڑتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کا عمل قبول نہیں کرتا۔ اس کی نیکیاں قبول نہیں کرتا۔ قاطع الرحم کی نیکیاں قبول نہیں ہوتیں۔ ایک اور حدیث ہے نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی جمعرات اور پیر کے روزے کے تعلق سے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان دونوں میں بندوں کی نیکیاں اللہ کے

[1] مسند أحمد 2/98 (إسناده ضعيف جدا) [2] مسند أحمد 2/35. [3] مسند أحمد 2/484.

سامنے پیش ہوتی ہیں۔ اور اللہ قبول کرتا ہے، سب کو معاف کرتا ہے سوائے دو انسانوں کے: ایک مشرک اور دوسرا وہ شخص جس کے دل میں اپنے کسی مسلمان بھائی کے خلاف کینہ ہو، بغض ہو، ناراضی ہو، کوئی میل کچیل ہو، فریب کاری کی نیت ہو تو اللہ تعالیٰ اس شخص کی نیکیاں قبول نہیں کرتا۔ [1]

کچھ معصیتیں ایسی ہیں جو بندوں کے اعمال کو برباد کردیتی ہیں۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے سامنے دو عورتوں کا ذکر ہوا۔ «إِنَّ فُلَانَةَ تُذْكَرُ مِنْ كَثْرَةِ صَلَاتِهَا وَصِيَامِهَا وَصَدَقَتِهَا» فلاں عورت مشہور ہے، خوب نمازیں پڑھتی ہے، نفل پڑھتی ہے، قیام اللیل کرتی ہے، صدقے دیتی ہے، روزے رکھتی ہے۔ «غَيْرَ أَنَّهَا تُؤْذِي جِيرَانَهَا بِلِسَانِهَا» مگر اپنی زبان سے پڑوسیوں کو تنگ کرتی ہے۔ زبان کی کڑوی ہے، گالم گلوچ، غیبتیں کرنا اور چغلیاں کھانا اور لعنتیں برسانا بھی اس سے بہت ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «هِيَ فِي النَّارِ» [2] یہ عورت جہنم میں جائے گی۔ کچھ معصیتیں ایسی ہیں جو نیکیوں کو مٹا دیتی ہیں۔ پھر نیکیاں قابل قبول نہیں ہوتیں۔ تو پھر اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ہم گناہوں سے بچیں۔ گناہ اگر ہوں تو توبہ کرلیں تاکہ معاملہ صاف ہو جائے۔ بندہ جب توبہ کرلے تو اس کا معاملہ صاف ہوجاتا ہے۔ «اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهُ» [3] گناہوں سے توبہ کرنے والا ایسے ہے جیسے گناہ کیا ہی نہیں۔ بالکل معصوم، کوئی گناہ ہے ہی نہیں۔ تو توبہ کرنی چاہیے۔ یہ کچھ خارجی امور ہیں۔ ایک اجتنابِ حرام، حرام روزی سے بچیں اور دوسرا اجتناب معاصی، گناہوں سے بچیں اور تیسری چیز حقوق العباد کی حفاظت۔ حقوق العباد میں اگر بندہ کوتاہی کرتا ہے، بندوں کے

[1] سنن أبي داود، حديث: 4916، و سنن ابن ماجه، حديث: 1740. [2] مشكاة المصابيح، حديث: 4992. [3] سنن ابن ماجه، حديث: 4250.

حق مارتا ہے، کسی کی غیبت کردی، کسی کی چغلی کردی، کسی کا مال چھین لیا، کسی کا حق مار لیا، کسی کو گالی دے دی، یہ سارے کام حقوق العباد میں خرابی ہے۔ اس کی نیکیاں برباد تو نہیں ہورہیں لیکن رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے: «أَتَدْرُونَ مَا الْمُفْلِسُ؟» تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟ صحابہ نے کہا: مفلس وہ ہے جس کے پاس پیسہ نہ ہو، مفلس ہو، قلاش ہو۔ فرمایا کہ نہیں۔ مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نمازیں، روزے، صدقات لے کر آئے لیکن ایسا آرہا ہے کہ «قَدْشَتَمَ هٰذَا، وَقَذَفَ هٰذَا، وَ أَكَلَ مَالَ هٰذَا، وَسَفَكَ دَمَ هٰذَا، وَ ضَرَبَ هٰذَا» کسی کو مارا، کسی کو گالی دی، کسی پر تہمت لگائی، کسی کا مال چھینا، کسی کا خون بہایا، حق تلفیاں کیں۔ تو اللہ کیا کرے گا؟ اللہ انصاف فراہم کرے گا اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ رب العزت انصاف فراہم کرنے کے لیے اس کی نیکیاں بانٹے گا۔ نیکیاں بٹتے بٹتے اگر ختم ہوگئیں، حقوق ختم نہ ہوئے تو اللہ ان لوگوں کے گناہ لے لے گا اور اس کے سر پر ڈال دے گا۔ [1] تو آج یہ نیکیاں برباد ہورہی ہیں۔ گناہ موجود ہیں، قیامت کے روز ساتھ آئیں گے۔ اللہ نے ان کو باقی رکھا ہے تاکہ اس کے انصاف کی شان قائم رہے۔ اگر اللہ تعالیٰ دنیا میں گناہ مٹا دیتا تو آج انصاف کیسے فراہم کرتا؟ گناہ مٹتے نہیں ہیں لیکن آج تقسیم ہورہے ہیں اور پوری کائنات کے سامنے اللہ کا انصاف اور اس کا عدل واضح ہوگا۔ جس نے حق تلفی کی تھی، حقوق العباد کو پامال کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے آج اس کی تمام نیکیاں دوسروں میں تقسیم کردیں۔ یہ کچھ ظاہری امور نیکیوں سے ہٹ کر ہیں، یہ بھی نیکیوں میں نقصان دہ ہیں اور نیکیوں کو برباد کررہے۔ تو اس تعلق سے سمجھنا اور سوچنا ضروری ہے کہ ہم حقوق العباد

[1] صحيح مسلم، حديث: 2581.

کا خیال کریں، حرام سے بچیں، گناہوں سے اجتناب کریں، خاص طور پر ایسے گناہ جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ذکر کیا کہ ان گناہوں کی موجودگی میں نیکیاں قبول نہیں ہوتیں، ان کا خیال رکھا جائے۔ ایک شخص ہے جس میں دو رخ ہیں۔ اس میں تقویٰ ہے اور گناہوں پر جرأت بھی۔ یہ دونوں چیزیں ایک دل میں جمع ہیں۔ خشیت بھی ہے اور گناہوں پر جرأت اور جسارت بھی ہے۔ یہ دونوں چیزیں اس شخص کے دل میں جمع ہیں۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ خشیت ہے لوگوں کے سامنے، لوگوں کے سامنے جاتا ہے بڑا تقویٰ کا روپ دھار کر جیسے سارا خوف اس کے دل میں ہے اور لوگوں کو دکھانے کے طور پر تقوے کا ہیضہ ہوجاتا ہے۔ وہ اضافی تقویٰ کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ خشیت اس کے دل میں ہے لیکن یہ خشیت حقیقت نہیں ہے دکھاوے کی ہے۔ جب تنہا ہوتا ہے تو ایک ایک کرکے اللہ کی حدوں کو پامال کرتا ہے۔ اگر خشیت ہوتی، خوف ہوتا تو تنہائی میں بھی ساتھ ہوتا۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی دعا ہے کہ «اللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ خَشْيَتَكَ فِي الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ» یا اللہ! میں تیری خشیت کا سوال کرتا ہوں جب میں تنہا ہوں تب بھی، لوگوں کے سامنے ہوں تب بھی۔ [1] لیکن یہ دو رخی کا مظاہرہ کرتا ہے، اس کے دو چہرے ہیں، اس کے دل میں دو چیزیں ہیں۔ خشیت ہے، لیکن لوگوں کو دکھانے کے لیے اور گناہوں پر جرأت اور جسارت ہے جب لوگ سامنے نہ ہوں۔ خوب گناہ کرتا ہے۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی حدیث ہے: «لَأَعْلَمَنَّ أَقْوَامًا مِنْ أُمَّتِي يَأْتُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِحَسَنَاتٍ أَمْثَالِ جِبَالِ تِهَامَةَ» میرے کچھ امتی قیامت کے دن آئیں گے پہاڑوں کے برابر نیکیاں لے کر «بیضًا» سفید رنگ کی اور اللہ رب العزت

[1] سنن النسائي، حديث:1306، و مسند أحمد:364/4.

تمام نیکیوں کو ھباءً منثوراً کر دے گا۔ جن نیکیوں کا وزن اور حجم پہاڑوں کے برابر تھا وہ نیکیاں ذرے بن کر بکھر جائیں گی۔ پوچھا گیا: یہ کون لوگ ہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ لوگ لوگوں کے سامنے نیکیاں کرتے تھے، لیکن «إِذَا خَلَوْا بِمَحَارِمِ اللّٰهِ انْتَهَكُوهَا» [1] جب خلوت میں جاتے تو اللہ کا کوئی خوف نہ رہتا، پھر خوب گناہوں کا ارتکاب کرتے، خوب معصیتوں کا ارتکاب کرتے۔ تو آج ان کی نیکیاں برباد ہورہی ہیں۔ گناہوں کے ارتکاب سے نیکیاں مٹتی نہیں ہیں لیکن نیکیاں برباد ہوتی ہیں، کچھ گناہ نیکیوں کو برباد کردیتے ہیں۔ اور بندے کی اس کیفیت کی بنا پر اس کی نیکیاں اس کے کام نہ آئیں گی۔ سب برباد ہوجائیں گی۔ ہاں کچھ گناہ ایسے ہیں جو واقعتاً نیکیوں کو برباد کردیتے ہیں۔ جیسے بدعت ہے۔ بدعت کے مرتکب کی کوئی نیکی قبول نہیں۔ کسی بدعتی کو پناہ دینے والا، اس کی توقیر کرنے والا، اس کی کوئی نیکی قبول نہیں۔ یہ عقیدے کا معاملہ ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ مسجد میں حلقہ بنا کر اجتماعی ذکر کررہے ہیں۔ اجتماعی ذکر ثابت نہیں۔ انھوں نے فرمایا تھا: یہ ایک بدعت ہے اور ساتھ یہ فرمایا تھا: «فَعُدُّوا سَيِّئَاتِكُمْ فَأَنَا ضَامِنٌ أَنْ لَا يَضِيعَ مِنْ حَسَنَاتِكُمْ شَيْءٌ» [2] کہ ان کنکریوں پر جو تم اللہ کا ذکر شمار کررہے ہو اس کے بجائے تم اپنے گناہ شمار کرو۔ ایک گناہ کرو، سو گناہ کرو اور وہ آ کر شمار کرو۔ میں نے فلاں گناہ کیا، میں نے فلاں گناہ کیا، یہ اس سے بہتر ہے۔ کیوں؟ گناہوں سے نیکیاں ضائع ہوں گی لیکن بدعت سے نیکیاں برباد ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ کوئی عمل قبول نہیں کرے گا۔ یہ کچھ خارجی امور ہیں جن کی حفاظت ضروری ہے۔

[1] سنن ابن ماجه، حديث:4245. [2] سنن الدارمي، حديث:204.

اور ایک سب سے اہم مسئلہ، بڑا خوفناک مسئلہ۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی حدیث ہے کہ «إِنَّ رَجُلًا لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰى لَا يَبْقٰى بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا إِلَّا ذِرَاعٌ» ایک شخص جنتیوں والے کام کرتا ہے، کرتا رہتا ہے حتی کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک گز کا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے۔ بس تھوڑا سا فاصلہ۔ جنت کے قریب پہنچ گیا۔ پھر کیا ہوتا ہے؟ «فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ» اللہ کی تقدیر کا فیصلہ اس پر غالب آجاتا ہے۔ جنت والے کام کرتے کرتے وہ جنت کے دہانے پر کھڑا ہے اور اللہ کی تقدیر کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ جہنمی ہے۔ اس وقت وہ فیصلہ غالب آجاتا ہے۔ «فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ» اور ایک عمل جہنم والا کر ڈالتا ہے، «يَدْخُلُهَا» اور وہ ایک عمل کر کے موت کا شکار ہوکر جہنم میں داخل ہو جاتا ہے۔ «إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيمِ» اعمال کا مدار انسان کے خاتمے پر ہے۔ تو خاتمہ اچھا بنائیے، اچھے خاتمے کی کوشش کیجیے۔ اچھے خاتمے کے لیے دعائیں کریں اور وہ امور اپنائیں جن کو اختیار کرنے کا اللہ نے حکم دیا۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی حدیث ہے: «تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ» تمھارے بیچ دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ «لَنْ تَضِلُّوا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا» جب تک ان دو چیزوں کو تھامے رہو گے کبھی گمراہ نہیں ہوگے، موت تک حق پر قائم رہو گے۔ گارنٹی دی۔ ایک ضمانت ہے۔ موت تک حق پر قائم رہو گے۔ اللہ کی کتاب کے ساتھ سچا تمسک، صدق کے ساتھ۔ جن لوگوں کے تمسک میں کمزوری ہو، اعتصام میں کمزوری ہو تو ان کی گمراہی کا امکان ہوگا۔ اور جو لوگ بڑے پختہ عقیدے کے ساتھ کتاب و سنت سے چمٹے رہے تو اللہ تعالیٰ ان کو موت تک استقامت دے گا۔ دین کی، حق کی اور صحیح منہج کی استقامت دے گا۔ انھیں گمراہی سے بچائے گا۔ کثرت سے وہ دعائیں کرتے رہیں جو اللہ کے

پیغمبر پڑھا کرتے تھے: «يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِي عَلٰى دِينِكَ» دلوں کے پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت قدم رکھنا، یہ ثبات اور یہ استقامت اللہ کی توفیق سے ممکن ہے۔ اس کی توفیق کا سوال کریں اور وہ کام کیے جائیں جو اللہ نے بتائے ہیں جو ہمیشہ کی استقامت کا باعث ہیں۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾[1] ان پر موت کے وقت اللہ کے فرشتے اتریں گے جنھوں نے اللہ کو رب کہا اور پھر استقامت کو اختیار کرلیا۔ تو یہ وہ امور ہیں جو بندے کے خاتمے کو بہتر بناتے ہیں۔ دعائیں کریں اور وہ عمل کریں جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے دائرے میں ہیں کیونکہ ایسے اعمال میں ہمیشہ کی ہدایت کی گارنٹی ہے۔ تو اچھے خاتمے کی توقع، اچھے خاتمے کی دعائیں یہ ضروری ہیں۔ اللہ تعالیٰ دلوں کے حال جانتا ہے۔ بندے کے دل کا صدق اللہ پر ظاہر ہوجائے اور اللہ پہچان لے کہ بندہ دل سے سچا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا خاتمہ اچھا کردے گا۔ اور اسے استقامت دے گا جیسے ایک شخص نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے پاس آیا، ایمان قبول کیا، بعدازاں جہاد میں چلا گیا۔ اس جنگ میں مال غنیمت حاصل ہوا۔ مجاہدین میں تقسیم کیا گیا۔ اسے بھی بلایا گیا کہ یہ آپ کا حصہ ہے۔ اس نے کہا: مجھے یہ مال نہیں چاہیے۔ «مَا اتَّبَعْتُكَ لِهٰذَا وَإِنَّمَا اتَّبَعْتُكَ ...... هٰهُنَا وَ أَشَارَ إِلٰى عُنُقِهِ» میں نے اس مال کے لیے آپ کی اتباع نہیں کی، میرا ایک ہدف ہے، آپ کے ساتھ جہاد کروں اور کبھی یہاں تیر لگے اور شہید ہوجاؤں۔ یہ میری کوشش ہے، یہ میرا مقصود ہے، یہ میری نیت ہے۔ اور آخر ایک جنگ میں شہید ہوگیا اور تیر وہیں لگا ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

[1] حٰمٓ السجدة 41:30.

«كَانَ صَادِقًا فَصَدَقَهُ اللّٰهُ» سچا تھا، اس نے یہ بات دل کی سچائی سے کہی تھی اور اللہ اس صدق کو جانتا ہے۔ «فَصَدَقَهُ اللّٰهُ» اللہ نے اس کی صداقت کی لاج رکھ لی۔ اس کی مراد پوری کردی۔ تو یہ دل کی سچائی بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس کا اہتمام کیجیے۔ اس کے لیے محنت کیجیے۔ یہ صدقِ قلب، صدقِ عمل میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ، اللہ کے پیغمبر کے ساتھ، اعمال صالحہ کے ساتھ بہت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ پر صدق قلب اگر واضح ہو جائے، وہ دلوں کے بھید جانتا ہے کہ بندے کے دل میں صدق ہے، یقین ہے، بصیرت ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ حق کا ثبات دے گا، استقامت دے گا، خاتمہ اچھا ہوگا اور دل میں اگر کوئی جھول ہے، کہیں کوئی تاریک گوشہ ہے تو پھر خطرہ ہے کہ خاتمہ کیسا ہوتا ہے۔ اللہ کے فیصلے ہیں اور اس کی مرضی ہے۔ کوئی اس سے سوال کرنے والا نہیں ہے۔ یہ تقدیر اللہ کا راز اور بھید ہے۔ کسی پر منکشف اور ظاہر نہیں۔ لہٰذا قبولِ عمل کے لیے ان امور کا خیال رکھو۔ کچھ امور وہ ہیں جن کا تعلق عمل کے ساتھ ہے اور کچھ امور وہ ہیں جن کی حیثیت خارجی ہے۔ قبولِ عمل کے لیے یہ سارے امور ضروری ہیں اور اگر یہ امور نہ ہوں، پھر بربادی ہے۔ بربادی کی کیفیت کیا ہے؟ کیفیت یہ ہے کہ بندہ خوش ہے میں نے نیکیاں کر رکھی ہیں، لیکن قیامت کے دن اچانک جب وہ سنے گا کہ ساری نیکیاں برباد ہیں تو اس کو کتنی تکلیف پہنچے گی اور اچانک کتنے بڑے خطرے کا اس کو سامنا کرنا پڑ جائے گا ﴿وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ﴾ [1] ان لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اچانک ایسا فیصلہ ظاہر ہوگا جس کی ان کو توقع نہیں ہوگی، جیسے قیامت کے دن بہت سے لوگ پانی پینے کے لیے حوض کوثر کی

[1] الزمر 47:39.

طرف جائیں گے، پیاس لگی ہے اور حوض کوثر نظر آرہا ہے۔ اور خوش ہیں کہ ہم نے بڑی نیکیاں کر رکھی ہیں۔ ہم اس کے مستحق ہیں اور یہ پانی ہماری ضرورت ہے۔ حوض کوثر کی طرف ایک جمِ غفیر جا رہا ہے۔ اچانک انھیں روک دیا جائے گا۔ ایک دیوار حائل کر دی جائے گی۔ ان کو دھکے دے کر دور کر دیا جائے گا۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام فرمائیں گے: «أَصْحَابِي، أَصْحَابِي» یہ میرے ساتھی ہیں، ان کو آنے دو۔ میری امت ہے، جواب ملے گا: «إِنَّكَ لَا تَدْرِي مَا أَحْدَثُوا بَعْدَكَ» [1] آپ نہیں جانتے انھوں نے آپ کے بعد اس دین میں کیسی کیسی چیزیں اور طریقے جاری کیے تھے۔ نئی نئی بدعات اور خرافات اس دین میں ڈالیں۔ نئے نئے عمل اپنائے۔ آپ نہیں جانتے۔ تو اللہ کے پیغمبر ارشاد فرمائیں گے: «سُحْقًا سُحْقًا لِّمَنْ غَيَّرَ بَعْدِي» [2] جن لوگوں نے میرے بعد میرے دین کو تبدیل کر دیا انھیں مجھ سے دور کر دو۔ ﴿وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ﴾ اللہ کی طرف سے اچانک ایک خوفناک صورتحال بن گئی۔ اپنی کامیابی پر خوش ہیں اور حوض کوثر کا پانی پینا چاہتے ہیں۔ اچانک ان کو دھکے دے کر دور کر دیا جائے گا کہ ان کے اعمال میں بدعت ہے۔ یہ عمل بندے کو اچانک ایک خطرے میں دھکیل دے گا۔ ساری خوشیاں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ جو ایک توقع تھی کامیابی کی، حوض کوثر کے پانی کی، اخروی نجات کی سب ختم۔ اور اچانک ایک خطرناک صورتحال کا سامنا کرنا پڑ گیا ہے۔ کتنی بڑی بربادی ہے؟ یہ بہت بڑی بربادی ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم ان امور کو سمجھیں، توجہ دیں اور اپنے اعمال کی قبولیت کے لیے کوشش کریں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ [3] اللہ تعالیٰ عمل

[1] صحيح مسلم، حديث: 2297. [2] صحيح البخاري، حديث: 6584. [3] المائدة 27:5.

قبول کرتا ہے متقین کے۔ متقی کون ہے؟ متقی وہ ہے جو مخلص ہو، متقی وہ ہے جو موحد ہو۔ متقی وہ ہے جو اللہ کے پیغمبر کی سنت کا متبع ہو۔ اللہ ان کے اعمال قبول فرماتا ہے۔ متقی مخلص ہوتا ہے۔ اور اخلاص قبولِ عمل کا ذریعہ اور سبب بنتا ہے۔ عمل بہت بڑا ہو اخلاص نہ ہو تو وہ مردود ہے، بے کار ہے۔ کوئی اس کا فائدہ نہیں۔ بے کار ہے۔ تو اللہ متقین کے عمل قبول کرتا ہے۔ متقی وہ ہے جو گناہوں سے احتراز کرے اور گناہ ہو تو توبہ کرلے۔ ایسے لوگوں کے اعمال جلدی قبول ہوتے ہیں۔ تو پھر ایسے اعمال کا انتخاب کریں جن کی قبولیت اللہ کے ہاں جلدی ہوتی ہے۔ ایسے اوقات کا انتخاب کریں جن اوقات کی قبولیت اللہ رب العزت کے ہاں وعدہ ہے۔ جن کا شریعت نے ذکر کیا۔ تو ان امور کی حفاظت کے ساتھ آگے بڑھیں تا کہ ہمارے اعمال عنداللہ قابل قبول ہوں۔ تو ہر وہ چیز جو قبول عمل صالح سے مانع ہے، اس سے احتراز کریں۔ یادرکھو! عمل کا وزن نہیں بلکہ عمل کی قیمت اخلاص کے ساتھ ہے۔ وہ لوگ جو غار میں بند ہوگئے۔ ان تینوں نے اپنا ایک ایک عمل پیش کیا تھا، اور پھر وہ عمل پیش ہی نہیں کیا تھا بلکہ یہ جملہ ہر ایک کی دعا کا حصہ ہے «اَللّٰهُمَّ إِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنِّي فَعَلْتُ ذٰلِكَ ابْتِغَاءَ وَجْهِكَ»[1] اے اللہ! جو عمل میں نے پیش کیا ہے تو جانتا ہے، اگر یہ عمل تیری رضا کے لیے خالص تھا تو ہم کو رہائی دے دے، اس غار سے نکال دے، اس کے دہانے پر ایک بھاری پتھر آکر رک چکا ہے جس کو ہٹانے کی طاقت نہیں۔ تو انھوں نے صرف عمل پیش نہیں کیا بلکہ عمل کو اخلاص پر قائم کرکے پیش کیا۔ جب تینوں اپنی دعا کرکے فارغ ہوگئے تو اللہ نے پتھر کو ہٹا دیا، نیک عمل کی اور اخلاص والے عمل کی یہ طاقت ہے۔ یہ عمل مقبول کی

[1] صحيح البخاري، حديث: 2215، و صحيح مسلم، حديث: 2743.

بنیادی شرطیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں انھیں اپنانے کی توفیق دے۔ اور وہ جو شرائط ہیں ایمان کی، اچھے عقیدے کی، اخلاص کی، احتساب کی، اللہ کے امر کی اقتداء کی اور پیغمبر علیہ السلام کی سنت کی متابعت کی، ہم ان کو سمجھیں اور ان کو اپنے عمل میں اپنائیں۔ وہ جو خارجی شرائط ہیں: اکل حلال، اختیار حلال، گناہوں سے اجتناب، حقوق العباد کی حفاظت۔ ان امور کا اہتمام کریں تا کہ ہمارے اعمال عنداللہ مقبول ہوں۔ اور پھر ایک ایسی چیز جس کی مستقل حفاظت کرنا ضروری ہے۔ وہ ہے عمل کا اخلاص۔ عمل کرنے کے دوران اخلاص کی حفاظت کرے اور عمل کرنے کے بعد بھی اخلاص کی حفاظت کرے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ نے عمل کرلیا اخلاص کے ساتھ لیکن دو سال بعد، چار سال بعد ریاکاری کی نیت سے اپنے عمل کو ظاہر کردے۔ عمل کو بیان کردے۔ تو جب بھی ریاکاری کی نیت سے یہ بیان کریں گے اس وقت یہ عمل برباد ہوجائے گا۔ اس عمل کے حارس بن جاؤ، چوکیدار بن جاؤ، اس کی مستقل حفاظت کرو۔ لوگ کہتے ہیں کہ نیکی کر دریا میں ڈال، معنی ہیں اس کو بھول جاؤ۔ اگر کسی وقت بھی ریاکاری کی نیت سے اسے بیان کردو گے اس وقت بھی وہ عمل برباد ہوجائے گا۔ تو مستقل اس کی حفاظت کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان امور کی حفاظت کی توفیق عطا فرمادے، ہمارے اعمال اعمالِ مقبولہ ہوں۔ اللہ کے دربار میں شرفِ قبولیت حاصل کرلیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو ریاکاری سے بچائے، شرک سے بچائے، بدعات سے بچائے، گناہوں سے بچائے، اکل حرام سے بچائے۔ اور ہم کو نیک اعمال کی توفیق دے دے جو اعمال قابل قبول ہوں۔

«وَأَقُولُ قَوْلِي هٰذَا وَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِي وَلَكُمْ وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ»

فحاشی کا سیلاب

اور اس کے دینی اور دنیوی نقصانات

فحاشی کا سیلاب

اور اس کے دینی اور دنیوی نقصانات

خطبہ مسنونہ:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾

”بلاشبہ جو لوگ مسلمانوں میں بے حیائی پھیلانے کے آرزومند رہتے ہیں، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔“ [1]

اللہ رب العزت نے معصیت اور گناہ کو حرام قرار دیا ہے:

﴿قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ﴾ [2]

”کہہ دیجیے! میرے پروردگار نے فواحش کو حرام کردیا ہے۔ ان فواحش کو جو ظاہر ہوں اور ان فواحش کو جو باطن اور چھپی ہوئی ہوں۔“

[1] النور 24:19. [2] الأعراف 7:33.

فواحش جمع ہے فَاحِشَةٌ کی۔ اور فاحشہ گناہ کو بولتے ہیں۔ منکر، ایک ایسی چیز جو شریعت میں منکر ہے۔ منکر، معروف کی ضد ہے۔ معروف نیکی ہے جس کو شریعت جانتی ہے۔ اور منکر گناہ ہے جس کو شریعت نہیں پہچانتی کیونکہ وہ شرعی امر نہیں ہے۔ وہ گناہ ہے۔ کسی گناہ کا ارتکاب درحقیقت اللہ تعالیٰ کی غیرت کو للکارنے اور چیلنج کرنے کے مترادف ہے۔ صحیح مسلم میں نبی علیہ السلام کی حدیث ہے: «إِنَّ اللّٰهَ يَغَارُ وَإِنَّ الْمُؤْمِنَ يَغَارُ وَغَيْرَةُ اللّٰهِ أَنْ يَأْتِيَ الْمُؤْمِنُ مَا حَرَّمَ عَلَيْهِ» [1] مسلمان کو غیرت آتی ہے۔ بہت سے کام ایسے ہیں اگر آپ کریں تو اپنے بھائی کی غیرت کو آپ ابھاریں گے۔ اللہ تعالیٰ کو بھی غیرت آتی ہے۔ بہت سے کام ایسے ہیں جو اگر آپ کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی غیرت کو للکاریں گے۔ اللہ تعالیٰ کی غیرت کو للکارنے کے بہت سے مظاہر ہیں۔ ان میں سے ایک مظہر نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے ذکر کیا: «وَغَيْرَةُ اللّٰهِ أَنْ يَأْتِيَ الْمُؤْمِنُ مَا حَرَّمَ عَلَيْهِ» بندہ اس وقت اپنے پروردگار کی غیرت کو للکارتا ہے جب وہ ایسا کام کرے جس کو اللہ نے حرام کیا ہے، یعنی اللہ رب العزت کے حرام کردہ کسی بھی کام کا ارتکاب کرے گا۔ درحقیقت وہ اپنے پروردگار کی غیرت کو للکارے گا۔

قرآن کا بیان آپ نے سن لیا ہے کہ فواحش دو طرح کی ہیں: ﴿مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ﴾ جو ظاہر اور باطن ہوں۔ «مَا ظَهَرَ أَيْ مَا ظَهَرَ عَلَى النَّاسِ» جو لوگوں کے سامنے کی جائیں۔ آپ گناہ کریں لوگ دیکھ رہے ہیں۔ اور ایک مابطن ہے۔ «مَا خَفِيَ عَلَى النَّاسِ» جو آپ چھپ چھپ کر کریں، لوگ نہیں دیکھ رہے۔ یہ دونوں معصیتیں حرام ہیں۔ اپنی اپنی جگہ دونوں کا وبال بڑا خطرناک ہے۔ حدیثیں موجود ہیں۔

[1] صحیح مسلم، حدیث:2761.

نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی حدیث ہے: «كُلُّ أُمَّتِي مُعَافًى إِلَّا الْمُجَاهِرِينَ» میری ساری امت بخشش کی مستحق ہے۔ امت سے مراد امت اجابت ہے جو کلمہ پڑھ چکی، جو توحید کے دائرے میں داخل ہوچکی، جو لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کا اقرار اور اعتراف کر چکی ہے۔ اب آگے گناہ سرزد ہوتے ہیں۔ تو ساری امت معافی کی مستحق ہے۔ «إِلَّا الْمُجَاهِرِينَ» سوائے ان لوگوں کے جو لوگوں کے سامنے دکھا کر گناہ کرتے ہیں، جہر بالمعصیۃ۔ جو گناہوں اور نافرمانیوں میں جہر، اعلان اور تشہیر کا پہلو اختیار کرتے ہیں۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ اس معصیت میں اس کی شہرت ہے۔ فرمایا کہ یہ لوگ معافی کے قابل نہیں ہیں۔ اور گناہ برسرعام کرنا اس کی ایک صورت تو واضح ہوگئی کہ لوگوں کے سامنے گناہ کیا جارہا ہے۔ اور حکم پتہ چل گیا کہ یہ لوگ ناقابل معافی ہیں، یعنی گناہ کرنا ویسے اللہ تعالیٰ کی غیرت کو للکارنا ہے اور یہ بندہ کتنا بھیانک مجرم ہے جو لوگوں کو دکھا کر ان کے سامنے گناہ کر رہا ہے۔ ایسی معصیت اور اس کا وبال کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ اور ایسے بندے معافی کے مستحق نہیں ہیں۔

اسی حدیث میں نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے معصیت کے جہر، اعلان اور تشہیر کی ایک شکل اور بیان کی ہے کہ بندہ چھپ کر گناہ کرتا ہے۔ «وَقَدْ بَاتَ يَسْتُرُهُ رَبُّهُ» رات کی تاریکی میں چھپ کر گناہ کیے۔ اب رات بھر وہ سو رہا ہے۔ رات اس نے گزاری اس طرح کہ اللہ تعالیٰ رات بھر اس پر پردہ ڈالے رکھتا ہے۔ لیکن «وَيُصْبِحُ يَكْشِفُ سِتْرَ اللّٰهِ عَنْهُ» [1] اور یہ بدبخت صبح اٹھتا ہے اور اللہ کے پردے کو خود ہی پھاڑتا اور فاش کرتا ہے۔ جو اللہ نے پردہ ڈالا تھا، مہربانی کی تھی، صبح اٹھا اور خود ہی اس پردے کو پھاڑتا ہے۔

[1] صحيح البخاري، حديث:6069.

اس راز کو افشا کرتا ہے۔ یہ کتنا بڑا مجرم ہے؟ اپنی معصیت کی تشہیر کر رہا ہے۔ یہ بھی مجاہرین ہیں۔ جہر کے ساتھ معصیت کرنے والے۔ تو اس کا معنی ہے معصیت کا اظہار، معصیت کا اعلان، لوگوں کو دکھا کر گناہ کرنا یا چھپ کر کیے ہوئے گناہ کی تشہیر کرنا، یہ سب مجاہرین ہیں اور پیغمبر ﷺ کے فرمان کے مطابق یہ بخشش کے مستحق نہیں ہیں۔ اگر اپنی عافیت چاہتے ہیں اور اپنی عاقبت کی بہتری اور سلامتی چاہتے ہیں تو ان کو توبہ کرنی پڑے گی۔

اسی طرح جو معصیت یا فاحشہ آپ چھپ کر کرتے ہیں، اس کا وبال بھی بڑا ہیبت ناک ہے، بڑا لرزہ خیز ہے کیونکہ نبی ﷺ کی حدیث ہے: «لَأَعْلَمَنَّ أَقْوَامًا مِّنْ أُمَّتِي يَأْتُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِحَسَنَاتٍ أَمْثَالِ جِبَالِ تِهَامَةَ» قیامت کے روز میری امت کے کچھ لوگ نیکیاں لے کر آئیں گے۔ ان نیکیوں کا مجسمہ تہامہ پہاڑوں کے برابر ہوگا۔ اتنی ثقیل نیکیاں، اتنی وزنی نیکیاں، اگر میزان حسنات میں ڈال دی جائیں تو اس کا پلڑا کتنا بھاری ہوگا؟ اتنی ثقیل نیکیاں لائیں گے لیکن «فَيَجْعَلُهَا اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ هَبَاءً مَّنْثُورًا» اللہ رب العزت ان نیکیوں کو هَبَاءً مَّنْثُورًا کردے گا۔ ذرے بنا کر بکھیر دے گا۔ جن کا وزن اور ثقل پہاڑوں جیسا تھا، وہ ذرے بن کر بکھر چکی ہیں۔ بالکل بے قیمت اور بلا فائدہ ہوگئی ہیں۔ سب نیکیاں برباد ہوگئی ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ ہماری ہی بولی بولنے والے لیکن معاملہ یہ تھا: «إِذَا خَلَوْا بِمَحَارِمِ اللّٰهِ انْتَهَكُوهَا»[1] جب خلوت میں گناہ ان کے سامنے آتے تو اللہ کی حدوں کو پامال کرتے۔ لوگوں کے سامنے ان کا روپ، بڑا پارسائی کا روپ، تقویٰ اور پرہیزگاری کا روپ۔ ہاں خلوت

[1] سنن ابن ماجہ، حدیث:4245.

میں ان کا تقویٰ رخصت ہوجاتا ہے اور اللہ کی حرمت کو پامال کرتے ہیں۔ گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس کا معنی: گناہ خواہ علی الاعلان ہو، خواہ خلوت کا ہو، دونوں کا انجام بھیانک ہے۔ کیوں؟ علی الاعلان گناہ، یہ معصیت کی تشہیر، معصیت کا جہر ویسے ہی معصیت کرنے والا اللہ تعالیٰ کی غیرت کو للکارتا ہے اور برسرعام کھلے بندوں للکار رہا ہے۔ اس کا وبال تو کئی گنا بڑھ جائے گا۔ اور چھپ کر گناہوں کا ارتکاب، ایسے شخص کی طرف سے جس کا ظاہر پرہیزگاری پر قائم ہے، لوگوں کے سامنے بڑا متقی ہے، پرہیزگار ہے، یہ کتنا بڑا مجرم ہے؟ لوگوں کو دکھانے کے لیے کیا ہے؟ پرہیزگاری۔ اور خلوت میں جہاں لوگ نہیں دیکھ رہے اللہ دیکھ رہا ہے تو اللہ کو دکھانے کے لیے کیا ہے؟ باغیانہ رویہ، معصیتیں اور گناہ۔ لوگوں کے لیے یہ ہے اور اللہ کے لیے یہ ہے۔ لوگوں کو دکھانے کا اچھا پہلو اور اپنے خالق اور مالک کے لیے یہ پہلو کہ خلوت میں چن چن کر گناہ کرتے ہو۔ یہ گناہ جیسے بھی ہوں، کھلے عام ہوں یا چھپ کر کیے جائیں، یہ خالق و مالک کی ناراضی کا سبب ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی غیرت کو للکارنے کے مترادف ہیں۔ اور انتہائی بھیانک ہیں۔ ان سے برا انجام اور برا نتیجہ برآمد ہوگا۔ لہٰذا ہمارے لیے ضروری ہے تقویٰ، ورع اور پرہیزگاری کی زندگی، اپنے آپ کو معصیتوں سے بچا کر نکل جانا۔ بالخصوص جہر بالمعصیۃ اور برسرعام گناہوں کا ارتکاب، یہ بہت بڑا مفسدہ ہے۔ گناہوں کی تشہیر بھی ایک طرح سے گناہوں کی دعوت ہے، جس کا انجام انتہائی بھیانک ہے۔ انتہائی خطرناک ہے۔ تو ہمیں خلوت یا جلوت ہر معاملے میں، ہر موقع پر اللہ رب العزت کی حدود کا احترام کرنا ہے، کسی ایسے امر کا ارتکاب نہیں کرنا جو ہمارے پروردگار کو ناراض کردے اور جو ہمارے لیے خطرناک انجام اور وبال کا باعث بن جائے۔

اس کے مقابلے میں تقویٰ اور پرہیزگاری کی زندگی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی ہدایات پر عمل کریں جن میں ایک بڑی اہم ہدایت وہ ہے جو آپ ﷺ نے ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمائی۔ آپ سے پوچھا گیا: «مَا النَّجَاۃُ؟» یارسول اللہ ﷺ! نجات کیا ہے؟ مخرج کیا ہے؟ عافیت کا راستہ کیا ہے؟ جہنم سے بچاؤ کا طریقہ کیا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے چند امور کی نشاندہی فرمائی۔ ان میں سے ایک «وَلْيَسَعْكَ بَيْتُكَ» [1] ''اپنے گھر کی چاردیواری کو اپنے لیے کافی سمجھ۔'' آپ کا ہر فرمان حکمت سے بھرا ہوا ہے۔ اس فرمان میں بڑی حکمت ہے۔ اور آج کے دور پر یہ پوری طرح منطبق ہورہا ہے۔ اس پر اگر ہم غور کریں کہ تم گھر کے حاکم ہو اور گھر کے راعی ہو، تمھارے اہل خانہ تمھاری رعیت ہیں۔ اپنے گھر کی چاردیواری کو کافی سمجھو۔ باہر نکلو گے، باہر عریانی، فحاشی، گناہوں کی دعوت، برسرعام گناہوں کا ارتکاب، شیطان کی شرارتیں، شیطان کے چیلے، شیطان کے چوزے اور انڈے بکھرے پڑے ہیں جو تمھارے عقیدے پر، تمھارے اخلاق پر اور تمھارے عمل پر وار کریں گے۔ ان سے بچاؤ کا سب سے اہم راستہ یہی ہے «وَلْيَسَعْكَ بَيْتُكَ» اپنے گھر کو کافی سمجھو۔ اور گھروں میں بھی معصیتیں ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں۔ بہت سے طرق، بہت سے راستے، کچھ ہم نے خود کھولے ہوئے ہیں۔ آج گھروں میں بھی برائی کی بہت سی صورتیں موجود ہیں۔ اور فحاشی وعریانی کا ایک سیلاب امڈ پڑا ہے جو خارج اور باطن میں پھیلا ہوا ہے۔ اور اس کا بہاؤ انتہائی تیز ہے جس کی لہروں کی لپیٹ میں تقریباً ہر شخص آرہا ہے إِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبِّي اللہ کا رحم ہو، اللہ کی رحمت ہو، اللہ بچالے تو اللہ کی توفیق سے بچاؤ ممکن ہے۔

[1] جامع الترمذي، حديث:2406.

«وَلْيَسَعْكَ بَيْتُكَ» اپنے گھر کی چاردیواری کو اپنے لیے کافی سمجھو تاکہ باہر کی جو شرارتیں ہیں اور جو شیطان کی دعوتیں ہیں ان سے بچ سکو۔ اور گھر میں رہ کر حکمت یہ ہے کہ آپ اپنے گھر والوں پر توجہ دے سکو۔ ان پر تمھاری نظر ہو «كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ» [1] تمھیں اس بات کا ادراک ہونا چاہیے کہ تم میں سے ہر ایک راعی ہے اور ہر راعی سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔ چنانچہ ایک مرد راعی ہے اپنی بیوی کا اور بچوں کا۔ اس سے سوال ہوگا، بازپرس ہوگی۔ تو جب تم گھروں میں بیٹھو گے۔ تو اپنی رعیت پر، یہ چاردیواری جس پر تمھاری حکومت قائم ہے اس پر تمھاری نگاہ ہوگی۔ تم سے ان کے بارے میں سوال ہوگا، بازپرس ہوگی۔ «وَلْيَسَعْكَ بَيْتُكَ» اس کا کتنا اہم فائدہ ہے۔ ان پر توجہ ہوگی۔ جب بچوں کے ہاتھوں میں موبائل ہیں اور جب تم نے خود ہی گھروں میں اخبارات کے راستے کھولے ہیں کہ تازہ خبریں ہم تک پہنچیں گی مگر اس بات سے ہم غافل ہیں کہ اخباروں کے دامن میں اور کیا کچھ ہے۔ انتہائی بدتمیزیاں، بدتہذیبیاں، انتہائی خطرناک دعوتیں اور سازشیں ان اخبارات کے دامن میں ہوتی ہیں۔ بعض اوقات پڑھ کر حیرت بھی ہوتی ہے، ہنسی بھی آتی ہے، مثلاً: اخباروں پر ہیڈنگ لگی: فنکاروں نے عید کیسے منائی؟ فنکار رمضان کیسے گزارتے ہیں؟ فنکار عید کیسے مناتے ہیں؟ کتنی بھیانک اور کتنی احمقانہ باتیں ہیں۔ یہ قوم کے مجرم، فحاشی پھیلانے والے گویے اور ہم ان کو اپنے بچوں کے لیے مثال بنائیں کہ ان کی عیدیں کیسے گزرتی ہیں؟ یعنی یہ خبریں ہم پڑھیں، ہمارے بچے پڑھیں اور اوپر انتہائی حیاسوز تصویریں ہوتی ہیں کہ پڑھو ان کو، آئیڈیل بناؤ، نمونہ

[1] صحيح البخاري، حديث:893.

بناؤ۔ ان کا رمضان کیسے گزرتا ہے؟ ان کی عیدیں کیسے گزرتی ہیں؟ ان کی قربانی کیسے گزرتی ہے؟ تو یہ راستے ہم نے خود کھولے ہیں۔ یہ بھی فحاشی و عریانی اور معصیت کی ایک دعوت ہے۔ ایسے مجلّات گھروں میں کیوں داخل ہوتے ہیں؟ اسلامی لٹریچر، صحیح بخاری، صحیح مسلم، قرآن پاک کی تفسیر، نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی احادیث کا مجموعہ، بلوغ المرام ترجمے کے ساتھ۔ حجت تو اللہ کی پوری ہو چکی ہے۔ پوری شریعت اگرچہ عربی میں ہے مگر اردو ترجمہ ہو کر آ چکی ہے۔ بچوں کے ہاتھ میں وہ ہو۔ جب بچے خفیہ طور پر اپنے موبائل سے کھیلتے ہیں جن میں الف سے یا تک ہر برائی موجود ہے۔ ان پر توجہ نہیں دی جائے گی تو یہ وہ چیزیں ہیں جو ہم نے خود پیدا کی ہوئی ہیں۔ اپنے گھروں میں اس میڈیا کے ذریعے خود داخل کی ہیں۔ میڈیا خود بڑا ظالم ہے، بلکہ شیطان کا کارندہ ہے۔ اور اس فیشن اور بے حیائی کو فروغ دینے والا ہے۔ اس کی تو چاہت ہے کہ خبریں چن چن کر لائے۔ وہ تو فخر کرتے ہیں فلاں خبر ہم نے پہلے نشر کی۔ یہ ہمیں طرۂ امتیاز حاصل ہے۔ کشمیر کا زلزلہ سب سے پہلے ہم نے بیان کیا۔ فلاں کی موت سب سے پہلے ہم نے نشر کی۔ فلاں حادثہ کی خبر سب سے پہلے ہم نے دی۔ ان ساری نحوستوں کا منبع میڈیا ہے۔ تو بذاتِ خود یہ شیطان کے کارندے ہیں۔ کہیں واقعہ ہو جائے، مثلاً: کسی کی عزت کو روندا گیا۔ مجھے بتائیں اس کو میڈیا پر دینے کا کیا مقصد؟ کیا میڈیا قوم کا نگہبان اور محافظ ہے؟ امیر المومنین ہے کہ ان خبروں کا وہ تعاقب اور تتبع کرے۔ ایسی خبروں کو تلاش کرے۔ یا تو کوئی شرعی نتیجہ ہو۔ میڈیا کو ان کو سزا دینے کا اختیار دیا گیا؟ ان کو تنبیہ کرنے کا اختیار دیا گیا جو آپ اس کو نشر کر رہے ہیں؟ لیکن پھر ان کا مکمل انٹرویو، کیا طریقہ واردات ہے؟ کس طرح گھر میں داخل ہوئے؟ یہ بھی برائی کو

فروغ دینے کا طریقہ ہے۔ اور میڈیا کا کردار ایک ایسا کردار ہے جو کسی اعتبار سے شریعت کا پسندیدہ نہیں ہے۔

سترِ مومن کا حکم کہاں چسپاں ہوگا؟ ایک مومن سے ایک معصیت ہوگئی اس پر پردہ ڈالنا ہے، اس کے عیب کو چھپانا ہے۔ اور سب سے زیادہ ان عیوب کا کشف کرنے والا میڈیا ہے۔ ایک عیب، ایک گناہ کسی سے سرزد ہو جائے اور میڈیا اس کے درپے ہو جائے۔ ملک کے کونے کونے میں خبر پہنچ جائے۔ سترِ مومن «مَنْ سَتَرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ: سَتَرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»[1] جو اپنے کسی مسلمان بھائی پر پردہ ڈال دے اللہ قیامت کے روز اس کے عیب پر پردہ ڈال دے گا۔ «مَنْ سَتَرَ عَلٰى أَخِيهِ عَوْرَةً فَكَأَنَّمَا أَحْيَا مَوْؤُودَةً»[2] جو اپنے کسی مسلمان بھائی کی کسی غلطی پر پردہ ڈال دے، اللہ اتنا خوش ہوتا ہے کہ اس شخص نے پردہ ڈال کر گویا جاہلیت کے دور کی زندہ درگور لڑکی کو قبر سے نکال کر زندہ کر دیا۔ جس بچی کو ماں باپ نے زندہ قبر میں گاڑ دیا تھا، اس نے قبر کو کھود کر گویا اس بچی کو نکالا اور اس کو زندہ کر دیا۔ کتنی بڑی یہ خوشی کی خبر ہوگی۔ فرمایا: اپنے کسی بھائی کی پردہ پوشی پر اللہ اتنا راضی ہوتا ہے۔ تو یہ سب معصیتوں کو دعوت دینے والی باتیں ہیں۔ اگر ہمارے گھر میں یہ میڈیا ہوگا، یہ مجلّات اور موبائل ہوں گے اور ان کی نگرانی بھی نہ ہو، ہمارا وقت باہر گزرتا ہو تو بھائی! توجہ کون دے گا؟ پیارے پیغمبر محمد رسول اللہ ﷺ سے جب پوچھا گیا کہ نجات کیا ہے؟ تو آپ نے نجات کا راستہ بیان کیا۔ «وَلْيَسَعْكَ بَيْتُكَ» یہ نجات ہے کہ اپنے گھر کی چاردیواری کو اپنے لیے کافی سمجھو۔

---

[1] مسند أحمد: 522/2. [2] شعب الإيمان: 106/7.

«وَابْكِ عَلَى خَطِيئَتِكَ» [1] اور کوئی گناہ ہو جائے اس پر رونے بیٹھ جاؤ، اس پر رویا کرو۔ یعنی یہ تعلق ہو گناہ سے۔ گناہ اللہ تعالیٰ کی غیرت کو للکارنے کے مترادف ہیں۔ صحیح بخاری و مسلم میں حدیث ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: مجھے غیرت آتی ہے اور اللہ کو بھی غیرت آتی ہے۔ بلکہ ایک چھوٹا سا قصہ رونما ہوا۔ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر اپنے گھر میں داخل ہوں اور میرے گھر میں کوئی اجنبی موجود ہو، تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا، تلوار کی دھار کے ساتھ اس کا گلا کاٹ دوں گا۔ «غَيْرَ مُصْفَحٍ» چپٹی تلوار نہیں ماروں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ذرا سعد کی غیرت دیکھو! «وَاللّٰهِ لَأَنَا أَغْيَرُ مِنْهُ» اللہ کی قسم! میں سعد سے بڑا باغیرت ہوں۔ «وَاللّٰهُ أَغْيَرُ مِنِّي» اللہ تعالیٰ مجھ سے بڑا باغیرت ہے۔ «وَمِنْ أَجْلِ غَيْرَةِ اللّٰهِ حَرَّمَ الْفَوَاحِشَ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ» [2] تبھی تو اللہ نے فواحش کو حرام کر دیا، خواہ وہ فواحش ظاہری ہوں یا باطنی ہوں۔ کھلے عام ہوں یا چھپ کر کی جائیں۔ اللہ نے ان کو حرام کر دیا ہے۔

میرے بھائیو! فواحش کے آج بہت سے مظاہر ہیں۔ بازاروں میں یہ فیشن ایبل عورتیں، یہ فحاشی و عریانی اور یہ سب کچھ ہونا تھا کیونکہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کا فرمان ہے: «صِنْفَانِ مِنْ أُمَّتِي لَمْ أَرَهُمَا» ''میں نے اپنی امت کے دو طرح کے افراد کو ابھی تک نہیں دیکھا۔ میرے اس دور تک، میری زندگی تک وہ نہیں ہیں۔ آگے چل کر آئیں گے۔ میری امت کے دو طرح کے لوگ۔ ایک «قَوْمٌ مَّعَهُمْ سِيَاطٌ كَأَذْنَابِ الْبَقَرِ» [3] ایک وہ قوم جن کے کندھوں پر کوڑے ہوں گے۔ کس طرح ہوں گے؟ جیسے

[1] جامع الترمذي، حديث: 2406. [2] صحيح البخاري، حديث: 7416، و صحيح مسلم، حديث: 1499. [3] صحيح مسلم، حديث: 2128، و ابن حبان: 500/16.

گائے کی دم ہے، یعنی گائے کی دم ہمیشہ اس کے ساتھ ہے۔ یہ کوڑے ہمیشہ ان کے ساتھ ہوں گے۔ یہ لوگ ظالم ہوں گے، بڑے شداد قسم کے، سخت گیر، تشدد کرنے والے، ظلم کرنے والے، رعیت کو مارنے والے ہوں گے۔ کوڑے رکھنا جائز ہے، برسانا جائز نہیں ہے سوائے کسی شدید ضرورت کے۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی حدیث ہے: «عَلِّقُوا السَّوْطَ حَيْثُ يَرَاهُ أَهْلُ الْبَيْتِ» [1] اپنے کوڑے رکھو، اوپر لٹکا دو، کہیں اوپر جہاں تک پہنچنا مشکل ہو، تمھارے اہل وعیال کو نظر آتے ہوں، کوڑا موجود ہے سیدھے رہو، بن سنور کر رہو، کوئی غلطی نہ کرو۔ ورنہ کوڑا حرکت میں آ سکتا ہے۔ برسانا نہیں ہے۔ یہ تشدد دین اسلام کی سیاست ہی نہیں ہے۔

نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے ہزاروں صحابہ حدیث اور قرآن کے حفاظ تھے۔ کسی حافظِ قرآن اور کسی حافظ حدیث کی اللہ کے پیغمبر نے کبھی پٹائی کی؟ کوئی حوالہ ہے تو پیش کرو۔ ہزاروں حفاظ تھے۔ آج ہم بھی حفاظ تیار کرتے ہیں۔ تو کیا ضروری ہے ان کے بازو توڑ کر تیار کریں۔ ان کی ٹانگیں توڑ ڈالیں۔ بعض اوقات تشدد سے بچہ مرجاتا ہے۔ یہ تربیت کا کوئی انداز نہیں ہے۔ لہٰذا کسی بھی معاملے میں تربیت کرنی ہے تو نبی علیہ الصلاۃ والسلام کا اسوہ ہمارے سامنے ہے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: «خَدَمْتُ النَّبِيَّ ﷺ عَشْرَ سِنِينَ» میں نے پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کی دس سال خدمت کی۔ دس سال کی عمر میں اللہ کے پیغمبر کے پاس آئے تھے اور بیس سال کی عمر تک ساتھ رہے۔ فرماتے ہیں کہ اللہ کی قسم! یہ دس سال کا عرصہ، اللہ کے پیغمبر نے ایک بار بھی مجھے مارا نہیں، نہ کبھی ڈانٹا اور نہ کبھی یہ کہا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا اور یہ کام کیوں نہیں کیا؟ [2] یہ اخلاق عظیم محمد رسول اللہ ﷺ

[1] السلسلة الصحيحة: 23/3. [2] صحيح البخاري، حديث: 6038، و مسند أحمد: 265/3.

کے تھے۔ یہ ہے آپ کی تربیت کی اساس اور پھر اُس معاشرے میں سے کیسی نسل پیدا ہوئی؟ جس معاشرے میں ظلم تھا، جہالت تھی، اخلاق سوز باتیں تھیں، حیاسوز امور تھے، شراب نوشی تھی، زنا کاری تھی، سود خوری تھی، اس معاشرے میں سے کیسی قوم تیار ہوئی! کیا ان کا تقویٰ تھا! کیا ان کا تعلق باللہ تھا!

اور یہ پردے کے امور میں بھی، اللہ کے خوف کے مظاہر موجود ہیں اور پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کی تربیت کے نمونے موجود ہیں۔ پردے کا حکم رات کو اترا۔ صحابہ نے نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی۔ اور رات کو پردے کی وحی اتری۔ پردے کا حکم آ گیا۔ پردہ کرنا ضروری ہے۔ صحابہ اللہ کا یہ پیغام لے کر اپنے گھروں کو گئے۔ اپنی بیویوں کو، بیٹیوں کو جمع کر لیا، اللہ کی وحی سنادی۔ رات بھر وہ عورتیں سوئی نہیں۔ اپنے کمبلوں، ٹاٹوں اور بستر کی چادروں کو پھاڑ پھاڑ کر اپنی اوڑھنیاں بنائیں اور صبح فجر کی نماز میں کوئی عورت ننگے سر اور کھلے چہرے کے ساتھ نہیں تھی۔ [1] اطاعت، اتباع، اللہ کے پیارے پیغمبر کی پیروی۔ تربیت کے مظاہر موجود تھے۔ ڈھکی چھپی آ رہی ہیں۔ اپنے سر کی چوٹی سے لے کر اپنے پاؤں کی ایڑی تک بالکل ڈھکی چھپی آ رہی ہیں۔ یہ اطاعت ہے۔ یہ پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کے امر کی تنفیذ ہے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! ہم نے چہرے تو ڈھانپ لیے، اپنے پاؤں کا کیا کریں؟ ہم چاہتی ہیں کہ ہماری چادر ایک بالشت لمبی ہو، دو بالشت لمبی ہو۔ فرمایا کہ تم ایک بالشت لمبا کرلو۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! اس سے قدم کھلنے کا اندیشہ ہے۔ فرمایا کہ دو بالشت کرلو۔ بس ایک الجھن باقی رہ گئی۔ رستہ طرح طرح کا ہوتا ہے۔ کہیں صفائی ہے، کہیں پر غلاظت

[1] تفسير ابن أبي حاتم: 2575/8، و سنن أبي داود، حديث: 4101.

ہے۔ وہ چادر غلاظت سے گزرے گی، اس کو روندے گی تو کپڑے کی ناپاکی کا اندیشہ ہے۔ اس مشکل کا حل کیا ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «يُطَهِّرُهُ مَا بَعْدَهُ» اگر کسی ناپاک جگہ پر وہ چادر لگ گئی، بعد میں پاک مٹی آئے گی تو پاک مٹی کو روندنے سے وہ پاک ہو جائے گی۔ [1] دیکھو! خواتین کی چاہت کیا ہے؟ کیسا پردہ ہے! آج ہمیں اشکال ہے کہ چہرے کا پردہ ہے یا نہیں؟ بعض ایسے لوگ جن کا فہم نہیں اس بات کے داعی بنے ہوئے ہیں کہ چہرے کا پردہ نہیں ہے۔ آپ صحابیات کا موقف دیکھیں کہ پاؤں کی چادر کو بھی کئی بالشت بڑھانا چاہتی تھیں۔ اللہ کے پیغمبر نے فرمایا: اس سے زیادہ نہیں۔ صحابیات تو اس طرح چہرے اور پاؤں کو ڈھانپ رہی ہیں۔ یہ صحابیات کا منہج ہے۔ اور آج معاشرہ کہاں ہے اور کیا کچھ ہو رہا ہے؟

میرے دوستو اور بھائیو! اس معاشرے میں جہاں فحاشی کا سیل رواں ہے، ہم جیسے درویشوں کو کون سنے گا ٹی وی کے خلاف، بازاروں میں چھائی ہوئی فحاشی کے خلاف، بازاروں کی رونقوں کے خلاف۔

اور پھر جو لوگ مختلف اشیاء بناتے ہیں ان کی تشہیری مہم میڈیا پر پیش کرتے ہیں، مثلاً: کپڑے کی تشہیر اور فلاں کی تشہیر، پھر اس میں کیسے حیاسوز مناظر ہوتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہوسکتا ہے ان کا کاروبار حلال کا ہو، سود سے پاک ہو لیکن اس کا آغاز اس تصویر سے کر کے، فحاشی سے کر کے، عریانی سے کر کے، کیا یہ لوگ اپنے کاروبار کو حرام نہیں کر رہے؟

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

[1] جامع الترمذي، حديث: 1731، 143.

جس عمارت کی پہلی اینٹ ٹیڑھی ہو اس عمارت کو ثریا ستارے تک اونچا لے جاؤ، وہ ٹیڑھی ہی رہے گی۔ تو جس کاروبار کی اساس امرِ محرّم پر ہو، فحاشی پر ہو، فحاشی کو فروغ ہو، فحاشی کی دعوت ہو تو یہ خشتِ اول ہے، پہلی اینٹ ہے۔ تو پھر یہ عمارت آخر تک کیسی جائے گی؟ اس کاروبار کا آگے کیا حکم ہوگا؟ تو ان چیزوں کو ہم کہاں روک سکتے ہیں؟ افہام وتفہیم سے ایک بات ہوسکتی ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کے پیغامات پہنچائے جاسکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے خوف کی دعوت دی جاسکتی ہے۔ اور تقویٰ اختیار کرنے کی دعوت دی جاسکتی ہے۔ اس سے زیادہ ہم کیا کرسکتے ہیں؟ لیکن فتنوں کے اس دور میں ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے گھر پر اپنی توجہ دیں تا کہ ہمارے گھروں کی اصلاح ہو۔ ہمارے گھروں کی جوابدہی ہماری گردنوں پر قائم ہے۔ اس پر آپ توجہ دیں۔ باقی یہ مجلّات، یہ رسائل جن میں ہندوستان کا فیشن، ہندوستان کی تہذیب، یورپ کا کلچر نمایاں کیا جارہا ہے، ہمارے گھروں میں آتے ہیں، ہماری بچیاں ان کو پڑھتی ہیں، ویسا بننے کی اور ویسا فیشن اپنانے کی کوشش کرتی ہیں۔ کوئی اللہ کا خوف نہیں۔ ان کے خلاف آواز تو اٹھائی جاسکتی ہے مگر ان کو بزور بازو روکنا حکومت کا کام ہے۔ حکومت کے اپنے معاملات ہیں، اپنی سیاست ہے۔ اقتدار کی بندربانٹ میں وہ ایسا الجھے ہوئے ہیں کہ کسی اور کام کی ان کو ہوش ہی نہیں ہے۔

آدھی دنیا کا فاتح امیر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اس تعلق سے رات کو سوتا نہیں تھا۔ جس نے دنیا کو عدل سے اور تونگری سے بھر دیا مگر رات کو نیند نہیں آتی تھی۔ ایسا اللہ کا خوف۔ اسلامی مملکت کے حاکم عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا یہ کردار تھا؟ مجھے اپنے وزیرِاعظم کا پہلا انٹرویو یاد آرہا ہے کہ آپ کو اداکارہ کون سی پسند ہے؟ آپ کو موسیقی کون سی پسند

ہے؟ اور وہ ہنس ہنس کے جواب دے رہا ہے۔ سوال کرنے والے کو بھی حیا نہیں۔ سوال تو یہ ہونا چاہیے کہ اتنی بڑی مملکت کے آپ حاکم ہیں، یہاں کروڑوں افراد ہیں جن کی جوابدہی آپ کے سر پہ ہے، آپ کو رات کو نیند آجاتی ہے؟ آپ رات کو تہجد میں اٹھ کر دعا کرتے ہیں کہ یااللہ! استقامت دے دے؟ امیر عمر تو ایک چھوٹی سی مہم کی تنفیذ کے لیے رات کو جاگتے تھے اور دعائیں کرتے تھے: یا اللہ! کامیابی دے دے۔ یااللہ! عافیت دے دے۔ اس مہم میں یااللہ! فلاح اور کامیابی عطا فرما دے۔ اگلے روز اس لشکر کے پاس آتے اور کہتے کہ آج نہ جاؤ۔ عمر کو ایک رات اور دے دو، لگتا ہے دعاؤں میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔ آج رات کچھ اور دعائیں مانگ لوں۔ پھر دعا مانگتے، رات کو نیند نہیں آتی۔ مدینے میں گھوم رہے ہیں، پھر رہے ہیں، اپنی رعیت کے حوالے کا جائزہ لے رہے ہیں۔ میری رعیت میں کوئی معصیت تو نہیں۔ اس کی اصلاح کی جائے۔ ایک رات ایک مکان کے پاس سے گزرے۔ اندر سے باتوں کی کچھ آواز آرہی تھی۔ کوئی خاتون ہے جو رات کے اس پہر جاگ رہی ہے اور کسی سے باتیں کررہی ہے۔ وہ خاتون یہ شعر پڑھ رہی تھی:

تَطَاوَلَ هٰذَا اللَّيْلُ تَسْرِي كَوَاكِبُهٗ
وَأَرَّقَنِي أَنْ لَّا ضَجِيعَ أُلَاعِبُهٗ
فَوَاللّٰهِ! لَوْلَا اللّٰهُ تَخْشٰى عَوَاقِبُهٗ
لَزُعْزِعَ مِنْ هٰذَا السَّرِيرِ جَوَانِبُهٗ
مَخَافَةُ رَبِّي وَالْحَيَاءُ يَصُدُّنِي
وَإِكْرَامُ بَعْلِي أَنْ تُنَالَ مَرَاتِبُهٗ

یہ رات لمبی ہے۔ ٹھنڈی ہے اور بہت ہی تاریک ہے۔ جب رات میں یہ صفات ہوں، لمبی بھی ہو، ٹھنڈی بھی ہو، تاریک بھی ہو، ہر خاتون کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا شوہر اس کے ساتھ ہو۔ اور وہ کہہ رہی ہے:

وَأَرَّقَنِي أَنْ لَا ضَجِيعَ أُلَاعِبُهْ

لیکن ہماری نیند اڑی ہوئی ہے اس لیے کہ ہمارا خلیل، ہمارا شوہر ہمارے پاس نہیں ہے۔ وہ ہم سے دور ہے۔ طبیعت بڑی آمادہ ہے اس کی قربت پر، وہ مجھ سے دور ہے۔

فَوَاللّٰهِ! لَوْلَا اللّٰهُ تَخْشَى عَوَاقِبُهْ

اللہ کی قسم! اگر اللہ کی سزا کا خوف نہ ہوتا۔

لَزُعْزِعَ مِنْ هٰذَا السَّرِيرِ جَوَانِبُهْ

تو میری چارپائی کے پائے حرکت کررہے ہوتے۔ میں کسی کو بھی دعوت دے کر بلاسکتی تھی۔ اس تاریکی میں کون دیکھ رہا ہے؟ میری چارپائی کے پائے حرکت کررہے ہوتے۔

مَخَافَةُ رَبِّي وَالْحَيَاءُ يَصُدُّنِي

مگر میرے پروردگار کے ڈرنے اور میری حیا نے مجھے روک دیا ہے۔ میں اسلامی حیا کی مالک ہوں، مسلمان ہوں، حیا ہمارا زیور ہے۔ اس نے بھی روک دیا۔

وَإِكْرَامُ بَعْلِي أَنْ تُنَالَ مَرَاتِبُهْ

اور شوہر کے اکرام نے روک دیا کہ میں تو اپنے سر کی چوٹی سے لے کر اپنے پاؤں کے ناخن تک اپنے شوہر کی امانت ہوں۔ ان مراتب پر میرے شوہر کے علاوہ کون فائز ہوسکتا ہے؟

امیر عمر رضی اللہ عنہ ان اشعار کو سنتے ہیں اور سکتے میں آجاتے ہیں کہ میری رعیت میں کیا ہورہا ہے؟ اس عورت کا کیا معاملہ ہے؟ رات کی تاریکی میں یہ کیا باتیں کررہی ہے؟ اس گھر کی نشاندہی کرگئے۔ صبح ہوئی، اس گھر کے احوال کا تفقّد (لوگوں سے حالات دریافت کیے۔) کیا، پتہ چلا اس کا شوہر ایک عرصے سے مجاہدین کے ساتھ جہاد پر گیا ہے۔ کتنا عرصہ ہوگیا ہے؟ بڑا طویل عرصہ، کئی سال، اللہ اکبر۔ اس کا کیا حل ہو، اس کا کیا علاج ہو؟ پہلا علاج کیا کیا؟ امیر المومنین نے برید (سرکاری چھٹی) بھیجی۔ اس کے شوہر کو لے کر آو۔ برید کیا ہوتی ہے؟ برید سرکاری پیغامبر۔ راستے میں مختلف چوکیاں ہوتی ہیں۔ ایک گھوڑے پر بیٹھا اور ایک مرحلہ طے کیا، دس بارہ میل، بیس میل۔ آگے ایک دوسری چوکی آگئی۔ دوسری چوکی پر تازہ دم گھوڑا تیار ہوتا تھا تاکہ تاخیر نہ ہو۔ اس گھوڑے سے اترا، اگلے گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ تیسری چوکی پر تیسرا گھوڑا۔ یہ برید ہوتی ہے، تیز ترین قافلہ۔ یہ ڈاک کو پہنچانے کا انداز ہے۔ اس کے شوہر کو لے کر آو۔ برید کے ذریعے شوہر کو حاضر کیا گیا۔ اس خاتون کا مسئلہ حل ہوگیا۔ ایسی کئی خواتین ہوسکتی ہیں۔ کیا ہمارے حکام کو ان امور میں سوچنے کی فرصت ہے؟ کوئی ایسا تفقد ہے؟ کوئی ایسا جانچ پڑتال کا، کوئی خبر گیری کا نظام ہے؟ نہیں ہے، کوئی نہیں ہے۔ لیکن یہاں آپ دیکھیں امیر عمر رضی اللہ عنہ کی پریشانی۔

ابھی اگلے مسئلے کا حل کیا ہو؟ اپنی بیٹی حفصہ رضی اللہ عنہا، جو ام المومنین تھی، ان کے پاس گئے۔ ان کی بیٹی ضرور ہے مگر پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کی حرمت تھی، ام المومنین تھی۔ جاکر کہا کہ بیٹی! تم سے ایک سوال کرنے آیا ہوں، ایسا سوال کوئی باپ اپنی بیٹی سے نہیں کرتا مگر رعیت کی مسئولیت میرے سر پر قائم ہے، اسی لیے تم سے وہ سوال پوچھ رہا ہوں کہ ایک

بیوی اپنے شوہر کے بغیر صبر کے ساتھ کتنا عرصہ گزار سکتی ہے؟ فرمایا کہ چار سے چھ ماہ۔ قانون بن گیا کہ آیندہ کوئی شخص کسی مہم پر جائے یا سرکاری کام پر جائے تو وہ چار سے چھ ماہ کے اندر واپس آئے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اس سے زیادہ شوہر اگر جانا چاہتا ہے تو اپنی بیوی کی رضا سے جائے۔ اس کی اجازت سے جائے۔ [1] ایک خاتون نے قانون بنادیا۔ جہاں ایسا معاشرہ ہو، ایسا حاکم ہو، رعیت کے امور کا یہ تفقد ہو، وہاں کسی معصیت کا ارتکاب ممکن ہے؟ ان علانیہ معاصی کا قلع قمع کرنا، اپنے معاشرے کی تطہیر کرنا حکام کا فریضہ ہے۔ میری آپ کی دعوت اس میں موثر نہیں ہے۔ افہام و تفہیم سے کسی کی اصلاح ہوسکتی ہے مگر جہاں پورا معاشرہ بغاوت پر آمادہ ہو وہاں کیسے اصلاح ممکن ہے؟ تو پھر یہ میڈیا اور پھر یہ مجلّات اور برائی کے دیگر جو اسباب ہیں ان سب کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے کہ ہمارا خالق و مالک اصلاح فرمادے۔ حکام کے لیے توفیق کی دعا مانگیں، اللہ ان کو توفیق دے، ان برائیوں کا ازالہ کریں، قلع قمع کریں۔ یہ ایک بڑی کڑی مسئولیت ان کے سروں پر قائم ہے اور قیامت کی جوابدہی ان کی گردنوں پر عائد ہوتی ہے۔

میں یا آپ ایک فرد کے طور پر فحاشی کے اس سیل رواں کو کیسے روک سکتے ہیں؟ اس معاشرے کی ہم ایک اکائی ہیں۔ روکنے کا طریقہ یہ ہے کہ میں اپنی اور اپنے اہل خانہ کی اصلاح کروں اور اپنے اہل خانہ کو شریعت کی بنیادیں فراہم کروں۔ ایک گھر کی اصلاح ہوگی، دوسرے کی، تیسرے کی، چوتھے کی۔ اس افرادی اصلاح سے معاشرے کی اصلاح ممکن ہے۔ میں تو کہتا ہوں اس درس کی ضرورت ہی نہ ہوتی اگر ہر گھرانہ

[1] سنن البیهقی:2/425، و تاریخ الخلفاء للسیوطي:1/56.

نبی ﷺ کی ایک حدیث کو تھام لے، صرف ایک حدیث کو۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے:
«مُرُوا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ أَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِينَ، وَاضْرِبُوهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ أَبْنَاءُ عَشْرِ سِنِينَ» [1] اپنے بچوں کو نماز کا حکم دو جب وہ سات سال کے ہوں، حکم دو، ابھی وہ بالغ نہیں، مکلّف نہیں «وَاضْرِبُوهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ أَبْنَاءُ عَشْرِ سِنِينَ» دس سال کے ہو جائیں تو نماز نہ پڑھنے پر سرزنش کرو، ہلکی پھلکی مار پیٹ کرو، ان کو ڈراؤ، ان کو تنبیہ کرو، ان کے کان کھینچو۔ نبی ﷺ کے اس فرمان میں بچوں کی ایسی عمر کا تعین ہے کہ بچوں کا صاف ستھرا ذہن ہے اور ایک طلب ہے، اس طلب اور ذہن پر نماز نقش ہوجائے۔ یہ عمر کا وہ حصہ ہے جب بچہ بالکل صاف ذہن کا ہوتا ہے اور جو بات آپ نقش کریں گے وہ نقش ہوگی۔ اب آپ کا اختیار ہے موسیقی نقش کریں، بچوں کے سامنے بیٹھ کر ایسے پروگرام دیکھیں۔ آپ بھی دیکھ رہے ہیں، بچے بھی دیکھ رہے ہیں اور سب نقش ہورہا ہے۔ یا پھر نبی ﷺ کی تعلیمات ہیں۔ نماز کا حکم دو۔ نماز نقش کرو۔

اسد بن فرات، ان کے والد تھے فرات بن سنان۔ یہ قرطبہ کے قریب ایک گاؤں میں رہتے تھے اور علم دوست تھے۔ ویسے کاروباری تھے لیکن علم سے محبت تھی۔ اس شہر کے علماء سے علم حاصل کرچکے تھے۔ مگر علم کی تشنگی باقی تھی۔ سوچا کسی مرکزی شہر میں چلیں۔ وہاں علماء وافر موجود ہوں گے تو ان کے علم سے استفادہ کیا جائے۔ یہ سوچ کر ہجرت کی اور اپنے گاؤں سے قرطبہ آگئے۔ بڑا شہر، علماء سے بھرا ہوا، ساتھ ان کا آٹھ نو سال کا چھوٹی عمر کا بیٹا تھا۔ شہر آنے تک پیدل سفر کیا۔ جب قرطبہ پہنچ کر ایک ٹھکانے کا انتخاب کرلیا تو بچے کو بلوایا۔ کہنے لگے کہ بچے! تم تھک چکے ہو؟ کہا: ہاں، تھک چکا ہوں۔

[1] سنن أبي داود، حديث:495.

کہا: لاؤ تمھارے پاؤں دبادوں۔ بچے کے پاؤں دبا رہے ہیں۔ پھر سوچا اس بچے کو نصیحت کی جائے۔ فرماتے ہیں: بیٹا! یہ دو پاؤں جو ہیں ان پر چل کر بندہ ہر جگہ جاتا ہے۔ یہ پاؤں ہی انسان کو گندی جگہ پر لے کر جاتے ہیں اور یہ پاؤں ہی انسان کو اچھی جگہ پر لے کر جاتے ہیں۔ اگر گندی جگہ پر جائیں گے تو یہ زمین پاؤں کی ایک ایک آہٹ کی رازدان ہے۔ قیامت کے روز ایک ایک راز کو اگل دے گی۔ بڑی شرمندگی ہوگی۔ اچھی جگہ پر جاؤ گے تو یہ زمین اس راز کو اپنے سینے میں محفوظ رکھے گی اور قیامت کے روز اس راز کو اگل دے گی۔ تمھارے محاسن کا اعلان ہوگا۔ اب تم بتاؤ! تم کس قسم کی زندگی چاہتے ہو؟ اور اپنے ان قدموں کا استعمال کیسا چاہتے ہو؟

دیکھیں کیا تربیت کا انداز ہے۔ بچے کے معصوم قلب و دماغ پر یہ الفاظ نقش کر چکے ہیں۔ بچے نے طے کرلیا کہ ان قدموں سے اگر جاؤں گا تو اللہ کے گھر مسجد میں جاؤں گا، کسی مدرسے میں جاؤں گا، کسی عالم کے پاس جاؤں گا۔ اب وہ علم کا ایسا دیوانہ ہوا کہ ہر وقت علماء کی صحبت اور ان کی رفاقت میں رہتا۔ حتی کہ قرطبہ کے علماء سے سارا علم حاصل کرلیا۔ اللہ اکبر۔ اب قرطبہ کے علماء سے پوچھا: مجھے اعلم الناس کا بتادو، یعنی ایسا عالم جو اس وقت موجود دنیا میں سب سے بڑا عالم ہو، سب سے بڑا محدث ہو۔ لوگوں نے بتایا کہ اس وقت اعلم الناس ایک ہی شخصیت ہے اور وہ دارالہجرہ کے امام، امام مالک ﷫ ہیں۔ سفر کرکے مدینہ پہنچ گئے۔ امام مالک کی صحبت میں بیٹھ گئے اور امام مالک کی وفات تک سفر و حضر میں ان کے ساتھ رہے۔

یہ ایک سچی تربیت کے آثار ہیں۔ بچپن ہی سے نقوش کیا تھے؟ اچھے نقوش جو دل میں پیوست ہو گئے۔ اور پھر یہ بچہ، اسد بن فرات، فقہ مالکی کا مُدَوِّنْ ہے۔ فقہی مسائل میں،

حفظِ حدیث میں اس کی بڑی شہرت ہے۔ محدثین جانتے ہیں اسد بن فرات کا علم حدیث میں اور فقہ میں مقام کیا ہے۔ لیکن نقطۂ آغاز والد کی تربیت۔ تو ہم چھوڑ دیں اس معاشرے کو۔ علاج کیا ہے؟ «وَلْيَسَعْكَ بَيْتُكَ» [1] تمھارا گھر تمھارے لیے کافی ہو۔ اپنے گھر کی اصلاح کرو۔ اپنے بچوں کو تربیت دو۔ اپنی بیٹیوں کو تربیت دو۔

نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی ایک حدیث سناؤ۔ آپ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ تھے۔ فرمایا کہ میرے ساتھیو! کچھ دیکھ رہے ہو؟ صحابہ دیکھ رہے ہیں مگر کچھ نظر نہیں آرہا۔ فرمایا: کیا کچھ دیکھ رہے ہو؟ عرض کیا: یہاں کوؤں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کوے دیکھ رہے ہیں۔ فرمایا: غور سے دیکھو، کیا دیکھ رہے ہو؟ کہا کہ کوے دیکھ رہے ہیں «بَيْنَهَا غُرَابٌ أَعْصَمُ» ان کوؤں کے بیچ میں ایک کوا ہے جو غراب اعصم ہے۔ اعصم کوا وہ ہوتا ہے جس کی چونچ لال ہو اور پاؤں بھی لال ہوں۔ باقی سب کالے ہیں۔ یہ دیکھ رہے ہیں۔ اللہ اکبر۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے ان کوؤں کے تعلق سے صحابہ کو علم دیا۔ مربی تھے مربی۔ صحابہ کو علم دیا کہ میرے ساتھیو! کوئی عورت اس وقت تک جنت میں نہیں جاسکتی جب تک وہ ان سارے کوؤں کے بیچ میں غراب اعصم کی طرح نہ ہو۔ اپنی بچیوں کو بھی یہ حدیث سنائیں۔ اس کا معنی سمجھیں، اس کا معنی کیا ہے؟ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کیا چاہتے ہیں؟ دیکھیں یہ فتنوں کا دور ہے اور دنیا کی عورتیں فحاشی اور عریانی کے سیل رواں میں بڑھتی جارہی ہیں۔ یہ فیشن، یہ فحش اور یہ فواحش بڑھتے جارہے ہیں۔ اور جو عورتیں پردہ کرتی ہیں، اپنے حجاب کا احترام کرتی ہیں، ان کی مثال غراب اعصم کی ہے اور باقی دنیا کی عورتوں کی مثال ان سارے کوؤں کی ہے، یعنی یہ عورتیں کم ہیں جو اپنے حجاب اور پردے کا

[1] جامع الترمذي، حديث:2406.

احترام اور اہتمام کریں گی اور بے پردہ عورتیں، فحاشی پر مائل عورتیں، بے تحاشا ہوں گی۔ یہ جنت میں نہیں جائیں گی۔ جنت میں کون جائیں گی؟ وہ جو ان کوؤں کے بیچ میں غراب اعصم کی طرح ہیں، یعنی اس فتنے میں جو شرعی حجاب کی حفاظت کریں گی اور شریعت کے اقدار کی حفاظت کریں گی۔ جو خواتین بھٹک رہی ہیں ان میں انتہائی قلیل ان کی نسبت ہے اور جنت میں یہ جائیں گی۔ [1]

جنت میں وہ عورتیں نہیں جائیں گی۔ «صِنْفَانِ مِنْ أُمَّتِي» یہ دوسری صنف کیا ہے؟ «نِسَآءٌ كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ مُمِيلَاتٌ مَّائِلَاتٌ» [2] یہ عورتیں لباس پہنی ہوئی برہنہ ہیں۔ ان کا لباس یا تو باریک ہے یا پھر چست ہے۔ جسم کے سارے نشیب و فراز کو عیاں کر رہا ہے۔ مسلم خاتون ایسی ہوسکتی ہے؟ مسلم خاتون کیسی ہوتی ہے؟ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا نے سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا سے کہا: مجھے بہت ناگوار گزرتا ہے کہ عورت کی میت کو چارپائی پر رکھا ہو اور ایسے کپڑے سے ڈھانپا ہو جس سے اس کے نشیب و فراز کچھ جھلک رہے ہوں۔ اللہ اکبر۔ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے کہا: میں جب ہجرت کر کے حبشہ گئی۔ اس وقت میں نے ایک حبشی خاتون کا جنازہ دیکھا۔ انھوں نے میت کو کفن دیا ہوا تھا مگر کفن سے پہلے انھوں نے ایک بڑی نرم سی جھاڑی جسم پر ساتھ لگائی تھی تاکہ جسم کے نشیب و فراز نمایاں نہ ہوسکیں۔ [3] غور کرو! یہ جنازے سے لے کر قبر میں اتارنے تک چند لمحات ہیں۔ ان لمحات میں بھی نشیب و فراز نمایاں نہ ہوں، یہ اسلام کی تربیت ہے۔ یہ اسلام کے خطوط اور نقوش ہیں۔ ان خواتین کو یہ

[1] مسند أحمد: 197/4. [2] صحيح مسلم، حديث: 2128، وابن حبان: 500/16.
[3] السنن الكبرى للبيهقي: 138/2، حديث: 7180.

پڑھایا جائے جو اس فحاشی و عریانی کے ساتھ دندناتی پھرتی ہیں۔ اللہ اکبر۔ ایسی عورتیں بہت بڑا فتنہ ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَا أَخَافُ عَلَى أُمَّتِي فِتْنَةً أَخْوَفُ عَلَيْهَا مِنَ النِّسَآءِ وَالْخَمْرِ» [1]

”مجھے اپنی امت پر گمراہی کے تعلق سے دو چیزوں کا خوف ہے: ایک عورتوں کا اور دوسرا شراب کا۔“

نبی علیہ الصلاۃ والسلام کا فرمان ہے:

«اِتَّقُوا النِّسَآءَ فَإِنَّ أَوَّلَ فِتْنَةِ بَنِي إِسْرَائِيلَ كَانَتْ فِي النِّسَاءِ» [2]

عورتوں سے بچو، یعنی اجنبی عورتوں سے دوری اختیار کرو، بچو ان سے، ڈرو ان سے۔ فرمایا کہ بنی اسرائیل کا پہلا فتنہ عورتوں کے تعلق سے تھا۔ جس نے بنی اسرائیل کو بہکا دیا اور برباد کردیا۔ یہ عورتیں فتنہ ہیں بہت بڑا۔

«مَا تَرَكْتُ بَعْدِي فِتْنَةً أَضَرَّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ» [3]

میرے بعد بہت سے فتنے آئیں گے مگر مردوں کے لیے سب سے خطرناک فتنہ عورتوں کا ہے۔

یہ فتنے قائم ہیں مگر ہم اپنی اصلاح کریں۔ اور یہ اختلاط جو ایک زہر قاتل ہے اس سے بچیں اور اپنے گھروں میں عفت اور پاکدامنی کو داخل کریں تاکہ ہم معاشرے میں

[1] ضعيف الجامع الصغير للألباني: 390/1. [2] صحيح مسلم، حديث: 2742.
[3] صحيح البخاري، حديث: 5096.

ایک اکائی کے طور پر اس سیلِ رواں میں شامل نہ ہوں۔ اپنا گھرانہ بچ جائے۔ اپنے بھائی کا گھرانہ بچ جائے۔ اس طرح گھرانوں کی اصلاح کے ساتھ اصلاح عام ہوسکتی ہے۔

شریعت کس طرح چاہتی ہے کہ ایک خاتون کیسی ہو؟ کس طرح اس کی حفاظت کرنا چاہتی ہے؟ دیکھیں قرآن کہتا ہے:

﴿وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ﴾ [1]

ایک خاتون جب پردے کے ساتھ باہر جائے، اپنے پاؤں بڑے آہستہ آہستہ رکھے۔ پاؤں کو پٹخ کر نہ رکھے۔ کیا وہ شریعت عورت کے چہرے کو کھولے گی جو اس کے پاؤں کی آہٹ کو چھپا رہی ہے؟ کیسے وہ باغی لوگ ہیں جو چہرے کو کھولنے کا حکم دیتے ہیں۔ اور اس پر مستزاد جو آج فحاشی و عریانی ہے، یہ شریعت سے کتنی بڑی بغاوت ہے۔ بعض اوقات ایک خاتون اپنے لباس کے اندر پازیب کا استعمال کرتی ہے، یعنی پاؤں کا زیور۔ اور زوردار آہٹ سے اس پازیب میں جھنکار پیدا ہوسکتی ہے۔ وہ زیور عورت کی زینت ہے مگر اس کی آواز باہر فتنہ ہوگی، اس لیے عورت قدم آہستہ آہستہ رکھے، خصوصاً جو عورت پازیب پہنے ہوئے ہو تاکہ زیور کی جھنکار مردوں کے کانوں میں نہ پڑے۔ یہ ہے شریعت۔ کس طرح ایک خاتون کو محترم قرار دے رہی ہے۔ ﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ﴾ [2] ''اپنے گھروں میں ٹکی رہو۔'' تو اپنے گھر کی ملکہ ہے۔ اس گھر کی چار دیواری میں تیری حکومت ہے۔ یہ بچے تیری تربیت کی جولان گاہ ہیں، ان کو سنبھال۔ ایک ایک بچے کی تربیت قیامت کے روز تیرے مرتبے کو کہاں تک لے جائے گی! کیا اس تربیت کے آثار اور نتائج ہیں! ﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ﴾ اپنے گھروں میں ٹکی رہو۔

[1] النور 31:24. [2] الأحزاب 33:33.

ام المومنین سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے سوال کیا: آپ حج اور عمرہ کیوں نہیں کرتیں؟ فرمایا کہ حج میں کر چکی ہوں، عمرہ بھی کر چکی ہوں۔ اب میرے پروردگار نے مجھے کہا ہے: ﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ﴾ اپنے گھر میں ٹکی رہو۔ یہ میرے پروردگار کا حکم ہے۔ میں گھر سے باہر نہ نکلوں۔ گھر سے باہر نہیں نکلیں۔ کبھی نہیں نکلیں۔ جنازہ ان کا نکلا تھا خود نہیں نکلیں۔ [1] یہ صحابیات کا کردار ہے۔

حفصہ بنت سیرین کا دن کہاں گزرتا؟ ان کی تیس سال کی گواہی موجود ہے کہ اپنے گھر کے مصلّٰی میں، اپنے گھر میں انھوں نے ایک جگہ گھیر کے بنائی تھی جہاں پر وہ نماز پڑھتیں، نفل پڑھتیں، اذکار کرتیں اور وہیں بیٹھ کر کتابیں پڑھتیں۔ اور اس مصلّٰی سے باہر کب نکلتیں، گھر سے باہر نہیں مصلّٰی سے باہر جو گھر کے کسی آخری کونے میں بنا رکھا تھا قضائے حاجت کے لیے یا پھر رات کو سونے کے لیے۔ یہ حفصہ بنت سیرین ہیں۔ انس بن عیاض ایک محدث ہیں۔ صحیح بخاری کے راوی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے نزدیک حفصہ بنت سیرین کا علم ان کے بھائی سے زیادہ تھا۔ ان کے بھائی محمد بن سیرین چوٹی کے محدث اور علمائے تابعین میں سے ہیں۔ فرماتے ہیں: ''میرے نزدیک حفصہ کا علم ان کے والد سے زیادہ تھا۔'' یہ ہے مسلم خواتین کا کردار۔

ابن العربی فرماتے ہیں کہ میں نے نابلس میں کچھ وقت گزارا۔ نابلس (فلسطین) عرب کا ایک شہر ہے۔ اس شہر کی ایک تاریخ یہ بھی ہے کہ یہاں ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حصولِ علم کے لیے ہزاروں بستیوں کا دورہ کیا ہے۔ نابلس میں کچھ وقت اور کچھ سال گزارے ہیں۔ نابلس میں اپنے قیام کے دوران

[1] تفسیر القرطبی: 180/14.

میں کوئی خاتون دن کے وقت میں نے گھر سے باہر نہیں دیکھی۔ دن کے وقت، سوائے جمعہ کے دن کے۔ جمعہ کے دن نابلس کی سڑکیں باپردہ عورتوں سے بھری ہوتیں جو مسجد میں آکر جمعہ ادا کرتیں۔ جمعہ ادا کرکے اپنے گھروں کو لوٹ جاتیں، پورا ہفتہ گھروں میں چھپی رہتیں۔ گھر سے باہر نہیں نکلتی تھیں۔ ﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ﴾ یہ تاریخ اپنے گھروں میں بیان کریں۔

سیدہ عائشہ ؓ، کیا ان کا پردہ تھا! میں سمجھتا ہوں کہ پردے کی جس قدر مثالیں دی جائیں اس مثال پر ختم ہیں۔ نبی ؑ فوت ہوئے۔ آپ کو حجرۂ عائشہ میں دفن کیا گیا۔ یہ بڑی سعادت ہے۔ ایک خواب دیکھا تھا کہ «ثَلاثَةُ أَقْمَارٍ سَقَطْنَ فِي حُجْرَتِي» تین چاند میرے کمرے میں ٹوٹ کر گرے۔ پریشان ہیں کہ یہ تین چاند کیا ہیں؟ اس کی تعبیر کیا ہے؟ اپنے باپ ابوبکر صدیق ؓ سے اس کی تعبیر پوچھی۔ وہ خاموش ہوگئے۔ جس دن پیغمبر ؑ کا انتقال ہوا اور حجرہ عائشہ میں ان کی تدفین ہوئی تو ابوبکر صدیق ؓ عائشہ ؓ کے پاس آئے اور فرمایا: عائشہ! یہ پہلا چاند گرا ہے۔ یہ سب سے بہترین چاند ہے۔ تدفین ہوگئی۔ پھر دوسرا چاند گرا، ان کے والد ابوبکر صدیق ؓ اسی کمرے میں دفن ہوئے۔ عائشہ ؓ اس وقت اس کمرے میں آتی تھیں پردے کے بغیر۔ پھر تیسرا چاند گرا امیر عمر بن خطاب ؓ۔ [1] عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ اس کے بعد میں جب اس کمرے میں آئی پردہ کرکے آئی۔ کیوں؟ یعنی پردے کی جتنی مثالیں ہیں اس مثال کے سامنے ہیچ ہیں۔ امیر عمر اجنبی ہیں لیکن فوت ہوچکے ہیں۔ منوں مٹی کے نیچے، اس دنیا سے ان کا تعلق ٹوٹ چکا۔ مگر کیا غیرت اور کیا پردہ! کہ

[1] مجمع الزوائد: 382/7.

اس کمرے میں آتیں، حالانکہ وہ میت ہیں، زمین میں مدفون ہیں، کوئی ان کو علم نہیں اس زمین کی پشت پر کیا ہورہا ہے؟ کون آرہا ہے اور کون جارہا ہے؟ کوئی علم نہیں۔ مگر کیا ان کا پردہ ہے! اور کیا شرعی غیرت ہے کہ اس کے بعد جب بھی اس کمرے میں آئیں اپنے پورے حجاب کے ساتھ آئیں۔ حجاب کرو نہ کرو، اگر وہ عالم الغیب ہے اور باہر کی چیزوں کو دیکھ رہا ہے تو پردے کے اندر بھی وہ دیکھ سکتا ہے۔ یہ عقیدہ اس سے نہیں بنا۔ اس مسئلے میں، اس واقعے میں عائشہ صدیقہ ؓ کی غیرت کا اور حجاب سے محبت کا ایک عجیب نمونہ ہے۔ حالانکہ سیدنا عمر ؓ فوت ہوچکے ہیں اور منوں مٹی کے نیچے ہیں۔ فرمایا کہ جب بھی آئی ہوں پردے کے ساتھ آئی ہوں۔

ایک لونڈی آئی اور ہنس کر ان کو ایک خبر دیتی ہے کہ ام المومنین! آج میں نے بیت اللہ کا طواف کیا ہے اور سات چکروں کے دوران میں تین چار دفعہ حجر اسود کو بوسہ دینے میں کامیاب ہوگئی ہوں۔ فرمایا کہ «لَا أَجَرَكِ اللّٰهُ، لَا أَجَرَكِ اللّٰهُ» تجھے اللہ تعالیٰ اس بوسے کا اجر نہ دے۔ «تُدَافِعِينَ الرِّجَالَ» تم نے کتنے مردوں سے مزاحمت کی ہوگی۔ کتنے دھکے دیے ہوں گے اور کتنے دھکے کھائے ہوں گے تب تو نے بوسہ دیا ہوگا۔ تیری یہ نیکی کسی پذیرائی اور کسی اجر کے قابل نہیں ہے۔ «لَا أَجَرَكِ اللّٰهُ» تجھے اللہ اس نیکی کا اجر نہ دے۔ فرمایا کہ تیرے لیے یہ کافی تھا کہ تو گزرتے ہوئے استلام کرکے گزرتی۔ تکبیر کہہ کر گزرتی۔ یہ بھی اللہ کے پیغمبر کا فرمان ہے۔ تیرے لیے یہ کافی تھا۔ [1]

یہ شرعی غیرت کا کیسا اہتمام ہے!! ہم یہ واقعات، پاکیزہ واقعات اپنے گھروں میں سنائیں تاکہ ہمارے گھر عفت و پاکدامنی کا مرکز بن جائیں اور یہ اصلاح ممکن ہے۔

[1] السنن الکبریٰ للبیہقی: 81/5.

«عَلَيْكَ بِخَاصَّةِ نَفْسِكَ»[1] فتنوں کے دور میں تو خاص اپنے نفس کو سنبھال لے۔ جو تیرے عزیز ہیں، اہل خانہ ہیں، انھیں سنبھال لے، ان کی اصلاح کر، ان کے دل و دماغ کے اندر یہ علم نافع اور تربیت کے نقوش داخل کر۔ رہا یہ فحاشی کا سیل رواں تو اس کی وعید آپ نے سن لی ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ﴾ جو لوگ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے معاشرے میں فحاشی پھیلے، اہل ایمان کے معاشرے میں وہ اس فحاشی کو پھیلانا چاہتے ہیں، اس کردار پر پوری طرح آمادہ ہیں اور اس فحاشی کو پھیلانے کے طرق، اسباب اور ذرائع اختیار کر رہے ہیں، ﴿لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ ان کے لیے دنیا میں اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔ اور آگے کیا فرمایا؟ دنیا میں دردناک عذاب اللہ کی حدود کی شکل میں بھی ہوسکتا ہے۔ زنا کی حد رجم میں، سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی۔ چوری کی حد میں ہاتھ کاٹنا اور شراب نوشی کی حد کوڑے۔ دنیا میں یہ ہیبت ناک سزا ہے اور قیامت کا دردناک عذاب ہے۔ یہ تمھارا مقدر بن جائے گا۔ ﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ ''اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''[2] اس کے دو معنی ہیں: ایک معنی یہ کہ فحاشی جس کی تم تشہیر کر رہے ہو، جس کو تم عام کر رہے ہو اس فحاشی میں کیا مفاسد ہیں؟ کس قدر اللہ کی غیرت کو للکارا جا رہا ہے؟ کس قدر خالق کائنات کی ناراضی ہے؟ ان تمام باتوں کو اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔ اللہ اکبر۔ یہ بہت بڑی وعید ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس عذاب الیم کی نشاندہی کی ہے، وہ کتنا دردناک عذاب ہوگا؟ اس کی دردناکی کو اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔ تمھیں معلوم نہیں

[1] جامع الترمذي، حديث: 3058. [2] النور 24:19.

ہے۔ تم باز آ جاؤ۔ اس معصیت کی حقیقت کا ادراک بھی اللہ کو ہے تمھیں نہیں ہے۔ اس کے مفاسد اور اس کے نتیجے میں جو عذاب ہے اس عذاب کی کلفت کا، اس کی شدت کا، اس کی خشونت اور غلظت کا تمھیں احساس و ادراک نہیں ہے، اللہ کو ہے تم باز آ جاؤ۔ یہ سمجھایا جا رہا ہے۔ یہ نصیحت کی جا رہی ہے۔ تو پھر ہمیں اس نصیحت کو قبول کرنا ہے۔ ان باتوں کو عام کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ اصلاح کرنے والا ہے۔ لیکن کم از کم اپنے ماحول کی اصلاح کریں۔ اپنے گھرانے کی اصلاح کریں۔ اپنے تعلق داروں کی اصلاح کریں۔ ان کو اللہ کا خوف دلایا جائے کہ یہ فتنے ہیں اور یہ یہ ان کی تباہ کاریاں ہیں اور اس کے مقابلے میں دینی حمیت کے یہ تقاضے ہیں۔ شوہر بھلا کیسے برداشت کرسکتا ہے کہ اس کی بیوی بے پردہ ہو۔ یہی تو دیاثت ہے۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی حدیث ہے: تین بندوں کی طرف اللہ تعالیٰ قیامت کے دن دیکھے گا ہی نہیں۔ ان میں ایک دیوث ہے۔[1] انھیں بتایا جائے کہ دیاثت کیا ہے؟ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ رب العزت قیامت کے روز تمھیں دیکھے ہی نہ۔ دیاثت، یہ کتنا خطرناک جرم ہے اور پھر غیرت، غیرت کے تقاضے کیا ہیں؟ ابو عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں قاضی ابوموسیٰ کی عدالت میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک کیس سامنے آیا۔ کیس یہ تھا کہ ایک شخص کی بیوی کے اولیاء، مثلاً: باپ نے دعویٰ دائر کیا کہ اس شخص نے نکاح کے وقت پانچ سو درہم یا پانچ سو دینار حق مہر کا تعین کیا تھا۔ وہ حق مہر اسے ادا کرنا ہے مگر وہ ادا نہیں کر رہا۔ اب قاضی نے اگلی پیشی میں گواہوں کو اور اس عورت کو طلب کرلیا تاکہ قضیے کی تہ تک پہنچا جائے۔ کیونکہ شوہر انکار کر رہا ہے اور بیوی کے اولیاء دعویٰ پیش کر رہے ہیں کہ اس نے یہ حق مہر متعین کیا تھا۔ اگلی پیشی میں سب موجود ہیں۔ گواہ آ گئے۔ نکاح میں گواہ اسی لیے ہوتے

[1] السلسلة الصحيحة: 173/2.

نکاح کی اہمیت وضرورت

ہیں۔ دو گواہ شرط ہیں، ان کے بغیر نکاح نہیں ہوتا تا کہ ایسے اختلاف میں وہ گواہی دے سکیں۔ ہاں بھئی تم موجود تھے؟ ہاں موجود تھا۔ اس عورت کو جانتے ہو؟ ہاں جانتا ہوں۔ عورت تمھیں دکھائی جائے گی، گواہی کے تقاضے تبھی پورے ہوں گے۔ جب گواہ پہچان لے کہ واقعی یہ عورت تھی۔ ہوسکتا ہے پردے میں کوئی اور عورت بیٹھی ہو۔ اب قاضی نے اس خاتون کو حکم دیا کہ اپنا چہرہ کھولو تا کہ گواہ تمھیں دیکھ لے۔ شوہر موجود ہے، شوہر کھڑا ہوگیا۔ کہا: قاضی صاحب! میری بیوی کا چہرہ نہ کھولا جائے میں پانچ سو دینار کا اقرار کرتا ہوں۔ میں وہ ادا کروں گا۔ یہ ہے غیرتِ مردانہ اپنے اہل خانہ کے تعلق سے۔ وہ پانچ سو دینار میں دے دیتا ہوں میری بیوی کے چہرے کو ننگا نہ کیا جائے۔ یہ ہے غیرت۔ کہاں گئی یہ غیرت؟ اور پھر یہ دیاثت، اللہ تعالیٰ دیکھے گا ہی نہیں قیامت کے دن۔ کوئی شخص یہ چاہے گا؟ تو پھر ہم کم ازکم اس طوفان بدتمیزی کا حصہ تو نہ بنیں۔ اپنی اصلاح کریں، اپنے اہل خانہ کی اصلاح کریں۔ اور پھر یہ جو ایک عام وبا ہے اس فحاشی کی صورت میں اور مختلف گناہوں کی صورت میں، اس کے تعلق سے جو دعوت ہم عام کرسکتے ہیں وہ عام کریں۔ افہام وتفہیم سے بہت کچھ اصلاح ممکن ہے۔ اللہ پاک توفیق عطا کردے۔ اللہ رب العزت ہمارے گھروں کو عفت و عفاف کا آئینہ دار بنادے! اللہ ہمارے گھروں کی اصلاح فرمادے! اللہ تعالیٰ شیطان کی شرارتوں سے ہمارے گھرانے محفوظ رکھے! اللہ تعالیٰ تقویٰ پر، ورع پر اور تعلق باللہ پر ہمارے گھروں کی بنیادوں کو قائم رکھے! تا کہ ہم اس دیاثت کا حصہ نہ بنیں اور اس بے غیرتی سے جو ایک عمومی شکل اختیار کرچکی ہے، اللہ ہمیں عافیت عطا فرمادے!

وَأَقُوْلُ قَوْلِي هٰذَا وَأَسْتَغْفِرُاللّٰهَ لِي وَلَكُمْ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

نکاح کی اہمیت وضرورت

خطبہ مسنونہ:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا﴾ [1]

وَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «الدُّنْيَا مَتَاعٌ وَّ خَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ» [2]

آج کا موضوع آپ نے سن لیا ہے۔ نکاح کی اہمیت اور ترغیب کے حوالے سے جو کچھ میں نے عرض کرنا تھا وہ مولانا داود صاحب نے بیان کر دیا، بحمد اللہ۔

نکاح عربی کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں ''ضم ہونا'' یعنی جڑ جانا یا جوڑ دینا۔ چونکہ نکاح کے عمل سے ایک مرد اور ایک عورت جوڑ دیے جاتے ہیں اور ایک لڑی میں پرو دیے جاتے ہیں، اس لیے اس کو نکاح کہا جاتا ہے۔ اس کا ہم معنی لفظ زواج ہے۔ زواج کا مادہ زوج ہے جس کے معنی ہیں جوڑی۔ چونکہ نکاح کے عمل سے ایک جوڑی بن جاتی ہے اور ایک لڑکا اور لڑکی آپس میں مل جاتے ہیں، یعنی اس ملاپ سے ایک

[1] الأحزاب 33:21. [2] صحيح مسلم، حديث: 1467.

جوڑی عمل میں آتی ہے، اس لیے اسے زواج کیا جاتا ہے۔ شریعت میں نکاح ایک عقد ہے۔ ایک ایگریمنٹ ہے جس کی صحت کے لیے کچھ شرائط ہیں اور اس کے انعقاد کے لیے کچھ رکاوٹوں کا دور ہونا ضروری ہے۔ کچھ شرائط ہیں جن پر نکاح منعقد ہوتا ہے اور کچھ رکاوٹیں ہیں جن کی موجودگی میں نکاح ناجائز ہوتا ہے۔ شرائط کیا ہیں؟ دو صیغے: ایک ایجاب اور دوسرا قبول۔ ایجاب میں اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ ہم نے فلاں خاتون کو جو فلاں کی بیٹی ہے آپ کے نکاح میں دیا، کیا آپ کو قبول ہے؟ یہ ایجاب ہے۔ اور لڑکے کا اور لڑکی کا قبول کرنا۔ لڑکی سے بھی پوچھا جائے گا کہ فلاں لڑکا آپ کے نکاح میں آ رہا ہے یا اس سے آپ کا نکاح کیا جا رہا ہے، آپ کو قبول ہے؟ لڑکا اور لڑکی دونوں ایک دوسرے کو قبول کریں۔ یہ ایجاب وقبول زوجین اور طرفین کی رضا کی دلیل ہے۔ اس رضا کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ صحت نکاح کے لیے ایجاب وقبول شرط ہے۔ ایجاب وقبول کوئی بھی کرا سکتا ہے۔ ضروری نہیں اس کے لیے کسی محدث کو تکلیف دی جائے کہ آپ آ کر ایجاب وقبول کرائیں۔ اور پھر اکثر وقت ضائع ہوتا ہے۔ ایک صیغہ ہے کہ آپ کو قبول ہے؟ وہ قبول کر لے، یہ صیغہ کوئی بھی ادا کر سکتا ہے۔ یہ صحت نکاح کے لیے شرط ہے۔ دوسری شرط لڑکی کی طرف سے ولی کا ہونا۔ اس کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کا فرمان ہے: «لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ» [1] ''ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔'' اور ایک حدیث میں ارشادِ گرامی ہے: «أَيُّمَا امْرَأَةٍ نَكَحَتْ نَفْسَهَا بِغَيْرِ إِذْنِ وَلِيِّهَا فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ، بَاطِلٌ، بَاطِلٌ» تین بار فرمایا۔ ''جو عورت اپنے ولی کے اذن کے بغیر نکاح کرتی ہے اس کا نکاح باطل ہے۔ اس کا نکاح

[1] سنن أبي داود، حديث: 2085، و جامع الترمذي، حديث: 1101.

باطل ہے۔ اس کا نکاح باطل ہے۔'' ہاں نکاح کے تعین میں عورت کا ولی سے اختلاف ہوسکتا ہے۔ ولی کہیں نکاح کرنا چاہ رہا ہے اور عورت کو وہ ناپسند ہے اور ولی بضد ہے تو اس کا حل بھی شریعت نے پیش کردیا۔ «فَإِنِ اشْتَجَرُوا فَالسُّلْطَانُ وَلِيُّ مَنْ لَّا وَلِيَّ لَهُ» [1] اگر دونوں میں اختلاف ہے۔ ولی کہیں نکاح کرنا چاہ رہا ہے، عورت راضی نہیں یا عورت کہیں نکاح کرنا چاہتی ہے، ولی راضی نہیں۔ یہ اختلاف ہوگیا۔ تو اس اختلاف میں پھر سلطان وقت یا قاضی وقت یا وقت کا حاکم دخیل ہوگا۔ وہ دونوں کو طلب کرے گا اور دونوں کا موقف سنے گا۔ اگر لڑکی کا موقف درست ہے، جہاں وہ نکاح کرنا چاہ رہی ہے اور ولی نہیں مان رہا تو پھر سلطانِ وقت ولی بن کر اس کا نکاح کردے گا۔ لیکن ولی کے بغیر نکاح ہوتا نہیں ہے۔ یہ فقہ حنفی کا وہ انحراف ہے جو ان احادیث سے کھلم کھلا بغاوت ہے۔ حدیثیں بالکل صریح ہیں۔ کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ کیا پیچیدگی ہے؟ اور آپ کہیں: ہو جاتا ہے تو یہ بغاوت ہے۔ شریعت سے انحراف ہے۔ کچھ فقہاء نے کہا کہ قیاس کہتا ہے کہ عورت اپنا نکاح کرسکتی ہے۔ جب وہ عاقل ہے، بالغہ ہے، جب وہ سارے سودے کرسکتی ہے، خرید سکتی ہے، فروخت کرسکتی ہے، بڑے بڑے ایگریمنٹ کرسکتی ہے تو یہ کیوں نہیں کرسکتی؟ دنیا کے سارے سودوں پر نکاح کو بھی قیاس کرلو۔ تو عرض یہ ہے کہ قیاس وہاں درست ہے جہاں مقابلے میں نص نہ ہو۔ یہاں مقابلے میں نص موجود ہے۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کا فرمان ہے: «لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ» لہٰذا ایسا قیاس باطل ہے۔ اور انھی فتووں نے ایک بگاڑ پیدا کررکھا ہے، لڑکیاں گھر سے بھاگتی ہیں۔ لڑکے بھگا کر لے جاتے ہیں۔ عدالتوں

[1] سنن أبي داود، حديث:2083، و جامع الترمذي، حديث: 1102.

میں جا کر نکاح ہوجاتا ہے۔ ایک فساد کبیر ہے۔ اور یہ بات سن لیجیے! جب شریعت سے محاذ آرائی ہوگی تو اس کا نتیجہ بگاڑ ہے، فساد ہے، قتل و غارت گری ہے۔ اور کبھی وہ خیر پر ختم نہیں ہوگا۔ امیر عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جو عورت ولی کے بغیر نکاح کرتی ہے، اور یہ فتویٰ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بھی ہے، وہ زانیہ ہے۔ جو عورت ولی کے بغیر نکاح کرتی ہے وہ زانیہ ہے۔ کتنا بڑا حکم ہے! تو یہ ان فتووں کا نتیجہ ہے۔ ورنہ شریعت مطہرہ، پاکیزہ بالکل صاف اعلان کررہی ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ تو یہ بھی صحت نکاح کے لیے شرط ہے۔

تیسری شرط کم از کم دو گواہوں کا ہونا۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی حدیث ہے: «لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ وَّشَاهِدَيْ عَدْلٍ» [1] ولی کے بغیر اور دو عادل گواہوں کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ یعنی کم از کم دو گواہ ہوں اور وہ عادل ہوں۔ جو گواہی کے تقاضوں کو پورا کرنے والے ہوں۔ آگے چل کر اگر کوئی نزاع کھڑا ہوتا ہے، کوئی اختلاف رونما ہوتا ہے تو وہ گواہی دے سکیں اور ان کی گواہی معتبر ہو۔ ان کی گواہی قابل قبول ہو۔ یہ نکاح کے گواہ ہیں۔

چوتھی شرط، لڑکے کی طرف سے حق مہر کا تعین۔ اس پر ہم آگے بات کریں گے۔

کچھ موانع ہیں، کچھ رکاوٹیں ہیں۔ اگر وہ موجود ہوں تو نکاح درست نہیں ہے۔ جیسے ایسی لڑکی سے نکاح کرنا جو آپ کی محرم ہے۔ اس سے نکاح درست نہیں ہے۔ محرمیت نکاح کے لیے رکاوٹ ہے۔ اور محرمیت تین طریقوں سے ثابت ہوتی ہے: ① نسب سے۔ آپ کی نسبی سگی بہن، آپ کی والدہ یہ نسبی محرمیت ہے۔ ② محرمیت ثابت ہوتی ہے مصاہرت سے۔ آپ کسی کے داماد بن گئے، اب آپ کی بیوی کی بہن

[1] المصنف لعبد الرزاق، حديث:1043، و صحيح الجامع، حديث:7558.

آپ کے لیے حرام ہے۔ بیوی کی خالہ آپ کے لیے حرام ہے۔ بیوی کی پھوپھی آپ کے لیے حرام ہے۔ بیوی کی ماں آپ کے لیے حرام ہے۔ اس سے پہلے حلال تھی مگر اس مصاہرت سے یہ رشتے حرام ہوگئے۔ ③ حرمت ثابت ہوتی ہے رضاعت سے۔ کسی خاتون نے کسی بچے کو دودھ پلا دیا۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی حدیث ہے کہ «يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ»[1] کہ نسب سے جو حرمتیں ثابت ہوتی ہیں وہی رضاعت سے بھی ثابت ہوجاتی ہیں۔ تو یہ محرمیت رکاوٹ ہے نکاح سے۔

کچھ رکاوٹیں وقتی ہوتی ہیں۔ ان کا تعلق وقت سے ہوتا ہے۔ جیسے ایک عورت حج کرنے گئی، عمرہ کرنے گئی اور وہ احرام باندھے ہوئے ہے، اس کو آپ نکاح کا پیغام دیں یا اس سے آپ شادی کرنا چاہیں، یہ جائز نہیں۔ جب تک وہ حالت احرام میں ہے اس وقت تک نہ اس سے منگنی جائز ہے، نہ نکاح کا پیغام جائز ہے، نہ شادی کرنا جائز ہے۔ کچھ لوگ دلیل پیش کرتے ہیں کہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے میمونہ رضی اللہ عنہا سے بحالت احرام نکاح کیا تھا۔ یہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے میمونہ رضی اللہ عنہا سے بحالت احرام نکاح کیا تھا۔ وہ روایت صحیح ہے۔[2] مگر اس کے مقابلے میں خود میمونہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے مجھ سے نکاح کیا اور ہم دونوں احرام سے حلال ہو چکے تھے۔[3] احرام سے نکل چکے تھے اور حلال ہو چکے تھے۔ دونوں روایتیں سنداً صحیح ہیں۔ اور یہاں ترجیح کا قانون لاگو ہوگا کہ جب دو روایتیں ہوں، دونوں متعارض ہوں اور دونوں کی اسنادی قوت برابر ہو، اگر ترجیح کا کوئی امکان بن جائے تو ترجیح کا راستہ اختیار کیا جاسکتا ہے جو یہاں موجود ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ یہ نکاح بحالت احرام

[1] صحیح البخاري، حدیث: 2645، و صحیح مسلم، حدیث: 1447. [2] صحیح البخاري، حدیث: 1837، و صحیح مسلم، حدیث: 1410. [3] صحیح مسلم، حدیث: 1411.

ہوا، میمونہ رضی اللہ عنہا کا کہنا ہے کہ بحالت حلال ہوا۔ اب یہاں ترجیح کا ایک قرینہ یہ موجود ہے کہ صاحب قصہ خود میمونہ رضی اللہ عنہا ہیں جن سے نکاح ہوا اور واقعہ میں جو صاحب قصہ ہے اس کا قول زیادہ معتبر ہے جس کے ساتھ واقعہ پیش آیا جو اس واقعے کا حصہ ہے۔ اس کی شہادت زیادہ معتبر ہوگی۔ اور پھر میمونہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث اور ان کی یہ خبر نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی عام احادیث کے مطابق ہے جس میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ «لَا يَنْكِحُ الْمُحْرِمُ وَلَا يُنْكِحُ»[1] محرم نہ اپنا نکاح کرسکتا ہے، اور نہ وہ نکاح کرا سکتا ہے۔ ان احادیث کے مطابق سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کو ترجیح حاصل ہو جاتی ہے۔ تو کچھ رکاوٹیں ہیں جن کا تعلق زمانے سے ہوتا ہے۔ جیسے ایک عورت کا شوہر فوت ہوجائے۔ اس کی عدت چار ماہ دس دن ہے۔ اس عدت کے دوران میں اس سے شادی کرنا ناجائز ہے حتیٰ کہ شادی کا پیغام بھی نہیں دے سکتا۔ منگنی اور نکاح دونوں ناجائز ہیں۔ تو یہ بھی ایک وقتی رکاوٹ ہے۔ تو ایسی رکاوٹیں نہ ہوں تو پھر یہ عقدِ نکاح درست اور صحیح ہے۔

شریعت نے نکاح کی خوب ترغیب دی ہے۔ حدیث آپ نے سن لی، پیغمبر علیہ السلام کا فرمان ہے: «يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ! مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ»[2] اے نوجوانو کی جماعت! تم میں سے جو نکاح کی طاقت رکھتا ہو، یہ طاقت مالی بھی ہے اور بدنی بھی ہے، وہ نکاح کرلے۔ اس کے دو فائدے ہیں: ① نگاہیں نیچے ہوتی ہیں ② شرم گاہ محفوظ ہوتی ہے۔ یعنی شریعت نے محض ایک حق مہر پر اور ایجاب و قبول پر ایک عورت آپ کے لیے حلال کردی تاکہ یہ دو فائدے حاصل ہوجائیں۔ نگاہوں کا نیچا ہونا اور شرمگاہ کا محفوظ ہونا۔ اگر شریعت کے اس فائدے، اس تحفے

[1] صحیح مسلم، حدیث: 1409. [2] صحیح البخاري، حدیث: 5065، و صحیح مسلم، حدیث: 1400.

اور انعام کے باوجود کسی کی نگاہ نیچی نہیں ہوتی اور کسی کی شرمگاہ محفوظ نہیں ہوتی، وہ انتہائی مجرم ہے، شریعت کا باغی ہے۔ اس پر شریعت بہت ہی غضب ناک ہے۔ شریعت چاہتی ہے کہ اس کو بھیانک سزادی جائے۔ اسے زمین میں گاڑ دیا جائے اور جسم پر اس وقت تک پتھر مارے جائیں جب تک اس کی موت نہ ہوجائے۔ اور پتھر بھی اس طرح مارو کہ تمھارے دل میں کوئی رحم کا جذبہ نہ ہو۔ شدید غصہ ہو۔ زوردار طریقے سے اسے مارو۔ اس وقت تک مارتے رہو جب تک اس کی موت واقع نہ ہوجائے۔ اس سے آپ اندازہ کرلیں کہ یہ عمل کتنا بھیانک ہے۔ صحیح بخاری میں سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کی روایت سے نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی حدیث ہے: ایک طویل خواب دیکھا۔ اس خواب میں ایک منظر یہ بھی دیکھا کہ ایک برتن تھا دیگ کی مانند جس کا پیٹ بڑا تھا اور منہ بالکل تنگ تھا۔ اس برتن میں مرد اور عورتیں اکٹھے ہیں اور ان کو عذاب دیا جارہا ہے۔ آگ کے شعلے اس برتن کے اندر ان کو جلا رہے ہیں۔ ان کو عذاب اور تکلیف دے رہے ہیں اور ان کی چیخیں گونج رہی ہیں۔ خاص طور پر اس عذاب کا نشانہ ان کی شرمگاہیں بنی ہوئی ہیں اور ان کی چیخیں بلند ہو رہی ہیں۔ اللہ کے پیارے پیغمبر ﷺ وہاں رک گئے اور جبریل امین علیہ السلام سے پوچھا: «مَنْ هٰؤُلَاءِ» یہ کون لوگ ہیں؟ جبریل امین نے فرمایا: «فَهُمُ الزُّنَاةُ وَالزَّوَانِي» [1] یہ اس امت کے زانی مرد اور زانی عورتیں ہیں۔ یہ لوگ جو بھی ہیں ان کا یہ عذاب قیامت تک قائم رہے گا۔ قیامت صدیوں بعد قائم ہوگی، صدیوں انھیں یہ عذاب جھیلنا پڑے گا۔ یہ شدید ترین عذاب ہے۔ انتہائی بھیانک یہ عمل ہے۔ شریعت نے آپ کو ایک تحفہ دیا ہے، اس تحفے کا حصول کوئی مشکل نہیں ہے۔

[1] صحیح البخاري، حدیث: 7047.

ایجاب وقبول اور حق مہر جتنی آپ کی طاقت ہے۔ جب ایک متبادل موجود ہے، اس کے بعد پھر اس مجرمانہ عمل کا ارتکاب کرے تو کتنی بڑی یہ وحشت ہے۔ اور کتنا یہ بھیانک عمل ہے۔ اس پر دنیا کی سزا کیا ہے؟ رجم۔ اور مرنے کے بعد کیا سزا ہے اگر اللہ نے توبہ قبول نہ کی تو مرنے کے بعد قبر میں اس کو وہ برتن والا عذاب ملتا رہے گا۔ اس کا پیٹ وسیع ہے کیونکہ ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہوگی۔ اور اس کا منہ تنگ ہے تاکہ اس برتن سے نکل نہ سکیں۔ اس میں گھرے رہیں، موجود رہیں، پھنسے رہیں۔ اور اس سے کبھی نکل نہ سکیں۔ اور پھر آخرت کا عذاب انتہائی بھیانک، شدید اور کربناک ہوگا۔ تو شریعت کی یہ ترغیب ہے، نکاح کرو۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کا فرمان ہے: «اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِي» [1] نکاح میری سنت ہے۔ میرے طریقے میں نکاح شامل ہے۔ «حُبِّبَ إِلَيَّ مِنَ الدُّنْيَا النِّسَاءُ وَالطِّيبُ» [2] دنیا کی دو ہی چیزیں مجھے محبوب ہیں: ایک عورتیں اور دوسری خوشبو۔ مجھے خوشبو سے محبت ہے اور مجھے بیوی سے محبت ہے۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کا فرمان: «خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي» [3] تم سب میں سے بہترین وہ ہے جو اپنی بیوی کے لیے بہترین ہے۔ جس شخص کی نیکی، بہتری اور تقویٰ کی گواہی اس کی بیوی دیتی ہے وہ بہترین ہے۔ باقی لوگ اگر گواہی دیتے ہیں تو وہ پارسائی کے روپ میں آپ کو باہر دیکھ رہے ہیں۔ باہر پارسا بننا آپ کی مجبوری ہے۔ اصل پارسا کون ہے؟ جو گھر میں بھی پارسا ہو۔ بیوی گواہی دے کہ واقعی گھر میں متقی اور پرہیزگار ہے۔ جس طرح ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے پوچھا: «كَيْفَ كَانَ خُلُقُ رَسُولِ اللّٰهِ» اللہ کے پیغمبر کے اخلاق کیسے ہیں؟ یعنی سائل نے اللہ کے پیغمبر

[1] سنن ابن ماجه، حدیث: 1846. [2] سنن النسائي، حدیث: 3391. [3] جامع الترمذي، حدیث: 3895.

کی بیوی کا انتخاب کیا اس سوال کے لیے تا کہ گھر کی گواہی ملے۔ کیا جواب ملا؟ «فَإِنَّ خُلُقَ نَبِيِّ اللّٰهِ ﷺ كَانَ الْقُرْآنَ»[1] اللہ کے پیغمبر کا اخلاق پورا قرآن ہے۔ پورا قرآن آپ کا اخلاق ہے، یعنی قرآن کتابی شکل میں ہے۔ اگر قرآن انسانی شکل میں ہوتا تو محمد ہوتا۔ ﷺ۔ یہ گھر کی گواہی ہے۔ فرمایا «وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي» میں اپنی بیویوں کے لیے سب سے بہترین ہوں۔ یہ گواہی سب سے معتبر۔ تو یہ شریعت کی ترغیب ہے۔ نکاح میری سنت ہے۔ اللہ کے پیغمبر کی سنت سے محبت کرنے والو! نکاح میں جلدی کرو۔ یہ شریعت کی خواہش بھی ہے اور ترغیب بھی۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی حدیث ہے: «فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي»[2] جو میری سنت سے اعراض کرے گا، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ اور آپ نے یہ بات کب کہی تھی؟ جب ایک شخص نے اپنے زعم میں انتہائی تقویٰ، اپنے فہم میں تقویٰ پر قائم ہوکر یہ کہا تھا: «أَعْتَزِلُ النِّسَاءَ» میں عورتوں سے الگ رہوں گا، شادی نہیں کروں گا۔ گھر بار کی جھمیلوں میں پڑوں گا ہی نہیں۔ شادی نہیں کروں گا۔ مسجد میں سارا وقت گزار دوں گا۔ آپ نے فرمایا کہ تم میرا طریقہ نہیں جانتے؟ «وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ» میں نے عورتوں سے شادی کی ہوئی ہے۔ میں نے نکاح کیا ہوا ہے۔ اور تم کہتے ہو میں نکاح نہیں کروں گا۔ «فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي» جو شخص میرے طریقے سے اعراض کرے گا، بے رغبتی کرے گا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ ہمارے دین سے خارج ہے، امت سے خارج ہے۔ ہمارے طریقے سے باہر ہے۔ تو کتنی بڑی وعید ہے۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی حدیث ہے، عبداللہ بن عمرو بن عاص کی روایت ہے کہ «الدُّنْيَا مَتَاعٌ» دنیا ساری ایک سامان ہے۔ بلکہ

[1] صحيح مسلم، حديث:746. [2] صحيح البخاري، حديث:5063.

دھوکے کا سامان ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔ «وَخَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا» اس دنیا کے ساز و سامان میں اگر کوئی سامان بہتر ہوسکتا ہے تو وہ کیا ہے؟ «اَلْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ»[1] وہ نیک بیوی ہے۔ یہ سارا سامان دھوکے کا ہے۔ اور اگر کوئی سامان بہتر ہوسکتا ہے وہ نیک بیوی ہے۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے ایک حدیث میں ایک شخص کی سعادت کے لیے تین چیزوں کا ذکر ہے کہ تین چیزیں کسی انسان کو میسر ہوں تو یہ اس کی سعادت کی دلیل ہوگی: ① نیک بیوی کا مل جانا ② گھر کشادہ ہونا ③ سواری اچھی ہونا۔[2]

یہ تین چیزیں میسر ہیں تو وہ شخص انتہائی سعید ہے۔ اور نیک بخت ہے۔ نکاح کے بڑے فائدے ہیں۔ ① اللہ کے امر کی اطاعت۔ ② اللہ کے پیغمبر کی سنت کا اتباع۔ ③ نظروں کی حفاظت ④ شرمگاہ کی حفاظت۔ ⑤ نکاح کے عمل سے اولاد کا پیدا ہونا جو امت محمدیہ میں اضافے کی دلیل ہے۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کا فرمان ہے: «تَزَوَّجُوا الْوَدُودَ الْوَلُودَ»[3] کہ نکاح کرو ایسی عورتوں سے جو محبت کرنی والی ہوں اور بچے پیدا کرنے والی ہوں۔ یہ کیسے معلوم ہوگا؟ یہ اس عورت کے خاندان کو دیکھ کر پتا چلے گا، اس کی والدہ ہے، اس کی بہنیں ہیں۔ یہ سب اولاد والی ہیں تو معنی یہ بھی اولاد والی ہوگی، یعنی اس قرینے سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ صالح اولاد ہی نکاح کا ایسا فائدہ ہے کہ کوئی فائدہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ رسول اللہ ﷺ نے صالح اولاد کو صدقہ جاریہ کہا ہے۔ نبی ﷺ کی حدیث ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو مرجاتے ہیں، قبر میں پہنچ جاتے ہیں، نام ونشان مٹ چکا ہوتا ہے۔ مگر قبر کے اندر ان کا ثواب ان کو ملتا رہتا ہے۔ «سَبْعٌ يَجْرِي لِلْعَبْدِ أَجْرُهُنَّ وَهُوَ فِي قَبْرِهِ بَعْدَ مَوْتِهِ» سات قسم

[1] صحيح مسلم، حديث:1467. [2] مسند أحمد:408/3. [3] سنن أبي داود، حديث:2050.

کے افراد ایسے ہیں کہ اپنی قبروں میں پہنچ جاتے ہیں اور ان کا ثواب ان کو ملتا رہتا ہے۔ ان میں سے ایک شخص کون ہے؟ «تَرَكَ وَلَدًا يَّسْتَغْفِرُ لَهُ» [1] جو اپنے پیچھے نیک اولاد چھوڑ جائے جو اس کے لیے استغفار کرے۔ نیک اولاد کا ایک ایک عمل صدقہ جاریہ ہے۔ ان کی دعائیں ماں باپ کے حق میں قبول ہوتی ہیں۔ کتنا بڑا فائدہ ہے یہ۔ جب انسان مرتا ہے تو اس کے عمل صالح ختم ہو جاتے ہیں، لیکن یہ ایک طریقہ ایسا ہے کہ اس کا ثواب جاری ہے، قائم ہے اور کبھی ختم نہ ہونے والا ہے۔ اگر وہ نیک اولاد اپنی نیکی کا فائدہ آگے پہنچا رہی ہے تو وہ بھی صدقہ جاریہ بن جائے گا۔ یہ سلسلہ قیامت تک طول پکڑ سکتا ہے۔ کتنا بڑا فائدہ ہے! اور پھر ایک اور فائدہ اسی نیک اولاد کا کہ یہ نیک اولاد قیامت کے دن ماں باپ کے لیے سفارش کرنے والی بن سکتی ہے۔ نبی ﷺ کی حدیث ہے: وہ بچے جو فوت ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو قیامت کے روز جنت میں داخلے کا حکم دے دے گا۔ وہ جنت کی طرف جا رہے ہیں خوشی خوشی۔ مگر دروازے پر پہنچ کر کھڑے ہو جائیں گے۔ بھئی کیوں رک گئے؟ داخل ہو جاؤ۔ یا اللہ! نہیں، ہماری موت پر ہمارے ماں باپ نے کتنا صبر کیا ہوگا، ہم نے اپنی اس موت کے ذریعے اپنے ماں باپ کو کتنا صدمہ دیا ہے۔ ان کے بغیر کیسے جائیں؟ ہمارے ماں باپ ساتھ جائیں گے تو ہم جنت میں جائیں گے، اس میں داخل ہوں گے، ورنہ نہیں جائیں گے، [2] یعنی ذریت کا فائدہ۔ یہ ایک شفاعت کا طریقہ ہے۔ اللہ قبول کرے گا۔ جنتیوں کی خواہش اللہ تعالیٰ پوری کرے گا، چنانچہ ان کے ماں باپ حاضر کیے جائیں گے اور ان کے ساتھ ان کو جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ یہ فائدے ہیں نکاح کے۔

[1] صحیح الترغیب و الترهیب للألباني، حدیث: 73. [2] صحیح مسلم، حدیث: 2635.

نسل کی حفاظت اور معاشرہ تقویٰ اور طہارت کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ یہ سب نکاح کے فائدے ہیں۔ شریعت کا یہ عمل بڑی خوبیوں پر قائم ہے۔ اور بہت زیادہ اس میں برکات ہیں۔ اور بہت زیادہ امت کی بھلائیاں ہیں جو اس نکاح کے عمل سے حاصل ہوتی ہیں۔ یہ تو تھی نکاح کی ترغیب جس کے متعلق کچھ نصوص ہم نے آپ کے سامنے رکھیں۔ اور نکاح میں جلدی کرنی چاہیے۔

کچھ وہ غلطیاں جو نکاح کے تعلق سے ہمارے معاشرے میں رائج ہیں، جو میرے ذہن میں حاضر ہیں ان کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔ ایک غلطی ایک شخص کی طرف سے کب نمودار ہوتی ہے جب اپنے نکاح کے لیے وہ کسی حرص کا شکار ہو جائے کہ میرا نکاح ایسے گھر میں ہو جو مالدار ہو تاکہ مجھے مالی استحکام مل جائے۔ یہ لالچ ہے جس کی وہ تلاش میں رہتا ہے۔ ایسے گھر میں اگر شادی ہو جائے تو یہ شریعت کے مقاصد کے خلاف نہیں ہے لیکن صرف مال ہی کو مطمح نظر بنا لینا اور اس انتظار میں بیٹھے رہنا، یہ ایک بڑا بگاڑ ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد طرفین کے لیے ہے، لڑکے کے لیے بھی اور لڑکی کے وارثوں کے لیے بھی کہ وہ دین داری کو ترجیح دیں، چنانچہ بیوی کے انتخاب کے لیے ہر لڑکے کی خواہش دین داری ہو۔ ہر لڑکی کے وارثوں کی خواہش دین داری ہونی چاہیے۔ اسے ترجیح دی جائے۔ نبی ﷺ کی حدیث ہے کہ «تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ» عورت سے نکاح کیا جاتا ہے چار اسباب کی بنا پر «لِمَالِهَا وَلِحَسَبِهَا وَلِجَمَالِهَا وَلِدِينِهَا» اس کے مال کو دیکھ کر، اس کے خاندان کو دیکھ کر، اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر۔ یہ تینوں چیزیں کوئی شرعی مقاصد کے منافی نہیں ہیں۔ خوبصورت عورت اگر میسر آتی ہے، ضرور قبول کریں۔ مال دار ضرور قبول کریں، خاندانی وجاہت ضرور قبول کریں،

لیکن پیغمبر علیہ السلام کا فرمان ہے: «فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّينِ» [1] باقی چیزیں ہوں یا نہ ہوں تم دین دار کو ترجیح دو۔ دین داری کا یہ تصور اگر نہ ہو تو یہ ایک نوجوان کی غلطی ہے۔ تم دین دار کو ترجیح دو۔ اور اگر دین دار کو ترجیح دو گے تو اللہ رب العزت اس صالحہ خاتون کی برکت سے تمھیں خوشحال کردے گا: ﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا﴾ [2] جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا، تقویٰ کی بنیادوں کو ترجیح دے گا اللہ تعالیٰ اس کے سارے کام آسان کردے گا۔ ﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ۝ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ [3] جو تقویٰ کی بنیادوں کو ترجیح دے گا اللہ تعالیٰ اس کی پریشانیوں کو دور کرے گا، اس کو مشکلات سے نکلنے کا راستہ مہیا کرے گا اور ایسے مقام سے روزی دے گا جہاں سے اس کا وہم وگمان بھی نہ ہوگا۔ اور یہی فرمان، یہی حکم لڑکی کے سرپرستوں، اس کے وارثوں کو ہے: «إِذَا جَاءَكُمْ» اور ایک روایت میں ہے: «إِذَا خَطَبَ إِلَيْكُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِينَهُ وَخُلُقَهُ فَزَوِّجُوهُ إِلَّا تَفْعَلُوا تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ عَرِيضٌ» [4] جب تمھاری بیٹی کے لیے نکاح کا پیغام ایسے صالح مرد کی طرف سے آجائے جس کا اخلاق بھی اچھا ہو اور دین بھی اچھا ہو۔ یہ دو چیزیں ہیں۔ اخلاق پسندیدہ ہو اور دین بھی پسندیدہ ہو تو اس سے نکاح کر دو، انکار نہ کرو۔ قبول کرلو اس کو۔ اگر قبول نہیں کرو گے تو بڑا فتنہ ہوسکتا ہے۔ لمبا چوڑا فساد ہوسکتا ہے جس کا تم تصور نہیں کرسکتے۔ تمھاری عزتیں اور تمھاری وجاہت خاک میں مل سکتی ہے۔ تم زمانے میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔ یہ پیغمبر علیہ السلام کے فرامین ہیں۔ تو لڑکی یا لڑکے کے انتخاب میں ایک غلطی ہے۔ ہماری نظر مال کی طرف ہے، خاندان کی طرف

[1] صحيح البخاري، حديث:5090، و صحيح مسلم، حديث:1466. [2] الطلاق65:4.
[3] الطلاق65:2، 3. [4] جامع الترمذي، حديث:1084.

ہے۔ دین کی طرف نہیں ہے۔ اور یہ جو خاندان کا ایک لیبل لگ چکا ہے کہ ہماری بیٹی کی شادی خاندان میں ہوگی، خاندان سے باہر نہیں ہوگی۔ یہ بھی ایک بگاڑ ہے۔ اس میں اکثر وبیشتر الا ماشاء اللہ دین داری کو نہیں دیکھا جاتا۔ بس خاندان کو دیکھا جاتا ہے۔ دین داری پیش نظر نہیں ہوتی۔ بس بچی کے لیے رشتے کی تلاش ہے اور خاندان سے باہر کرنا نہیں۔ اور خاندان میں کوئی دین دار رشتہ ہے ہی نہیں۔ تو بعض اوقات ایک صالح بیٹی کو کسی لفنگے کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے۔ یہ خاندان کا تو ہے نا۔ حالانکہ دین میں ہمسری ہے، یہ برابری اور ہمسری خاندانی اعتبار سے نہیں ہے، برادری کے اعتبار سے نہیں ہے، مال کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ یہ ہمسری اور یہ برابری دین کی بنا پر ہے، صرف دین کی بنا پر۔ ﴿الطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ﴾ نیک عورتیں نیک مردوں کے لیے ہیں اور نیک مرد نیک عورتوں کے لیے ہیں۔ ﴿الْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ﴾ [1] دیکھیں برادری کی بنیاد پر کئی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ پاکیزہ خواتین کو گندے مردوں کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے کہ برادری کا مسئلہ ہے۔ فاطمہ بنت قیس کو اپنے شوہر سے طلاق مل گئی۔ ابو عمرو بن حفص رضی اللہ عنہ ان کے شوہر تھے۔ ان سے مطلقہ ہوگئیں۔ بڑی خوبصورت خاتون تھیں۔ اور بڑی صاحب فراست تھیں۔ بڑی ذہین وفطین اور عقل مند تھیں۔ ان کی نیکی، تقویٰ اور فراست معروف تھی۔ ایک حوالہ اس کا یہ بھی ہے کہ امیر عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد، امیر عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شوریٰ مقرر کی تھی کہ خلیفہ کا چناؤ اس شوریٰ میں سے ہوگا۔ یہ شوریٰ بیٹھے گی۔ اس شوریٰ کا اجلاس فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کے گھر میں ہوا تھا، یعنی اس اجلاس کے لیے ایک پاکیزہ مرکز کا تعین کیا گیا اور وہ فاطمہ

[1] النور24:26.

بنت قیس رضی اللہ عنہا کا گھر تھا۔ یہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے پاس آئی اور کہا: یارسول اللہ! میں مطلقہ ہوں اور شادی کرنا چاہتی ہوں۔ دو پیغام آئے ہیں۔ آپ بتائیے میں کسے قبول کروں؟ ایک ابوجہم کا اور ایک معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کا۔ کسے قبول کروں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَمَّا أَبُو جَهْمٍ فَلَا يَضَعُ عَصَاهُ عَنْ عَاتِقِهِ» جہاں تک ابوجہم کا معاملہ ہے وہ تو ہمیشہ اپنا عصا، اپنا کوڑا اور اپنا ڈنڈا اپنے کندھے پر رکھتا ہے، یعنی بیویوں کو مارتا ہے۔ یہ اس میں ایک عیب ہے۔ «وَأَمَّا مُعَاوِيَةُ فَصُعْلُوكٌ لَا مَالَ لَهُ» اور معاویہ فقیر ہے اس کے پاس مال نہیں ہے۔ اس کے پاس مال کی وسعت نہیں ہے، یعنی جو عیب اللہ کے پیغمبر پہچانتے تھے وہ بیان کر دیا۔ اور ساتھ ہی آپ نے حکم دیا کہ «انْكِحِي أُسَامَةَ بْنَ زَيْدٍ» تم زید کے بیٹے اسامہ سے نکاح کرلو۔ [1] دیکھو کوئی برادری کا تصور ہے؟ فاطمہ بنت قیس قریشی خاتون ہے اور برادری پوری کائنات میں اونچی برادری ہے۔ پوری کائنات میں سب سے اونچی برادری قریش ہے۔ اور یہ قرشیہ ہے۔ اور اسامہ غلام ہے۔ بلکہ غلام کا بیٹا بھی ہے۔ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما۔ زید رضی اللہ عنہ بھی غلام تھے اور اسامہ رضی اللہ عنہ بھی غلام، یعنی قریشی خاندان کی خاتون کو نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے اسامہ رضی اللہ عنہ کے نکاح میں دے دیا۔ اس کا معنی یہ برادری کا جو بت ہم نے کھڑا کیا ہوا ہے۔ اور بعض اوقات یہ بڑے بگاڑ کا باعث بن جاتا ہے، یہ بڑا خطرناک ہے۔ اس سے گریز کرنا چاہیے۔ اچھا نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے جو دو رشتے آئے تھے، دونوں صحابہ تھے اور صحابہ سارے عادل ہیں، متقی ہیں، پرہیزگار ہیں۔ مگر ان کے دو عیب اللہ کے پیغمبر نے بیان کیے، حالانکہ دین داری تو موجود ہے۔ پھر ان کے یہ عیب بیان کیوں کیے؟ کہ ایک فقیر ہے

[1] صحیح مسلم، حدیث: 1084.

اور ایک متشدد۔ یہ عیب کیوں ذکر کیے؟ عیب ذکر کرنے چاہئیں۔ اور اگر کوئی تیسرا مناسب دین دار رشتہ موجود ہے تو اسے پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہاں تو رشتے بالکل مفقود ہوتے ہیں، اور رشتہ ہے ہی نہیں کوئی، تو یہاں دینداری تو موجود ہے، پھر کسی اور طرف نہ جایا جاتا، لیکن یہاں تو ایک سے ایک رشتہ بڑھ کر موجود ہے۔ اللہ کے پیغمبر کے اصحاب متواتر ہیں۔ اور اللہ کے پیغمبر نے فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کے لیے، اپنی برادری کی خاتون کے لیے اپنے غلام اسامہ رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا۔ اور اسامہ رضی اللہ عنہ دین دار تھے۔ متقی اور پرہیزگار تھے۔ فہم وفراست میں انتہائی اعلیٰ۔ اور اسامہ رضی اللہ عنہ کی دینداری کی، اسامہ کی فہم وفراست کی سب سے بڑی گواہی یہ ہے کہ سولہ، سترہ سال کے کم عمر ہونے کے باوجود نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے اپنے انتقال سے قبل ایک لشکر تشکیل دیا تھا، اس لشکر میں فوجی ابوبکر صدیق بھی تھے، عمر بن خطاب بھی تھے، بڑے بڑے صحابہ تھے، جرنیل تھے اور آپ نے امیر کس کو بنایا؟ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو۔ یہ ان کی فراست کی دلیل نہیں ہے! ان کے فہم اور عقل کی دلیل نہیں ہے! عمر بھی چھوٹی ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ یہ سارا کمال کہاں لوٹتا ہے؟ یہ کمال اللہ کی توفیق سے اللہ کے پیغمبر کی تربیت کا ہے کہ اس تربیت میں غلام بھی اتنا عروج اور کمال حاصل کرلیتا ہے کہ اس لشکر کا امیر بنادیا گیا جس لشکر میں کبار صحابہ ایک فوجی کے طور پر روانہ ہونے تھے۔ یہ فہم وفراست اللہ کے پیغمبر کی تربیت کا حصہ ہے۔ جس تربیت نے ایک غلام کو یہ مقام دے دیا، اس تربیت نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کیا مقام دیا ہوگا! عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو کیا مقام دیا ہوگا! تو یہ پیارے پیغمبر کی تربیت کے آثار ہیں۔ یہ تربیت کے آثار ہیں۔ یہ جو برادری کا بندھن ہے یہ کوئی ایسا بندھن نہیں ہے جس کی شریعت حوصلہ افزائی کرتی ہو اور خاص طور پر ان حالات

میں۔ اگر برادری میں معقول دین دار رشتہ موجود ہے تو ضرور کیجیے۔ دیکھا بھالا، لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر کیا مجبوری ہے، جس بچی کی آپ نے تربیت کی، کفالت کی، اس کے ناز نخرے اٹھائے، اسے جانتے بوجھتے ایک بدقماش مرد کے ساتھ باندھ دو جس کے پاس تقویٰ ہے نہ دین، بس ایک ہی حسن آپ کو نظر آیا کہ اپنی برادری کا ہے۔

چونکہ ہم ایک ایسے ادارے میں ہیں جہاں روزانہ فتوے آتے ہیں اور بیشتر فتوے طلاق پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اور بیشتر طلاقیں انھی رنجشوں کی بنا پر ہوتی ہیں۔ اگر ان امور کا خیال نکاح کے وقت کرلیا جائے تو ایسی نوبتیں نہ آئیں، لیکن جہاں دینداری میں ہمسری نہیں ہوتی وہاں یہ پریشانیاں ہوں گی۔ تو ہمسری کا تعلق دین سے ہے نہ کہ مال، خاندان اور برادری سے۔ ہمسری کا تعلق دین داری کے ساتھ ہے، لہٰذا اپنی پاکیزہ اور صالحہ بچی کے لیے صالح اور پاکیزہ مرد کو دیکھو۔ خبیث مرد کو نہ دیکھو۔ باقی سب کچھ ہو، مال ہے، برادری کا ہے، اچھا کاروبار ہے، فیکٹریاں ہیں مگر وہ خبیث ہے، نماز نہیں پڑھتا، اس سے بڑی خباثت کیا ہوگی کہ بے نماز ہے۔ بعض علمائے حنابلہ کا فتویٰ ہے کہ بے نماز سے نکاح ہی نہیں ہوتا۔ وہ نکاح درست ہی نہیں۔ تو اس فتوے سے اختلاف ہوسکتا ہے، لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ جس بچی کی آپ نے تربیت کی، اس کو آپ دن دیہاڑے جانتے بوجھتے کسی خبیث مرد کے سپرد کردیں۔

اس ایک حجت کی بنا پر کہ برادری کا ہے۔ اس سے کئی بگاڑ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور کئی قباحتیں اس سے پیدا ہوتی ہیں جس کا آپ تصور نہیں کرسکتے تھے۔ یہ بھی نکاح میں ایک بگاڑ ہے۔ ایک غلط روش ہے جس کا ہم شکار ہوچکے ہیں۔ اور ایسے امور جو نکاح کو لیٹ کرنے کا باعث ہوں، ان امور کی قطعاً حوصلہ افزائی درست نہیں۔ ان میں سے

ایک مرض یہ بھی ہے کہ برادری میں رشتہ نہیں مل رہا ہے۔ بچی کی عمر گھر بیٹھے بیٹھے بڑھتی جارہی ہے۔ کتنے اس کے مفاسد قائم ہوسکتے ہیں! اور ان میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ آپ بچی کو تعلیم دلوا رہے ہیں، اعلیٰ تعلیم کہ یہ یونیورسٹی میں جائے، پی۔ ایچ۔ ڈی کرے، فلاں اور فلاں ڈگریاں حاصل کرے۔ اس کی کیا ضرورت ہے؟ اب وہ پی۔ ایچ۔ ڈی تو ہوگئی، اب اس کا جوڑ چاہیے۔ بچہ بھی پی۔ ایچ۔ ڈی ہو۔ اور وہ کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤ گے؟ تو یہ اعلیٰ تعلیم قطعاً شرعی مقاصد کو پورا نہیں کرتی۔ دین داری میں بھی، دین میں بھی واجبی تعلیم کافی ہے۔ ایک بچی اپنے ارکان اسلام کو پہچان لے۔ اپنے عقیدے کو پہچان لے۔ پانچ ارکان اسلام کے، چھ ارکان ایمان کے۔ یہ گیارہ ارکان ہیں۔ ان کی معرفت ہونی ضروری ہے۔ اور پھر جو ایک گھر داری ہے جس میں شوہر کی خدمت، وفاشعاری، بچوں کی تربیت اور صالح اولاد، ان امور کی معرفت کافی ہے۔ ایک عورت کو جنت کیسے ملتی ہے؟ نبی ﷺ کی حدیث ہے: «الْمَرْأَةُ إِذَا صَلَّتْ خَمْسَهَا وَصَامَتْ شَهْرَهَا وَ أَطَاعَتْ بَعْلَهَا، وَ حَفِظَتْ فَرْجَهَا، قِيلَ لَهَا ادْخُلِي مِنْ أَيِّ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ شِئْتِ»[1] ایک عورت پانچ وقت کی نماز پڑھ لے۔ رمضان کے روزے رکھ لے، اپنی عزت کی حفاظت کرلے اور اپنے شوہر کی فرمانبرداری کرلے۔ یہ چار کام، پنج وقتہ نماز، رمضان کے روزے، عزت کی حفاظت اور شوہر کی فرمانبرداری اور وفاشعاری۔ قیامت کا دن ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس خاتون کو حکم دے گا کہ تیرے لیے میں نے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیے۔ جہاں سے چاہو داخل ہوجاؤ۔ کوئی معمولی مقام ہے؟ نبی ﷺ کے بعد اس امت میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا

[1] صحیح مسلم، حدیث: 1480.

مقام ہے۔ ان سے افضل کوئی نہیں۔ جتنا اونچا ان کا مقام ہے اتنا اونچا انھوں نے سوال کیا کہ یارسول اللہ! جنت کے آٹھ دروازے ہیں۔ کوئی ایسا شخص ہے جس کو آٹھوں دروازوں میں سے کسی بھی دروازے سے داخل ہونے کا اختیار دے دیا جائے۔ جس کے جنت میں داخلے کی باری آئے تو اللہ تعالیٰ جنت کے آٹھوں دروازے کھول دے۔ ان کے سوال کا مقصد کیا تھا؟ اعلیٰ انسان تھے، ہمتیں انتہا کی توانا تھیں، اس سوال کا مقصد یہ تھا کہ ایسا شخص اگر ہے تو میں اس کا کردار معلوم کر کے ویسا بننے کی کوشش کروں گا۔ یہ اس سوال کا مقصد تھا۔ یہ سوال ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کر سکتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ابوبکر بہت کم لوگ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ جن کے لیے جنت کے تمام دروازے کھول دے گا۔'' «وَأَرْجُو أَنْ تَكُونَ مِنْهُمْ» [1] میں یقین سے نہیں کہہ رہا، مجھے امید ہے کہ تم بھی ان میں سے ہو گے۔ امید ہے مجھے۔ مگر یہاں یقینی خبر ہے۔ عورت پنج وقتہ نماز پڑھے، رمضان کے روزے رکھے، عزت کی حفاظت کر لے اور اپنے شوہر کی فرمانبرداری کر لے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے آٹھوں دروازے کھول دے گا جہاں سے چاہو داخل ہو جاؤ۔ یقینی طور پر فرمایا۔ صادق المصدوق کی سچی حدیث۔ تو پھر کتنی تعلیم اس کے لیے ضروری ہے؟ تو یہ چیز بھی شادی میں تاخیر کا سبب ہے۔ اس سے شادیاں لیٹ ہوتی ہیں۔ یہ بچی ہماری پی۔ ایچ۔ ڈی ہے تو اس کا مساوی رشتہ چاہیے۔ اب وہ مل نہیں رہا، بچی گھر بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو رہی ہے۔ بڑے فسادات اس سے پیدا ہوتے ہیں۔ بڑے فتنے جنم لیتے ہیں۔ پھر اخباروں اور میڈیا کی سرخیاں بنتی ہیں۔ اور خاندانوں کی عزتوں کے جنازے نکل جاتے ہیں، جس کی خشت اول آپ

[1] صحيح ابن حبان، حديث: 4163.

خود ہیں۔ بنیاد آپ نے کھڑی کی ہے۔ تو اتنی اعلیٰ تعلیم کی ضرورت؟ کیا پیارے پیغمبر کے اسوہ میں اور آپ کی تعلیم میں یہ بات ثابت ہوتی ہے؟ نہیں۔ ایک خاتون کے لیے واجبی تعلیم مگر اعلیٰ تربیت۔ امام بخاری نے باب قائم کیا ہے کہ ایک شخص اپنے اہل کو تعلیم دیتا ہے اس کا ثواب کیا ہے؟ کتاب العلم میں یہ بات ہے۔ ایک شخص اپنے اہل کی، اپنی بیوی کی، اپنی بیٹیوں کی، اپنی بہنوں کی تعلیم کا انتظام کرتا ہے اس کا ثواب کیا ہے؟ اور حدیث کیا ذکر کی کہ تین شخصوں کا دہرا اجر ہے۔ تین شخصوں کا ہر عمل اجر کے اعتبار سے ڈبل ہے۔ ان میں سے ایک شخص یہ ہے: «رَجُلٌ كَانَتْ عِنْدَهُ أَمَةٌ» ایک شخص کے پاس لونڈی ہے۔ «فَأَدَّبَهَا فَأَحْسَنَ تَأْدِيبَهَا وَعَلَّمَهَا فَأَحْسَنَ تَعْلِيمَهَا ثُمَّ أَعْتَقَهَا فَتَزَوَّجَهَا» [1] وہ شخص، اس لونڈی کو اچھی تعلیم دیتا ہے۔ احسن تعلیم دین کی ہے۔ اس کو ادب سکھاتا ہے، اچھا ادب۔ اچھا ادب دین کا ہے یورپ کا نہیں، پھر اس کو آزاد کر دیتا ہے اور آزاد کر کے نکاح کر لیتا ہے۔ فرمایا کہ اس کا دہرا اجر ہے۔ امام بخاری کا مقصد کیا ہے؟ باب تو قائم کیا کہ ایک شخص اپنے اہل کو تعلیم دے مگر حدیث میں لونڈی کا ذکر ہے۔ امام بخاری کی فقہ، ان کی سوچ، حدیث سے استنباط ان پر ختم ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ ایک لونڈی جس کی ذمہ داری محدود ہے، لونڈی کی ذمہ داری محدود سی ہے جب اس کو تعلیم دینے کا یہ ثواب ہے کہ دہرا اجر ہے تو ایک آزاد عورت جس کی ذمہ داریاں لونڈی سے زیادہ ہیں، اس کو تعلیم دینے کا کتنا ثواب ہوگا۔ یہ امام بخاری کا اس حدیث سے استنباط ہے۔ تو یقیناً دینی تعلیم دی جائے لیکن دنیاوی تعلیم میں اس قدر انہاک کہ ایسا پڑھانا، عمریں بیت جاتی ہیں، پھر اس کا

[1] صحيح البخاري، حديث: 97، و صحيح مسلم، حديث: 1027.

مساوی رشتہ ملتا نہیں ہے اور شادیاں لیٹ ہوتی ہیں۔ شریعت ہر اس امر کی مذمت کرتی ہے جو امر بچی یا بچے کے نکاح کو لیٹ کرتا ہو۔ لڑکے نے تعلیم مکمل کرنی ہے، تب اس کی شادی کریں گے۔ بھئی یہ تعلیم تو اتنی ہوچکی۔ نہیں، پی۔ ایچ۔ ڈی کرے گا۔ یورپ جائے گا۔ وہاں سے فلاں ڈگری لے کر آئے گا۔ فلاں لے کر آئے گا تب اس کی شادی کریں گے۔ تب تک پتہ نہیں وہ کیا کچھ بن چکا ہوگا۔ اور کتنے گھناؤنے کھیل کھیل چکا ہوگا۔ اس کا وبال کس پر ہے؟ سوچنے کی بات ہے۔ تو یہ ایک شادی کے تعلق سے معاشرے کا بگاڑ ہے کہ شادی کو لیٹ کرنے کا فیشن، لیٹ کرنے کا رواج ہے۔ وہ سارے امور جو نکاح کرنے میں تاخیر کا سبب بنتے ہیں وہ مذموم ہیں، قابل مذمت ہیں۔ وہ بگاڑ پیدا کرنے والے اور فتنے کھڑے کرنے والے ہیں۔ ان امور کی قطعاً حوصلہ افزائی نہیں کی جاسکتی۔ یہ بگاڑ ہے۔ ان سے احتراز ضروری ہے۔ اور ایسے امور اختیار کیے جائیں جن میں بچے اور بچیوں کی شادی اور نکاح جلدی ہوں تاکہ یہ معاشرہ عفت، پاکیزگی اور پاکدامنی پر قائم ہو۔

ایک بگاڑ حق مہر کے تعین کے تعلق سے ہے۔ اس میں ہمارا معاشرہ افراط وتفریط کا شکار ہے۔ حق مہر نکاح کا رکن ہے۔ اس کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ حق مہر کے تعلق سے بعض جگہ زیادتی ہے، غلو ہے اور بعض جگہ انتہائی کوتاہی ہے۔ جو چیز نکاح کی بنیاد ہے اور نکاح کی صحت کی شرط ہے، ہمیں اس کا فہم ہونا چاہیے۔ بعض جگہ ایسا ہوتا ہے کہ لڑکا انتہائی مالدار ہے۔ وہ اپنی شادی کے چراغاں میں اتنا خرچ کردیتا ہے جتنا حق مہر نہیں ہوتا۔ شادی کی تیاری کرتا ہے۔ جو باتھ روم بن رہا ہے اس پر دس لاکھ خرچ آگیا۔ چراغاں پر پانچ لاکھ خرچ آگیا۔ فلاں کام، فلاں کام اتنا خرچ آگیا۔ عالی شان ہوٹل

میں ولیمے کا اہتمام ہے، لاکھوں روپے خرچ آگیا۔ حق مہر؟ حق مہر شرعی ہونا چاہیے۔ کوئی شرعی حق مہر ہے؟ کوئی ایسی اصطلاح ہے؟ اس میں جو بچی کے وارث ہیں، وہ بھی کہتے ہیں جو چاہیں متعین کردیں۔ لڑکے والے بھی کہتے ہیں جی بالکل سادہ ہونا چاہیے، حالانکہ دس لاکھ روپے باتھ روم میں خرچ ہوگئے۔ اس غلو کا اللہ حساب لے گا۔ اس فضول خرچی کا حساب دینا ہوگا۔ حق مہر ایک بچی کی تکریم ہے، ایک بچی کی عزت ہے۔ کوئی آپ گائے بھینس کا سودا نہیں کررہے کہ ایک کھونٹے سے کھول کر دوسرے کھونٹے سے باندھ دو۔ ایک مسلمان باحیا عورت کی تکریم کے کیا تقاضے ہیں؟ کہ حق مہر شرعی ہونا چاہیے۔ بعض جگہوں پر اس کا تعین ہے: بتیس روپے آٹھ آنے۔ باتھ روم میں دس لاکھ روپے اور حق مہر بتیس روپے آٹھ آنے۔ کتنی گھٹیا اور گندی سوچ ہے۔ دلیل کیا پیش کرتے ہیں؟ «خَيْرُ الصَّدَاقِ أَيْسَرُهُ» [1] نبی ﷺ کا فرمان ہے: سب سے بہترین حق مہر کون سا ہے؟ جو آسان ہے۔ اس کا تعلق اللہ کے بندو عورتوں سے ہے۔ عورتیں اپنے نکاح پر حق مہر کا تقاضہ کرتی ہیں اور کرنا چاہیے۔ مگر ان کو چاہیے کہ وہ آسان حق مہر کا تعین کریں، حق مہر کے تعین میں وہ مشکل نہ ہو کہ مجھے تو دو کروڑ روپے حق مہر چاہیے۔ یہ نہ ہو، یعنی عورت اپنے طور پر کوشش کرے کہ حق مہر میں کوئی وزن نہ ڈالوں، کوئی بوجھ نہ ڈالوں، مشکل کا سبب نہ بنوں۔ اس کا معنی یہ تھوڑا ہے کہ ایک مرد بھی اس کو پکڑ لے کہ «أَيْسَرُهُ» سب سے آسان۔ نبی ﷺ کے دور میں حق مہر کا تعین نہیں تھا۔ ہاں ام المومنین سے سوال ہوا، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن نے پوچھا کہ نبی ﷺ اپنی بیویوں کو حق مہر کیا دیتے تھے؟ فرمایا: «ثِنْتَيْ عَشَرَ أُوقِيَةً وَنَشًّا» بارہ

[1] صحيح الجامع للألباني، حديث: 3279.

اوقیے اور ایک نش۔ [1] یہ آج کل کی ہماری پاکستانی کرنسی میں تقریباً ساڑھے تین ہزار سے چار ہزار تک کی مالیت ہے۔ یہ اللہ کے پیغمبر ﷺ کا اپنی بیویوں کا حق مہر تھا۔ جو آپ دیا کرتے تھے۔ مگر یہ حق مہر اکثر آپ نے دیا، اس سے زیادہ بھی دیا اور کم بھی دیا، مثلاً: آپ کا نکاح صفیہ رضی اللہ عنہا سے ہوا، صفیہ لونڈی تھی، اس کو آپ نے آزاد کیا۔ «وَجَعَلَ عِتْقَهَا صَدَاقَهَا» [2] اس کی آزادی ہی کو مہر بنا دیا۔ کوئی نقدی نہیں دی، کوئی چاندی اور سونا نہیں دیا۔ اس کو آزاد کیا اور اس کی آزادی ہی کو اس کا مہر بنا دیا۔ آپ کی سب سے پہلی بیوی سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا، انھیں آپ نے بیس اونٹ حق مہر دیا تھا۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی بیوی ام حبیبہ رضی اللہ عنہا جن کا نکاح حبشہ میں ہوا تھا، نبی علیہ الصلاۃ والسلام مدینہ میں تھے وہ حبشہ میں تھیں اور ان کا نکاح اللہ نے کیا، اللہ کے امر سے ہوا۔ حق مہر حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے دیا: چار ہزار درہم۔ اس نے اپنی رعیت کے عمائدین کو جمع کیا اور ان کی دعوت کر کے حبشہ سے ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے صحابی شرحبیل ابن حسنہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رخصت کیا۔ یہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی بیوی کی رخصتی ہو رہی ہے۔ رخصتی میں دعوت کا اہتمام بھی ہے، یعنی ہم منع کرتے ہیں کہ بارات کا کھانا نہ ہو، یہ کھانا ثابت نہیں ہے۔ اب دیکھیں یہاں درست کیا ہے یا غلط کیا ہے۔ کچھ لوگ انتہائی خشکی کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ بارات اور اس کا کھانا ثابت ہی نہیں، جائز ہی نہیں۔ ایک چیز اگر غلط ہو، اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کے لیے اسے نہیں ہونے دے گا۔ ایک کام غلط ہو اللہ نہیں چاہے گا کہ میرے پیغمبر کے لیے وہ ہو۔ حبشہ میں ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی عمل میں آ رہی ہے۔ اور سیکڑوں عمائدین کو حبشہ کے بادشاہ نے جمع کیا اور ان کی دعوت کی۔ حق مہر چار ہزار اپنی

[1] صحيح مسلم، حديث: 1426، بعد الحديث: 1427، و سنن أبي داود، حديث: 2106، و المستدرك للحاكم: 182/2. [2] صحيح البخاري، حديث: 5086، و صحيح مسلم، حديث: 1365.

طرف سے مقرر کر کے اپنی طرف سے ادا کیا، یہ اللہ کے پیغمبر کی تکریم کی۔ [1] تو یہ حق مہر کی کیا زیادتی ہے؟ اس کو غلو کہیں گے؟ تو پھر وہ حدیث کہاں گئی کہ «خَيْرُ الصَّدَاقِ أَيْسَرُهُ» بہترین حق مہر وہ ہے جو آسان ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کے لیے آسانی ہی چاہتا ہے۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے بعض خواتین کے لیے حق مہر کا تعین کیا وہ چار سو درہم ہے۔ نجاشی نے چار ہزار درہم دیے۔ کتنا فرق ہے؟ بڑا فرق ہے۔ تو اس میں معاشرہ افراط وتفریط کا شکار ہے۔ ہم نے ایک نکاح میں شرکت کی، وہاں حق مہر پانچ سو روپے تھا۔ میں دُلھا کو جانتا تھا، اس کی حیثیت کیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ حق مہر زیادہ کرو ہم نکاح نہیں پڑھائیں گے۔ یہ عورت کی تکریم کے خلاف ہے۔ ایک عورت اپنے باپ کے گھر کو چھوڑ کر آ رہی ہے اور اسے گھر چھوڑتے وقت احساس ہو کہ مجھے گھر چھوڑنے سے پہلے حق مہر کی صورت میں لاکھوں روپے کا مالک بنا دیا گیا ہے تو اس کو ایک انسیت کا احساس ہوگا۔ اور اگر آپ حق مہر میں سادگی کا قول اختیار کریں، باقی دنیا بھر کے جو تکلفات ہو رہے ہیں، مہندی اور مایوں میں بے تحاشا خرچ ہو رہا ہے جو کہ خالص ہندوانہ رسم ہے، لیکن یہاں جو شرعی امر، جس پر نکاح قائم ہے، اس میں آپ سادگی کا مظاہرہ کریں۔ یہ غلط ہے۔ حق مہر کا تعین ایک شوہر کی حیثیت کو دیکھ کر کیا جائے۔ قرآن کہتا ہے: ﴿وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا﴾ [2] تم خزانہ بھی دے سکتے ہو مہر میں۔ اور خزانہ لامحدود ہوتا ہے۔ خزانے کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں ایک زیادتی یہ ہے کہ واہ واہ کرانے کے لیے مجلس میں بڑا حق مہر بول دیا۔ پچاس لاکھ روپے اور بیوی کے سامنے جا کے مرغا بن گئے کہ معاف کر دو۔ یہ مہر میں دے نہیں سکتا، بس برادری میں ناک اونچی

[1] سنن أبي داود، حديث: 2107، و الطبقات لابن سعد: 8/97-99. [2] النسآء 4:20.

ہو جائے اور نام بنے، پچاس لاکھ روپیہ۔ اب وہ معاف کروانے کا معاملہ اندرون خانہ ہو رہا ہے دنیا تو نہیں جانتی۔ یہ چیز جو نمود و نمائش اور غلط شہرت حاصل کرنے کے لیے کی جا رہی ہے یہ شرعی مقاصد کے خلاف ہے۔ امیر عمر رضی اللہ عنہ نے اسی غلو کو دیکھ کر مہر کی تحدید کرنا چاہی، مثلاً: انھوں نے اللہ کے پیغمبر کے اس مہر کو لے لیا جو بارہ اوقیہ اور ایک نش ہے۔ ایک نش نصف اوقیہ ہے۔ جو میں نے عرض کیا کہ تقریباً چار ہزار پاکستانی کرنسی کے مساوی۔ تحدید کی کوشش کی تو ایک بوڑھی عورت لاٹھی ٹیکتے ٹیکتے قریب آ گئی۔ فرمایا کہ عمر! آپ تحدید کیوں کر رہے ہیں۔ قرآن تو اس کی تحدید نہیں کر رہا۔ قرآن کہتا ہے: ﴿وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا﴾ حق مہر میں تم خزانہ بھی دے سکتے ہو۔ شیخ البانی نے اس حدیث کو منکر کہا ہے۔ مگر علماء کی تحقیق کے مطابق اس کے شواہد موجود ہیں، حسن لغیرہ کے درجے میں ہے۔ وہ شواہد شیخ کو معلوم نہیں ہو سکے۔ شیخ کی علمیت کا اعتراف ہے۔ ارواء الغلیل میں انھوں نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ مگر وہ شواہد ان کو معلوم نہیں ہو سکے جن کی بنا پر یہ حدیث حسن لغیرہ ہے۔ عورت نے کہا: آپ تحدید کیوں کر رہے ہیں؟ قرآن تو کہتا ہے خزانہ دے سکتے ہو۔ امیر عمر رضی اللہ عنہ نے کیا فرمایا؟ «كُلُّ النَّاسِ أَفْقَهُ مِنْ عُمَرَ» تم میں سے ہر انسان عمر سے زیادہ فقیہ ہے۔ ہر شخص عمر سے بڑا سمجھ دار ہے۔ عمر ہی سب سے کم ہے۔ اور پھر فرمایا کہ عمر کی بات ختم اور جو اس عورت نے قرآن کی بات کہی ہے وہ فیصلہ نافذ۔ [1] ایک تو تحدید غلط، حق مہر کا تعین اپنی وسعت کے مطابق کیجیے۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے دور کی مختلف باتیں ہم نے آپ کو بتلائیں۔ آپ نے دو جوتوں کے عوض نکاح کیا۔ شوہر کی اتنی حیثیت تھی۔

[1] السنن الكبرىٰ للبيهقي، حديث: 14114.

ایک نکاح آپ نے نافذ کیا صحابی کے قرآن کے عوض کہ شادی کے بعد اپنی بیوی کو سورۂ بقرہ جو تمھیں یاد ہے، اسے یاد کروا دینا۔ اسی کے عوض میں یہ نکاح ہو رہا ہے۔ اس کو آپ نے کہا تھا کہ تم لوہے کا چھلہ ہی دیکھ لو، اس کی حیثیت ہی نہیں تھی۔ اگر وہ مل جائے تو وہی لے آؤ، وہ حق مہر بن سکتا ہے۔ [1] نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی پیاری بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح علی رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ فرمایا کہ «أَعْطِهَا شَيْئًا» علی اس کو مہر دو۔ فاطمہ کا مہر متعین کرو۔ علی نے کہا «مَا عِنْدِي شَيْءٌ» میرے پاس کچھ نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: «أَيْنَ دِرْعُكَ الْحُطَمِيَّةُ» [2] تمھاری وہ حطمی درع کہاں ہے؟ درع وہ لوہے کا لباس جو مجاہدین جہاد میں پہنتے ہیں، وہ کہاں ہے؟ وہی دے دو۔ علی رضی اللہ عنہ مالی اعتبار سے انتہائی کمزور تھے۔ حتیٰ کہ ان کے ولیمے کا خرچ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے برداشت کیا تھا۔ انھوں نے علی رضی اللہ عنہ کو تحائف دیے، مال دیا تاکہ ولیمہ کر سکیں۔ تو حیثیت اتنی ہی تھی۔ لیکن ایک شخص کی حیثیت اگر زیادہ ہے اور وہ سادہ اور شرعی حق مہر پر زور دے تو یہ خاتون پر ظلم ہے۔ خاتون کی تکریم کرو، اس کی عزت نفس کا اہتمام کرو اور یہ کوتاہی بالکل ناقابل برداشت ہے۔ اپنی حیثیت کو دیکھ کر حق مہر کا تعین کرو۔ تو یہ ایک غلطی ہے اس معاشرے میں جس کا ارتکاب ہو رہا ہے۔ حالانکہ حق مہر صحت نکاح کی شرط ہے۔ اس شرط کا اہتمام ضروری ہے۔

باقی میرے دوستو اور بھائیو! مختلف رسوم اور رواج ہیں، مثلاً: مایوں کی رسم، یہ مہندی کی رسم۔ ایک رسم ہے دودھ پلائی، ایک ہے جوتا چھپائی۔ یہ رسمیں ہیں۔ دیکھیں شادی بیاہ کا موقع ایک خوشی کا موقع ہے۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے نکاح کی تشہیر کا حکم دیا۔ فرمایا کہ

[1] صحيح البخاري، حديث: 5149، و صحيح مسلم، حديث: 1425، و سنن أبي داود، حديث: 2112. [2] سنن أبي داود، حديث: 2125، و سنن النسائي، حديث: 3377.

«أَعْلِنُوا النِّكَاحَ» نکاح کی تشہیر کرو۔ اور حدیث میں ہے: «وَاضْرِبُوا عَلَيْهِ بِالْغِرْبَالِ» [1] اور اس پر دف پیٹو۔ دف، ڈھول نہیں دف۔ ڈھول دو طرف سے ہوتا ہے اور دف ایک طرف سے ہوتی ہے۔ دف پیٹو۔ کیونکہ دف کو مارنے سے شور پیدا ہوتا ہے لیکن وہ پیٹنا ترتیب سے نہ ہو، یعنی بعض اوقات دف بجاتے ہیں تو اس میں موسیقیت ہوتی ہے۔ دف بجانے میں ترتیب اور موسیقی نہ ہو۔ بس مارو اس کو تاکہ شور پیدا ہو۔ اور دنیا جان لے کہ فلاں جگہ نکاح ہو رہا ہے۔ اور خاص طور پر نوجوان جان لیں کہ فلاں ہمارا دوست ہے عبداللہ، اس کی شادی ہو رہی ہے۔ تو ہم کیوں پیچھے رہ جائیں، ہم بھی کریں۔ یہ ترغیب نکاح ہے۔ ایک نکاح میں نبی ﷺ آئے۔ یہ نکاح انصاری خاتون سے ہو رہا ہے اور انصاریوں کو گانے سے دل لگی سے محبت ہے، یعنی اشعار پڑھنا۔ تو کسی ایسی مجلس کا انتظام کرلو جہاں بچیاں ہوں، اشعار پڑھیں، جاہلی اشعار اور پھر دین اسلام کے بعد جو مجاہدانہ اور جہادی نظمیں ہیں، ان کا اہتمام کرلو۔ معنی یہ کہ خوشی کا موقع ہے اور خوشی کے موقع میں اس قسم کے اہتمام جائز ہیں۔ اب برادری میں بعض معاملے ہوتے ہیں، وہ کریں یا نہ کریں؟ دیکھیں مہندی اور مایوں، یہ تو خالص ہندوانہ رسمیں ہیں۔ اور پھر مہندی جاتے وقت ہم نے بعض جگہ دیکھا۔ موم بتیاں ساتھ جلائی جاتی ہیں۔ اور وہ مہندی عورتیں لے کر جاتی ہیں۔ بے پردگی، اختلاط اور یہ آگ۔ آگ کو داخل کرنا کسی بھی شعار میں، کسی بھی عبادت میں، کسی بھی تہوار میں، یہ مجوسیت ہے۔ آتش پرستی ہے۔ یہ کام جائز نہیں۔ تو اس عمل میں کئی بگاڑ آ گئے۔ بے پردگی آ گئی، ہندوؤں سے مشابہت آ گئی۔ مجوسیت آ گئی۔ یہ باطل رسمیں ہیں۔ باقی یہ دودھ پلائی، جوتا چھپائی۔

[1] سنن ابن ماجه، حديث: 1895، و جامع الترمذي، حديث: 1089.

اگر یہ ہندوانہ رسمیں ہیں تو پھر یہ باطل ہیں۔ اور اس لحاظ سے بھی یہ درست نہیں ہیں کہ اس موقع پر انتہائی شرمناک اختلاط ہوتا ہے۔ اور پردے کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ اس لیے ان کو ناجائز ہی کہا جائے گا، لیکن اگر خوشی کی کوئی صورت ایسی ہو جس میں دو قباحتیں نہ ہوں: ایک یہ کہ اللہ کے پیغمبر نے اس سے روکا نہ ہو۔ اور دوسرا یہ کہ اس عمل میں کسی کافر مذہب یا قوم سے مشابہت نہ ہو۔ کیونکہ نبی ﷺ کا فرمان ہے: «مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ» [1] جو شخص اپنے کسی عمل میں کسی قوم سے تشبیہ اختیار کرے گا، وہ انھی میں سے ہے۔ وہ ہم میں سے نہیں بلکہ ان میں سے ہے تو کوئی ایسی رسم جس میں کسی مشرک یا کافر قوم سے مشابہت ہو وہ بھی ناجائز ہے۔ اور کوئی ایسی رسم، کوئی ایسا معاملہ جو شریعت کے خلاف ہو، مثلاً: شادی بیاہ کے موقع پر تصویر اور ویڈیو کا اہتمام۔ حرام ہے۔ شریعت نے اس کو حرام کہا ہے۔ بلکہ پیغمبر علیہ السلام کا فرمان ہے: «أَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ الَّذِينَ يُضَاهُونَ بِخَلْقِ اللَّهِ» [2] قیامت کے دن سب سے سخت عذاب ان لوگوں کو ہوگا جو اللہ کی صفت خلق سے مشابہت اختیار کرتے ہیں۔ خالق کون ہے؟ اللہ۔ مصور کون ہے؟ اللہ۔ آپ تصویر بنا کر خود خالق اور مصور بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ اللہ کے ساتھ مشابہت ہے۔ سب سے سخت عذاب ان لوگوں کو ہوگا۔ صفت خلق، صفت تصویر کا مالک اللہ ہے۔ اور آپ یہ امور انجام دے کر اللہ تعالیٰ سے مشابہت اختیار کر رہے ہیں۔ بلکہ پیغمبر علیہ السلام کا فرمان ہے: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ تمھاری بنائی ہوئی ساری تصویروں کو تمھارے سامنے رکھے گا اور فرمائے گا: «أَحْيُوا مَا خَلَقْتُمْ» ان کو زندہ کرو۔ [3] تم نے یہ بت بنا دیے، تم نے نقش و نگار قائم

[1] سنن أبي داود، حديث: 4031. [2] صحيح البخاري، حديث: 5954، و صحيح مسلم، حديث: 2107. [3] صحيح البخاري، حديث: 5951، و صحيح مسلم، حديث: 2108.

کردیے ان کو زندہ کرو۔ زندہ کرسکو گے؟ اس عذاب سے نکل سکو گے؟ کتنی یہ بھیانک صورت ہے۔ تو یہ شادی بیاہ کے موقع پر ایک ایسا معاملہ ہے جو سراسر شریعت کے خلاف ہے۔ اور پھر اس میں کتنی دیاثت اور کتنی بے غیرتی ہے! یعنی آپ ایک فوٹوگرافر کا اہتمام کررہے ہیں۔ وہ آجاتا ہے۔ ایک مرد ہے، دو مرد ہیں، تین مرد ہیں۔ ان کو آپ بے دھڑک اپنی خواتین میں بھیج دیتے ہیں کہ جاکر ہماری خواتین کی تصویریں بناؤ۔ ہماری دلھن بیٹھی ہے اس کو دیکھو، ہر زاویے سے دیکھو۔ اس کے اچھے سے اچھے پوز بناؤ۔ ایک ایک خاتون کو دیکھو۔ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے ان کی تصویریں بناؤ۔ کوئی اس سے بڑی دیوثیت ہے؟ یہ بے غیرتی کا عمل ہے۔ نبی ﷺ فرمارہے ہیں کہ دیوث جنت میں داخل نہیں ہوگا۔[1] تو یہ عمل شریعت کے خلاف ہے۔ یہ عمل دیاثت ہے۔ بندے کی بے غیرتی پر ختم ہوتا ہے کہ آپ ایک اجنبی کو اپنی خواتین میں بے دھڑک بھیج دیتے ہو۔ وہ پھر رہا ہے، گھوم رہا ہے۔ جہاں چاہے اس کی نظر جائے کوئی روک ٹوک نہیں۔ پوز بنارہا ہے۔ یہ کتنی بڑی دیاثت ہے۔ اور پھر ایسی شادیاں اکثر بے نتیجہ ثابت ہوتی ہیں۔ جھگڑے ہوتے ہیں، طلاق کی نوبت آتی ہے۔ بھئی جب خشت اول ٹیڑھی ہوگی تو تمھاری عمارت اگر ثریا تک بھی جائے تو ٹیڑھی ہی رہے گی۔ ایک مسئلے کی اساس ہی باطل ہے، اساس ہی حرام ہے تو آگے اس میں کیا خیر وبرکت ہوگی؟ تو یہ سب وہ امور ہیں جو شریعت کے خلاف ہیں۔ شریعت کے منافی ہیں۔ تو ایسی شادیاں پروان نہیں چڑھتیں۔ خیر وبرکت سے خالی ہوتی ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی پر منتج ہوتی ہیں۔ پھر جھگڑے اور فسادات کھڑے ہوتے ہیں۔

[1] المستدرك للحاكم: 1/101، حديث: 244.

اور پھر طلاق کی نوبت آجاتی ہے۔ جو حلال کاموں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے۔ شیطان پھر خوشیاں مناتا ہے۔ ابلیس اپنی ذریت کو بھیجتا ہے کہ جاؤ، صبح سے نکل جاؤ اور رات تک محنت کرو، کوشش کرو، اللہ کے بندوں کو گمراہ کرو۔ اور آکر رپورٹ دو۔ اب یہ ذریت پھیل جاتی ہے۔ کوئی آکر کہتا ہے کہ میں نے فلاں کو نماز سے روک دیا، کوئی کہہ رہا ہے کہ فلاں شخص حج کی درخواست دینے جارہا تھا۔ میں نے کہا: اتنا مال خرچ کرو گے، فقیر ہوجاؤ گے۔ اس کا ارادہ میں نے بدل دیا۔ کوئی کہتا ہے: فلاں کو میں نے عمرہ کرنے سے روک دیا، فلاں کو جہاد سے روک دیا۔ شیطان کہتا ہے کہ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ ایک آتا ہے۔ وہ کہتا ہے: میں فلاں گھر میں داخل ہوا۔ «مَا تَرَكْتُهُ حَتّٰى فَرَّقْتُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ امْرَأَتِهِ» اس وقت تک میں گھر سے نہیں نکلا جب تک میں نے میاں اور بیوی کے درمیان جدائی پیدا نہیں کردی۔ ابلیس کھڑا ہوتا ہے، اسے قریب کرتا ہے اور اس سے معانقہ کرتا ہے۔ سینے سے لگا لیتا ہے کہ تم اصل کارنامہ انجام دے کر آئے ہو۔[1] تو اس کی اساس کیا ہے۔ اساس یہ حرام امور ہیں جو شادیوں میں داخل ہوجاتے ہیں۔ تو ضروری ہے کہ ہم اس معاملے میں، بلکہ ہر معاملے میں نبی ﷺ کا اسوہ حسنہ، آپ کی سنت کی اقتداء اور شریعت کے امور کو سامنے رکھیں۔ اکثر گھرانے شادی بیاہ میں اسراف کا شکار ہوتے ہیں۔ تو یہ اسراف، کھانوں میں اسراف، ہم بارات کی بات کرتے ہیں، یعنی اگر کچھ لوگ آئے ہیں دلھا کے گھر سے اور وہ دو افراد ہیں، دس ہیں، بیس ہیں۔ اب یہ کہنا کہ بارات کا کھانا ہی ثابت نہیں، یہ غلط ہے۔ شریعت میں حق ضیافت ہے۔ کچھ افراد آئے ہیں آپ کی بچی

[1] صحیح مسلم، حدیث: 2813.

لینے کے لیے ان کی آپ ضیافت نہیں کر سکتے۔ ان کو آپ کھانا نہیں کھلا سکتے، یعنی اس سے کون سی شریعت روکتی ہے۔ اگر یہ ناجائز ہوتا تو اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کے لیے ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے موقع پر ایسا ہونے دیتا؟ ہرگز نہیں۔ آج ہم جہیز کے مخالف ہیں۔ مخالف ہوں لیکن جہیز میں غلو اور اسراف کے پہلو سے۔ ایک بیٹی اپنے باپ کے ساتھ رہی، اپنے باپ کے گھر میں رہی، ایک ملکہ بن کر رہی۔ باپ نے اس کو پالا اور پوسا۔ آج وہ مستقل باپ کو چھوڑ کے جا رہی ہے۔ تو کوئی باپ گوارا کرتا ہے کہ میری بیٹی خالی ہاتھ جائے۔ اس کو تحائف دے گا یا نہیں۔ خشک لوگ کہتے ہیں کہ یہ ناجائز ہے۔ جہیز نہ دو، ناجائز ہے۔ نہیں، اس میں غلو ناجائز ہے۔ قرضے لے کر بنانا یہ ناجائز ہے۔ لیکن اگر آپ کی حیثیت ہے کہ بچی کو آپ سونا دینا چاہتے ہیں، بچی کو آپ کپڑے دینا چاہتے ہیں، آپ دیں۔ کوئی باپ نہیں چاہے گا کہ میری بچی میرے گھر سے خالی ہاتھ جائے۔ جہیز ایک لعنت ہے لیکن جب غلو اور اسراف کا پہلو ہو۔ لڑکے والوں کی طرف سے مطالبہ ہو کہ ہمیں فلاں چاہیے، فلاں اور فلاں چیز چاہیے۔ اور لڑکی والے حیثیت سے بڑھ کر بارات کے کھانے کا اہتمام کریں، جہیز کا اہتمام کریں تو پھر یہ شرعی مقاصد کے خلاف ہے۔ اسراف اور تبذیر کا حساب ہوگا۔ لیکن جہاں معاملہ اعتدال پر ہو، میانہ روی پر ہو اور شرعی مقاصد کے تحت ہو، وہ ناجائز نہیں ہے۔

ایک رواج ہے لفافہ دینے کا۔ آپ شادی میں شریک ہوئے اور ساتھ لفافہ آپ نے دیا۔ کچھ لوگ اس کو بھی ناجائز کہتے ہیں۔ یہ کہاں سے ناجائز ہے؟ اگر معاشرے میں ایک چیز طے ہو چکی ہے کہ شادی بیاہ کے موقع پر خرچے ہوتے ہیں، چلو ایک باہمی

تعاون کی شکل بن جاتی ہے۔ آج میری شادی ہے، آپ نے لفافے مجھے دیے۔ کل آپ کی شادی ہوگی تو سارے مل کر لفافے آپ کو دیں گے۔ پرسوں فلاں کی ہوگی، سب مل کر اس فلاں کو دیں گے تاکہ اس وقت میں جہاں پر مصارف کی ضرورت ہے ایک تعاون کی شکل بن جائے۔ یہ کون سا ایسا معاملہ ہے جو شریعت کے خلاف ہے۔ ہرگز نہیں۔ اس میں کوئی خرابی نہیں ہے، دلھن کو تحفہ دے سکتے ہو۔ نقدی کی شکل میں دے سکتے ہو، کسی اور صورت میں دے سکتے ہیں۔ اور یہ تحفہ اور ہدیہ شریعت کے مقاصد کے ہرگز خلاف نہیں۔ اگر یہ طے شدہ ہے، یہ معاملہ بھی طے شدہ ہوتا ہے کہ آج ہم فلاں کو دے رہے ہیں، کل فلاں ہم کو دے گا۔ اس کے طے ہونے میں بھی کیا حرج ہے۔ آج فلاں کی ضرورت ہے، میں اس کے کام آتا ہوں، کل میری ضرورت ہے وہ میرے کام آجائیں گے۔ اس میں کون سی ایسی چیز ہے جو شریعت کے مقاصد کے خلاف ہے۔ تو یہ چیز غلط نہیں ہے، لیکن بعض اتنے خشک لوگ ہیں کہ اس کو حرام کہتے ہیں۔ بارات کے کھانے کو حرام کہتے ہیں۔ جہیز کو مطلقاً حرام کہتے ہیں۔ حرام ہوگا جب غلو اور اسراف کا پہلو آئے گا۔ لیکن اگر اعتدال کا پہلو ہو اور شریعت کے زیر سایہ کام ہو تو وہاں کوئی ایسا فساد نہیں ہے اور کوئی ایسا بگاڑ نہیں ہے۔

تو بہرکیف شادی بیاہ کا معاملہ، یہ خوشی کا ایک موقع بھی ہے۔ خاندانوں میں خوشی کے اہتمام کی اگر کوئی شکل ہو اور وہ دو چیزوں سے پاک ہو، وہ شکل شریعت کے خلاف نہ ہو، جیسے فوٹوگرافی۔ اور وہ شکل کسی مشرک اور کافر قوم کی مشابہت نہ ہو، جیسے مایوں اور مہندی کی رسم۔ اس میں ہندو مذہب بھی ہے اور مجوسیت بھی۔ یہ رسم بالکل باطل، ناجائز اور حرام ہے۔ لیکن کوئی خوشی کا ایسا اہتمام جو شریعت کے مقاصد کو نہ توڑتا

ہواور اس میں کسی غیر قوم سے مشابہت کا پہلو نہ ہو، وہ اپنے طور پر کیا جاسکتا ہے۔ اللہ کے پیارے پیغمبر ایک نکاح کی تقریب میں تھے۔ ایک بچی کا نکاح ہورہا تھا۔ اس نکاح میں آپ موجود تھے۔ اور کچھ انصاری بچیاں آپ کے سامنے گیت گارہی تھیں۔ آپ نے منع نہیں کیا۔ یہ خوشی کا اہتمام ہے۔ اور یہ بچیاں ایک پردے میں رہ کر اہتمام کررہی ہیں۔ اب وہ آواز باہر نہ جائے۔ دف پیٹو۔ نکاح کی تشہیر کرو۔ مگر بچیاں اگر گھر میں بیٹھ کر اچھے گیت گا رہی ہیں۔ اچھے اشعار پڑھ رہی ہیں اور آواز پردے کے اندر ہے، شریعت کے خلاف نہیں ہے۔ ہاں ایک بچی شعر پڑھتے پڑھتے یہ شعر پڑھ گئی: «وَفِينَا نَبِيٌّ يَعْلَمُ مَا فِي غَدٍ» اللہ کے پیغمبر لیٹے ہوئے تھے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ «لَا تَقُولِي هٰكَذَا، قُولِي مَا كُنْتِ تَقُولِينَ» [1] یہ مت کہو۔ اس نے کیا کہا؟ ہم میں ایک نبی ہے جو کل کی باتیں جانتا ہے، یعنی اللہ کے پیغمبر عالم الغیب ہیں۔ فرمایا: یہ مت کہو۔ جو پہلے کہہ رہی تھی وہ کہو۔ جو پہلے کہہ رہی تھی وہ کہو، یہ مت کہو۔ کیونکہ اللہ کے سوا غیب کوئی نہیں جانتا۔ یہ آپ نے اصلاح فرمائی۔ مطلب یہ کہ اشعار پڑھیں، لیکن اچھے اشعار پڑھیں جو عقیدے کے خلاف نہ ہوں۔ جس میں حیاسوز باتیں نہ ہوں۔ دین کی تعلیم ہو، جہادی نغمے پڑھے جاسکتے ہیں۔ یہ شرعی مقاصد کے خلاف نہیں ہیں۔ اچھے اشعار ہوں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ خوشی کا اہتمام ہوسکتا ہے۔ بس خوشی کا اہتمام شریعت کے خلاف اور شریعت کے منافی نہ ہو، اس میں کسی غیر قوم کی مشابہت نہ ہو۔ تو یہ معاملہ انتہائی نازک اور حساس ہے۔ ایک بنیاد قائم ہورہی ہے جو دو بچوں اور دو خاندانوں کے ملاپ سے ہے۔ اور یہ ملاپ بالکل شریعت کے زیرسایہ اور شریعت کے

[1] صحيح البخاري، حديث:4001.

تقاضوں کے مطابق ہو۔ اس میں شرعی انحراف نہ ہو۔ شریعت سے بغاوت نہ ہو۔ اللہ کے احکام کی، فرامین کی اور اس کے رسول کی سنتوں کی تکمیل اور تعمیل ہو تو پھر یہ نکاح برکت پر قائم ہوگا اور اللہ رب العزت اس کو مبارک کرے گا اور پھر برکات کا ظہور ہو سکتا ہے۔ جیسے جلیبیب رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے۔ مسند احمد کی حدیث ہے۔ جلیبیب رضی اللہ عنہ فقیر تھا، چھوٹے قد کا تھا۔ بچی نے قبول کرلیا۔ واقعہ طویل ہے۔ نکاح ہوگیا۔ حالانکہ وہ کم حیثیت تھا، غریب تھا۔ بچی نے قبول کرلیا کہ اس کو اللہ کو پیغمبر نے بھیجا ہے، نکاح ہوگیا۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جلیبیب ایک غزوے میں شہید ہوگیا اور شہید بھی اس شان سے ہوا کہ اس کے اردگرد سات مشرکین کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ ان سات کو مار کر شہید ہوا۔ اللہ اکبر۔ اس کو شہادت کی موت مل گئی۔ اور اس کی بیوی بیوہ ہوگئی۔ ایک شہید کی بیوہ۔ انس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ «فَلَقَدْ رَأَيْتُهَا وَ إِنَّهَا لَمِنْ أَنْفَقِ بَيْتٍ فِي الْمَدِينَةِ» [1] میں نے دیکھا جلیبیب کا گھرانہ مدینے میں سب سے زیادہ مال خرچ کرنے والا بن گیا، حالانکہ وہ فقیر تھا۔ مگر اس نیک بیوی کی صالحیت، اس کا تقویٰ کہ جلیبیب مالی اعتبار سے کہاں پہنچ گیا، مدینے میں سب سے زیادہ خرچ کرنے والا گھرانہ جلیبیب کا بن گیا۔ اللہ نے اتنا مال دیا۔ یہ اتباع کی اور اس نکاح کو قبول کرنے کی برکت ہے۔ یقیناً جب معاملہ دین کے ساتھ ہوگا، اللہ اور اس کے رسول کے امر کی اطاعت کے ساتھ ہوگا تو بابرکت ہوگا۔ لیکن اگر اس معاملے میں غیر شرعی امور ہوں۔ حرام امور کا ارتکاب ہو اور کفار کی رسوم کا اہتمام ہو، ان کی مشابہت ہو تو پھر قطعاً یہ معاملہ برکت پر ختم نہیں ہوگا۔ یہ اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی

[1] مسند أحمد:136/3.

خفیہ نکاح کی شرعی حیثیت

ہوگی ۔ اور نافرمانی ناجائز ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہر معاملے میں اپنے پیارے پیغمبر کی اتباع کی توفیق عطا فرمادے اور ہمیں کتاب وسنت کی پیروی کی توفیق عطا فرما دے۔ ہمیں غلو، اسراف اور اغیار کی مشابہت سے بچائے۔ اور ہم کو کتاب وسنت پر اور اس دین کی تعلیم پر قائم رکھے۔

«وَأَقُولُ قَوْلِي هٰذَا وَ أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِي وَلَكُمْ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ»

خفیہ نکاح کی شرعی حیثیت

خطبہ مسنونہ کے بعد:

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾

”سنو جو لوگ حکم رسول کی مخالفت کرتے ہیں، وہ اس (بات) سے ڈریں کہ انھیں (دنیا میں) کوئی آزمائش آپڑے یا انھیں (آخرت میں) دردناک عذاب پہنچے۔“[1]

وَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «أَعْلِنُوا هٰذَا النِّكَاحَ وَاجْعَلُوهُ فِي الْمَسَاجِدِ، وَاضْرِبُوا عَلَيْهِ بِالدُّفُوفِ»[2]

جناب صدر گرامی، علمائے کرام اور معزز سامعین حضرات! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جس موضوع پر گفتگو ہو رہی ہے اور گفتگو کا تسلسل ابھی جاری اور قائم ہے، وہ موضوع بخوبی آپ کے سامنے آ چکا ہے۔ جہاں تک خفیہ نکاح کا تعلق ہے، جو حدیث میں نے آپ کے سامنے پڑھی ہے اس کی ہر شق اس کی مخالف ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «أَعْلِنُوا هٰذَا النِّكَاحَ» اس نکاح کا خوب اعلان کرو۔ «وَاضْرِبُوا عَلَيْهِ بِالدُّفُوفِ»

[1] النور 24:63. [2] جامع الترمذي، حديث: 1089.

اور اس پر دف پیٹو۔ دف کا معنی یہ کہ اس طرح ایک مخصوص شور پیدا کیا جائے تاکہ دنیا سنے اور یہ جانے کہ یہاں نکاح ہو رہا ہے۔ اور فرمایا: «وَاجْعَلُوهُ فِي الْمَسَاجِدِ» اور نکاح کی مجلس مساجد میں منعقد کیا کرو۔ رسول اکرم ﷺ کا یہ فرمان بالکل واضح ہے اور یہ خفیہ نکاح، جس کی اساس محض جنسی تسکین ہی کہی جا سکتی ہے، اس حدیث کے مکمل طور پر مخالف ہے۔ میرے بھائیو! نکاح کوئی کھیل نہیں ہے۔ اس نکاح کی اساس محض جنسی تسکین کا حصول نہیں ہے بلکہ یہ ایک بڑی اہم ذمہ داری ہے جو عورت پر قطعاً موقوف نہیں کی جا سکتی۔ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی۔ اللہ کے پیغمبر ﷺ نے اس کی بات سنی، تعاون کیا، پھر اس سے پوچھا: «أَذَاتُ زَوْجٍ أَنْتِ» کیا تم شوہر والی ہو۔ تمھاری شادی ہو چکی ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «فَانْظُرِي أَيْنَ أَنْتِ مِنْهُ، فَإِنَّمَا هُوَ جَنَّتُكِ وَنَارُكِ» ”اچھی طرح دیکھنا، تمھارا شوہر ہی تمھارے لیے جنت اور وہی تمھارے لیے جہنم ہے۔“[1] یہ شادی کا معاملہ گویا جنت اور جہنم کا معاملہ ہے۔ گویا اس پر عاقبت کا انحصار ہے۔ اتنا اہم معاملہ اس کے سپرد کر دیا جائے جسے شریعت نے ناقص العقل کہا ہے، یہ قرآن وحدیث کے مقاصد کے خلاف ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے: «مَا رَأَيْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَدِينٍ» اس فرمان میں آپ ﷺ نے عورتوں کو ناقص العقل کہا، ناقص الدین کہا۔ اور ناقص الدین ہونے کی دلیل یہ پیش کی کہ جب ان کے مخصوص ایام ہوتے ہیں، یہ نماز نہیں پڑھ سکتیں اور روزے نہیں رکھ سکتیں۔ اور ناقص العقل ہونے کی دلیل یہ پیش کی کہ قرآن حکیم یہ کہتا ہے کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے۔[2] اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس

[1] موطأ للإمام مالك: 951. [2] صحيح البخاري، حديث: 304.

نقص کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے عورت کو بہت چھوٹ دی اور اس کے بہت سے معمولی کاموں پر بڑی بڑی بشارتیں دے دیں کیونکہ عورت اپنے اس نقص کی بنا پر اسی چیز کی مستحق ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت کے حصول کے لیے جو طرق اور راستے ایک مرد کے لیے تیار کیے گئے ہیں عورتوں کے لیے اس سے بہت کم ہیں۔

دیکھیں رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِذَا صَلَّتِ الْمَرْأَةُ خَمْسَهَا، وَصَامَتْ شَهْرَهَا، وَحَفِظَتْ فَرْجَهَا وَأَطَاعَتْ زَوْجَهَا، قِيلَ لَهَا: ادْخُلِي الْجَنَّةَ مِنْ أَيِّ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ شِئْتِ»

عورت اگر پانچ نمازیں ہی پڑھ لے، رمضان کے روزے رکھ لے، اپنی عزت کی حفاظت کرلے اور اپنے شوہر کی فرمانبرداری کرلے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دے گا اور فرمائے گا: جہاں سے چاہو داخل ہو جاؤ۔ [1]

جبکہ یہی سوال ایک دفعہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اللہ کے پیغمبر ﷺ سے کیا: کوئی ایسا شخص ہے جس کے لیے جنت کے تمام دروازے کھول دیے جائیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایسے ہوں گے۔ «أَرْجُو أَنْ تَكُونَ مِنْهُمْ» اے ابوبکر! مجھے امید ہے تم بھی انھی میں سے ہوگے۔ [2] یقین کے ساتھ نہیں فرمایا۔ امید ہے، حالانکہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اللہ کے پیغمبر کے سفر وحضر کے ساتھی ہیں، کسی غزوے میں پیچھے نہیں رہے، ہر جہاد میں آپ کے ساتھ تھے۔ آپ کا مال دین کے بہت کام آیا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: جو فائدہ مجھے ابوبکر کے مال نے پہنچایا ہے کسی اور کے مال نے نہیں پہنچایا۔ یہاں تک فرمایا کہ جس نے بھی مجھ پر احسان کیا اس کا بدلہ میں نے چکا دیا لیکن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

[1] مسند أحمد: 191/1. [2] سنن النسائي، حديث: 2441.

کے احسانات کا بدلہ میں نہیں چکا سکا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن چکائے گا۔ [1] اتنی عظیم شخصیت ہے، خلیفۂ راشد ہیں، مسیلمہ کذاب کی کمر توڑنے والے اور اس جھوٹے مدعی کی بیخ کنی کرنے والے لیکن رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «أَرْجُو أَنْ تَكُونَ مِنْهُمْ» [2] مجھے امید ہے کہ تم انھی میں سے ہوگے جن کے لیے قیامت کے روز تمام دروازے کھول دیے جائیں گے۔ لیکن اس عورت ذات کے لیے فرمایا جو یہ چار کام کرلے: پانچوں وقت کی نماز کی پابندی کرے، رمضان کے روزے رکھے، اپنے شوہر کی فرمانبرداری کرے اور اپنی عزت کی حفاظت کرے تو اس کے لیے جنت کے تمام دروازے کھول دیے جائیں گے، رسول اللہ ﷺ کی طرف سے یقینی امر ہے اور یقینی خبر ہے۔ اس کا معنی اور اس کی اساس یہی ہے کہ عورت ایک ضعیف مخلوق ہے اور اس کے دین اور اس کی عقل میں نقص ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«كَمُلَ مِنَ الرِّجَالِ كَثِيرٌ وَّلَمْ يَكْمُلْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا آسِيَةُ امْرَأَةُ فِرْعَوْنَ، وَمَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ»

’’بہت سے مرد کامل ہوئے لیکن عورتوں میں فرعون کی بیوی آسیہ اور مریم بنت عمران ہی کامل ہوئی ہیں۔‘‘ [3]

معنی یہ کہ ان کی عقل میں اور دین میں نقص ہے۔ شریعت نے اس نقص کی بنا پر چھوٹے سے عمل پر بھی بڑی پذیرائی کی ہے اور ان کو بڑے اجر سے نوازا ہے۔ ایک دفعہ

[1] جامع الترمذي، حديث: 3661. [2] صحيح البخاري، حديث: 1897. [3] صحيح البخاري، حديث: 3411.

ایک عورت نے اپنے بھوکے بچے کو اپنے حصے کی بھی کھجوریں دے دیں اور عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ امر پیغمبر ﷺ سے بیان کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ان عورتوں کا کیا کہنا: «حامِلاتٌ وَالِداتٌ مُرْضِعاتٌ، رَحِيماتٌ بِأَوْلادِهِنَّ، لَوْلا ما يَأْتِينَ إِلَى أَزْواجِهِنَّ لَدَخلَ مُصَلِّياتُهُنَّ الْجَنَّةَ» یہ عورتیں اپنے بچوں سے شفقت کرنے والی، حمل کی تکلیفیں برداشت کرنے والی، بچہ پیدا کرنے کی تکلیفیں برداشت کرنے والی، اپنے بچوں کو دودھ پلانے کی تکلیفیں برداشت کرنے والی اگر اس عورت میں ایک کمی نہ ہو کہ اپنے شوہروں کی نافرمانی نہ کریں تو نمازی عورت جنت کے علاوہ کہیں جا ہی نہیں سکتی۔'' [1] یعنی اتنی بڑی خوشخبری کس لیے دی گئی؟ معنی کہ عورت کا یہی کام بہت بڑا ہے۔ خواتین نے اللہ کے پیغمبر ﷺ سے پوچھا: ہم پر جہاد فرض ہے؟ فرمایا کہ «جِهادُ كُنَّ الْحَجُّ» تم حج ہی کر آؤ تو یہی تمھارا جہاد ہے۔ [2] اللہ کے پیغمبر ﷺ سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: جنت کا دروازہ سب سے پہلے کون کھولے گا، سب سے پہلے کون جائے گا؟ فرمایا: ''میں جاؤں گا لیکن یہ عجیب بات ہوگی کہ جب میں جنت کی طرف جا رہا ہوں گا تو اپنے سے پہلے جنت کے دروازے پر ایک خاتون کو پاؤں گا جو اپنے ہاتھوں سے دستک دے رہی ہے اور شور کر رہی ہے کہ دروازہ کھولا جائے مجھے داخل ہونا ہے۔ میں پوچھوں گا کہ یہ عورت کون ہے؟ تو جبریل علیہ السلام بتائیں گے: یہ وہ عورت ہے جس کا شوہر جوانی ہی میں داغ مفارقت دے گیا اور اس نے اپنی جوانی اپنے بچوں کی تربیت پہ قربان کر دی، ان پر صبر کیا، لہٰذا اللہ نے اس کو یہ اعزاز دیا۔'' [3]

[1] المعجم الكبير للطبراني: 7913. [2] صحيح البخاري، حديث: 2875. [3] مسند أبي يعلى: 6651، وتحفة الأحوذي: 141/5.

معنی یہ کہ عورت کا یہ کام بھی بہت عظیم ہے۔ اس کی اساس یہی ہے۔ میں نے بات کچھ طویل کر دی کہ عورت، اللہ نے اس کو اتنی پذیرائی دی، اتنا اس کو اجر دیا انتہائی چھوٹے سے کام پر بھی، انتہائی چھوٹے چھوٹے امور پر بھی، اس لیے کہ جو نقص ان کے دین اور ان کی عقل میں موجود ہے، فطری طور پر اس کا تقاضا یہی ہے کہ عورت کو چھوٹے کام پر بھی بڑا اجر دیا جائے اور اس کو بڑی پذیرائی کا مستحق قرار دیا جائے۔

میرے دوستو اور بھائیو! جب یہ اساس ایک عورت کی ہے تو اتنے اہم کام کو اس کے ہاتھوں نہیں دیا جا سکتا کیونکہ شوہر کا انتخاب اور شادی کا مسئلہ کھیل نہیں ہے۔ اگر جنسی تسکین ذہن میں ہو تو الگ مسئلہ ہے لیکن اگر صحیح معنی میں اسلامی ازدواج کے مقاصد کو پہچانا جائے اور اسلامی رہنمائی سامنے ہو تو یہ بہت بڑی بات ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے عورت! تمھارا شوہر تمھارے لیے جنت بھی ہے اور جہنم بھی۔ تو اتنا حساس مسئلہ ایک عورت کے سپرد کر دیا جائے کہ اپنی مرضی سے وہ اپنا نکاح کر لے۔ یہ مسئلہ شریعت کے مقاصد کے بالکل خلاف ہے۔ باقی اس بارے میں مخصوص دلائل قرآن و حدیث میں موجود ہیں۔ اللہ کے پیغمبر ﷺ کے فرامین اور قرآنی آیات آپ نے میرے بھائیوں اور دوستوں سے سنی ہیں۔ سنن الکبریٰ بیہقی میں ایک روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «لَا تُنْكِحُ الْمَرْأَةُ الْمَرْأَةَ» اور ایک روایت میں ہے: «لَا تُزَوِّجُ الْمَرْأَةُ الْمَرْأَةَ وَلَا تُزَوِّجُ نَفْسَهَا» کوئی عورت کسی عورت کی شادی نہیں کر سکتی، یعنی عورت ولی بننے کے قابل نہیں اور ایک عورت اپنی شادی نہیں کر سکتی۔ اور اگلا حصہ قابل غور ہے جس کے بارے میں تھوڑا سا اختلاف نقل کیا ہے اور محدثین بالخصوص امام بیہقی رحمہ اللہ یہ فرماتے ہیں کہ اس کے مرفوع اور موقوف ہونے میں

اختلاف ہے لیکن اس کی سند صحیح ہے۔ ابن حجر ﷫ فرماتے ہیں کہ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ اور بہت سے محدثین سے اس کی توثیق مروی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی عورت اپنا نکاح خود کر لے «فَإِنَّ الزَّانِيَةَ هِيَ الَّتِي تُزَوِّجُ نَفْسَهَا» اگر وہ اپنا نکاح خود کر لے تو وہ عورت زانیہ ہے، وہ زنا کر رہی ہے۔ یہ سنن الکبریٰ بیہقی کی روایت ہے۔ [1]

تمام راوی ثقہ ہیں۔ لیکن جو ایک اختلاف ہے، وہ صرف مرفوع اور موقوف ہونے پر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کو ہم موقوف تسلیم کر لیتے ہیں لیکن اگر موقوف مان لیں، پھر بھی یہ حکماً مرفوع ہے، اس لیے کہ ایسا حکم ایک صحابی اپنی رائے اور اپنی عقل سے پیش نہیں کر سکتا۔ اور صحابۂ کرام ﷢ کے دور میں یہ ایک اجماعی تصور موجود تھا۔
ابو ہریرہ ﷜ فرماتے ہیں: «كُنَّا نَقُولُ: الْمَرْأَةُ إِذَا زَوَّجَتْ نَفْسَهَا فَهِيَ الزَّانِيَةُ» ہم یہ کہا کرتے تھے۔ آپ محدثین علمائے اصول کی نقول پڑھیں تو یہ بات آپ پر واضح ہوگی کہ صحابہ کا یہ کہنا کہ ہم یہ کہا کرتے تھے۔ اس جملے کے معنی یہ ہیں کہ اس مسئلے پر تمام صحابہ کا اتفاق ہے۔ وہ اجماعی مسئلہ ہے۔ ہم یہ کہا کرتے تھے، کیا؟ کہ عورت اگر خود اپنا نکاح کر لے تو زانیہ ہے۔ [2] گویا کہ اس پر صحابہ کرام کا اجماع ہے۔
امام نووی ﷫ نے "المجموع شرح المہذب" میں بہت سے صحابہ کا مذہب یہی نقل کیا ہے۔
امیر المؤمنین عمر، امیر المومنین علی، ابن عباس، ابن عمر اور پھر ابو ہریرہ ﷢، عائشہ ﷝ ان تمام کا یہ مذہب نقل کیا گیا ہے کہ عورت ولی کے بغیر نکاح نہیں کر سکتی۔ اور اگر ولی کے بغیر نکاح کرے گی تو نکاح باطل ہوگا۔ بلکہ ابن منذر کا قول امام نووی نے پیش کیا ہے: وہ فرماتے ہیں کہ میں نے بڑی تحقیق کی ہے اور امام نووی نے شرح المہذب ہی

[1] السنن الكبرىٰ للبيهقي: 15005. [2] السنن الكبرىٰ للبيهقي: 13429.

میں امیر عمر ﷜ کے دور امارت کا ایک چھوٹا سا واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک مقام پر دو قافلے جمع ہو گئے، ایک قافلے کی ایک خاتون نے اپنے ولی کو چھوڑ کر اپنا معاملہ کسی اور شخص کے سپرد کر دیا کہ تم میرا کہیں نکاح کر دو۔ اس شخص نے اس کا نکاح کر دیا۔
جب امیر عمر ﷜ کو یہ معلوم ہوا تو آپ ﷜ نے ان سب کو بلا لیا اور نکاح کرنے والے کو اور نکاح کرانے والے کو آپ نے کوڑوں کی سزا دی اور نکاح کو فسخ کر دیا کہ یہ نکاح باطل ہے۔ اور اس کی اساس یہی پیش کی کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:
«أَيُّمَا امْرَأَةٍ نُكِحَتْ بِغَيْرِ إِذْنِ مَوَالِيهَا فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ، فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ، فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ» جو عورت ولی کے اذن کے بغیر نکاح کرے گی اس کا نکاح باطل ہے۔ [1] لہٰذا اللہ کے پیغمبر ﷺ کے اس فرمان کے بموجب فرمایا: اس نکاح کو ہم باطل کریں گے۔ نکاح کرنے والے کو اور ولایت کا حق ادا کرنے والے کو، دونوں کو آپ نے کوڑے مارے۔ یہ واقعہ شرح المہذب میں موجود ہے۔
اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ صحابہ کرام ﷢ اس بات پر متفق تھے کہ ایسا نکاح نہیں ہوتا۔ صحابہ کرام اس کو زنا سمجھتے تھے۔ لہٰذا میرے دوستو اور بھائیو! یہ جو سلسلہ گاہے بہ گاہے ہوتا ہے، یہ شریعت کے خلاف ہے اور ایسا نکاح قطعاً قابل قبول نہیں ہے۔ اور میں یہ عرض کروں گا کہ وہ دن سیاہ ترین دن ہوتا ہے جس دن ہماری عدلیہ یا ہماری عدالت کسی ایسے فیصلے کو، کسی ایسے نکاح کو جاری کرتی ہے یا اس کو قائم رکھتی ہے کیونکہ یہ فیصلہ صراحتاً قرآن و حدیث کے خلاف ہے، لہٰذا ہم خاص طور پر یہ گزارش کریں گے، جو قضا کا محکمہ ہے اس کو بڑا احتیاط ہونا چاہیے، کوئی فیصلہ قرآن و حدیث کے خلاف نہ کیا جائے۔

[1] سنن أبي داود، حديث: 2083.

یہ سب سے حساس محکمہ ہے اور اس کی ذمہ داری سب سے اہم ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «مَنْ وَّلِيَ الْقَضَاءَ فَكَأَنَّمَا ذُبِحَ بِغَيْرِ سِكِّينٍ» جو شخص منصب قضا پر فائز ہوتا ہے وہ شخص کند چھری کے ساتھ ذبح کیا جا رہا ہے۔[1] کند چھری اس لیے فرمایا کہ نہ کند چھری اس کے گلے کو کاٹے گی اور نہ اس کی جان چھوٹے گی۔ جب تک وہ محکمہ قضا پر فائز رہے گا وہ کند چھری اس کی گردن پر چلتی رہے گی۔ یہ اسی لیے فرمایا کہ فیصلے کرنا کا مسئلہ بڑا حساس ہے، اللہ کے پیغمبر ﷺ کا فرمان ہے:

«اَلْقُضَاةُ ثَلَاثَةٌ» دنیا کے جو قاضی ہیں وہ تین قسم کے ہیں۔ فرمایا کہ «قَاضٍ فِي الْجَنَّةِ» صرف ایک قسم کے قاضی جنت میں جائیں گے۔ «وَقَاضِيَانِ فِي النَّارِ» دو قسم کے قاضی جہنم میں جائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «قَاضٍ عَرَفَ الْحَقَّ قَضٰى بِهٖ فَهُوَ فِي الْجَنَّةِ» جو قاضی حق کو پہچان لے، حق کا معنی یہ کہ قرآن وحدیث کی دلیل کو پہچان لے، جو قضیہ یا کیس پیش ہو، قاضی قرآن وحدیث کی دلیل کو پہچان لے۔ اس کے مطابق فیصلہ کر دے «فَهُوَ فِي الْجَنَّةِ» جنت میں داخل ہوگا اور وہ دو قاضی جو جہنم میں جائیں گے، ان میں سے ایک وہ ہے جو حق کو پہچانے بغیر، قرآن وحدیث کی دلیل کے بغیر فیصلہ کر دے، چاہے وہ کسی کی رائے پر ہو، کسی کی بات پر ہو، کسی کے قول وقرار پر ہو۔ اور دوسرے قسم کا قاضی جو جہنم میں جائے گا، وہ ہے جو حق کو پہچان لے، حدیث اس کے سامنے موجود ہے، قرآن اس کے سامنے موجود ہے۔ لیکن «جَارَ فِي الْحُكْمِ» فیصلہ قرآن وحدیث کے خلاف کرتا ہے کہ ایسا ہمارے معاشرے میں نہیں ہے، ایسا ہمارے قانون میں نہیں ہے، ایسا فلاں نے نہیں کہا۔ کسی

[1] مصنف ابن أبي شيبة: 23434.

بھی بنیاد پر قرآن وحدیث کے خلاف فیصلہ کرتا ہے تو فرمایا کہ ایسا قاضی بھی جہنم میں جائے گا۔[1] اسی لیے پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کا فرمان ہے: قیامت کے دن قاضیوں کا حساب دو طریقے سے ہوگا، کچھ وہ قاضی ہوں گے جن کا حساب اللہ یوں لے گا کہ ان کو نور کے منبر پر بٹھا کر اپنے سامنے حساب لے گا۔ کچھ قاضی وہ ہوں گے جنھیں جہنم کے اوپر پل صراط پر بٹھا کر حساب لے گا۔[2]

اس لیے کہ مسئلہ بڑا حساس ہے، لہٰذا یہ میں عرض کروں کہ قرآن وحدیث کے دلائل ہمارے سامنے آ گئے، صحابہ کا اجماع ہمارے سامنے آ گیا، اس مسئلے کا شرعی حکم ہمارے سامنے آ گیا، پھر بھی اس کے خلاف فیصلہ ہو تو وہ دن سیاہ ترین دن ہوگا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ہم جو اقتصادی میدان میں ترقی نہیں کر رہے، ہمیشہ پیچھے سے پیچھے ہٹتے جا رہے ہیں، اس کی بنیاد یہی ہے، اس لیے کہ اقتصادیات کا استحکام شریعت کے نفاذ پر ہے، یعنی قرآن وحدیث کے نفاذ پر ہے نہ کہ کسی کی کاوش پر۔ بلکہ ہم سیدھا سادھا قرآن وحدیث کے نظام کو نافذ کر دیں تو اللہ ہمیں مالا مال کر دے گا۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «وَمَا حَكَمُوْا بِغَيْرِ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ إِلَّا فَشَا فِيهِمُ الْفَقْرُ» جو قوم اللہ کی نازل کردہ شریعت سے ہٹ کر فیصلہ کرے گی، قرآن و حدیث سے ہٹ کر فیصلہ کرے گی، اللہ اس قوم کو فقیر کر دے گا۔[3] رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «حَدٌّ يُّقَامُ فِي الْأَرْضِ خَيْرٌ مِّنْ أَنْ تُمْطَرَ أَرْبَعِينَ صَبَاحًا» اللہ کا ایک فیصلہ، ایک قانون اس زمین پر قائم کر دیا جائے وہ اس سے بہتر ہے کہ پوری زمین

[1] السنن الكبرى للبيهقي: 20852. [2] صحيح مسلم، حديث: 1827، والمنتخب من مسند عبد بن حميد: 430. [3] المعجم الكبير للطبراني: 10992.

پر چالیس دن تک رحمت کی بارش برستی رہے۔[1] اس کے نتیجے میں کیسے کیسے باغات اگیں گے، کیسے کیسے خزانے زمین اگلے گی۔ فرمایا کہ اس سے بھی بڑھ کر اللہ تعالیٰ اس قوم کو نواز دے گا۔ ہماری فلاح کا راستہ قرآن و حدیث کا راستہ ہے۔ نہ کہ قرآن و حدیث سے ہٹ کر کسی کے قول اور کسی کی رائے کا راستہ۔

وَأَقُولُ قَوْلِي هٰذَا وَ أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِي وَلَكُمْ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

[1] شعب الإيمان:7381.

اسلام کے خواتین پر احسانات

اسلام کے خواتین پر احسانات

خطبہ مسنونہ:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا﴾ [1]

قابل قدر سامعین حضرات! اللہ رب العزت نے نوع انسانیت کو عزت اور تکریم دی ہے۔ فرمایا کہ ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ﴾ [2] کہ ہم نے اولاد آدم کو تکریم سے نوازا ہے اور عزت عطا فرمائی ہے۔ تکریم کی دو قسمیں ہیں: ایک عمومی تکریم جو سب کو حاصل ہے۔ مسلمان ہوں، کافر ہوں، اللہ تعالیٰ نے سب کو ایک جیسا بنایا۔ اور خوبصورت چہرے عطا فرمائے۔ ایک اچھی خلقت دی: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾ [3] یہ سارے انسانوں کا ذکر ہے۔ اور یہ عمومی تکریم ہے کہ باعتبار خلقت انسانوں کو بقیہ کائنات پر فضیلت دی اور عزت وتکریم دی۔ ایک خصوصی تکریم ہے، وہ تکریم ایمان کی ہے،

[1] النسآء 1:4. [2] بني إسرآء يل 70:17. [3] التين 4:95.

عقیدے اور تقویٰ کی ہے۔ فرمایا کہ ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ﴾ [1] اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم سب میں اکرم، عزت اور تکریم کا مستحق وہ شخص ہے جو بڑا متقی اور زیادہ پرہیزگار ہے۔ یہ تکریم کی دو قسمیں ہوگئیں: عمومی اور خصوصی۔ عمومی تکریم سب کے لیے ہے اور پوری نوع انسانیت کے لیے ہے، جبکہ خصوصی تکریم کا تعلق اہل تقویٰ، اہل ایمان اور اہل توحید کے ساتھ ہے۔ ان کو اللہ رب العزت نے خاص تکریم عطا فرمائی۔ اور پھر خواتین اس تکریم سے الگ نہیں ہیں۔ یہ مردوں کی شقائق ہیں۔ یہ شقائق ہونا بہت بڑی عزت ہے۔ یوں سمجھیں کہ کسی چیز کو کسی چیز سے نکالا جائے۔ یہ شقائق ہیں، یعنی مردوں کی مثل ہیں۔ مردوں میں سے نکلی ہوئی ہیں اور مردوں کی مثل ہیں۔ احکام میں، احکام شریعت میں اور دیگر سارے امور میں الا یہ کہ شریعت مرد وعورت کے مابین کسی امر میں فرق رکھے۔ وہ فرق حکمت سے خالی نہیں ہوگا۔ لیکن یہ ایک حدیث بہت بڑی دلیل ہے کہ اسلام نے عورت کو کیا مقام دیا؟ مردوں کے امثال اور شقائق قرار دیا۔ یہاں لفظ مثل بھی استعمال ہوسکتا تھا۔ اس کو ایک اور مثال سے سمجھیں۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی حدیث ہے کہ صلہ رحمی کی بڑی اہمیت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ لفظ رحم: ر۔ح۔م، اپنے نام رحمان سے نکالا ہے، یہ لفظ رحم اللہ رب العزت کے نام رحمٰن و رحیم سے نکلا ہے۔ کیونکہ رحمٰن و رحیم کا مادہ بھی ر۔ح۔م ہے۔ یہ صلہ رحمی رشتوں کو جوڑنا، اس کا مادہ بھی ر۔ح۔م ہے۔ اس لحاظ سے یہ اشتقاق اللہ تعالیٰ کے نام سے ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کے نام سے اس کا مشتق ہونا، ایک بڑی عظمت کا حامل ہے۔ اسی لیے قیامت کے دن صلہ رحمی اللہ تعالیٰ کے بہت قریب ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ سے مسلسل یہ

[1] الحجرات 13:49.

کہتی رہے گی: «اَللّٰھُمَّ صِلْ مَنْ وَّصَلَنِي وَاقْطَعْ مَنْ قَطَعَنِي» یااللہ! جس نے دنیا میں مجھے جوڑا اسے تو بھی اپنے ساتھ جوڑ لے اور جس نے مجھ کو توڑا اس کو تو بھی توڑ دے۔[1] یہ اس کی ایک مستقل فریاد ہوگی۔ تو اس سے صلہ رحمی کی اہمیت اور اس کی عظمت واضح ہوتی ہے کہ اللہ رب العزت نے یہ نام اپنے نام سے نکالا ہے۔ تو عورتوں کو مردوں کا شقائق کہا گیا ہے۔ شقائق ہونے کے کئی معانی ہیں۔ بمعنی مثل بھی ہے اور بمعنی اشتقاق بھی ہے کہ یہ عورتیں مردوں میں سے نکلی ہیں۔ اور یہ حقیقت خود قرآن نے پیش کی: ﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً﴾[2] کہ اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔ یہ ایک جان آدم علیہ السلام ہیں۔ ﴿وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾ پھر اس ایک جان سے ان کی بیوی نکالی۔ ان کی بیوی اسی ایک جان سے نکلی۔ ایک جان سے پیدا ہوئی۔ اس کی تفصیل ایک اور حدیث میں ہے کہ «إِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ»[3] عورت کی خلقت پسلی سے ہوئی ہے۔ تو علماء نے اس حدیث کو اس آیت سے منسلک کیا ہے، ﴿خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾ کہ اللہ رب العزت نے آدم علیہ السلام سے ان کی بیوی کو پیدا کیا، یعنی آدم علیہ السلام کی پسلی سے جو دل کے ساتھ ہے۔ دل سے کیوں نہیں؟ پسلی میں ایک حکمت ہے۔ اس میں تھوڑی سی کجی ہے۔ پسلی میں تھوڑا سا ٹیڑھ پن ہوتا ہے۔ اور اسی ٹیڑھ پن کے ساتھ ہی اتنا کام کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک عورت کے بارے میں مرد کو تنبیہ کی اور یہ نصیحت دی کہ تم عورت کو اس کی اصل خلقت کے اعتبار سے دیکھنا۔

[1] المعجم الأوسط للطبراني، حديث:3321. [2] النسآء 4:1. [3] صحيح البخاري، حديث: 3331، و صحيح مسلم، قبل حديث:1468.

یہ پسلی سے پیدا ہوئی ہے، اس میں تھوڑی سی کجی ہے۔ تو عورت کے اخلاق میں بھی کہیں نہ کہیں، اس کے رویے میں کہیں نہ کہیں تھوڑی بہت کجی ہو سکتی ہے، تم نے اس کجی کے ساتھ گزارا کرنا ہے۔ فرمایا کہ عورت کا ایک خلق اگر تمھیں ناپسند ہے تو سیکڑوں پسند بھی ہوں گے۔ اس پسلی کو سیدھا کرنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ ٹوٹ جائے گی۔ اس کجی کے ساتھ ہی گزارا کرنا۔ یہ تکریم ہے، یعنی شریعت عورت کو کہاں بٹھاتی ہے۔ ورنہ دورِ جاہلیت اور یہ یورپین کلچر تو عورت کو انسان تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں: عورت میں روح ہے مگر وہ حیوانی روح ہے۔ اس لیے عورت کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کرو۔ تو وہ ہو رہا ہے۔ عورت کے اندر روح ہے اور وہ جانوروں جیسی روح ہے۔ کتوں اور خنزیروں جیسی۔ اس کے ساتھ وہی گھٹیا سلوک کرو۔ اور وہ ہو رہا ہے جس کے مظاہر ہم سنتے رہتے ہیں، پڑھتے رہتے ہیں اور دیکھتے رہتے ہیں۔ مہذب الفاظ میں آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یورپ میں ہزاروں ایسے بچے ہیں جن کے ماں باپ کا علم ہی نہیں۔ وہ کھیل جو جانور سڑکوں پر کھیلتے ہیں ویسا ہی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ کیا اس میں تکریم ہے؟ یہ تکریم اسلام نے دی ہے۔ عورت کو شقائق الرجال کہا ہے کہ یہ مردوں جیسی ہے، مرد سے نکلی ہے۔ مرد کی پسلی سے اس کو بنایا گیا جو دل کے قریب ہے۔ یہ شفقت اور محبت کی چیز ہے، احترام کی چیز ہے۔ جاہلیت کے دور میں بچی کی پیدائش کو موجب ملامت ٹھہرایا جاتا اور باعثِ ذلت سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے بچیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دیتے تھے۔ بلکہ بعض گھروں میں جب ولادت کا وقت آتا تو عورت کو گھر سے نکال دیا جاتا کہ گاؤں کے کنویں کی منڈھیر پر چلی جا۔ تو جو بچہ پیدا ہوگا اس کو دیکھا جائے۔ اگر وہ لڑکا ہے تو دایہ کو حکم ہوتا کہ اس کو عزت سے لے آؤ، لڑکی

ہے تو کنویں میں پھینک دو۔ وہ ایک سانس لینے کے بھی قابل نہیں۔ وہ اس گھر کی چار دیواری کے بھی قابل نہیں۔ ولادت بھی کنویں کی منڈھیر پر ہو۔ اور بعض خاندانوں میں، گھروں میں ولادت ہوتی اور کچھ عرصہ بچی کو رکھا جاتا اور پھر اس کو تیار کر کے، سجا کر باپ کسی بہانے اپنے ساتھ لے جاتا، اپنے ہاتھ سے قبر کھودتا اور اس کو زندہ قبر میں گاڑ دیتا۔ کوئی تکریم نہیں تھی۔ جب کسی شخص کو خبر دی جاتی کہ آپ کے ہاں بچی کی ولادت ہوئی ہے تو ﴿ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝﴾ [1] قرآن کہتا ہے کہ ان کے چہروں پر اس خبر کو سن کر کالک چھا جاتی۔ انتہائی ناراض ہوتے، انتہائی خجالت محسوس کرتے اور پھر سوچتے اب اس بچی کے ساتھ کیا سلوک کریں۔ ﴿اَيُمْسِكُهٗ عَلٰي هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ﴾ [2] کہ اس کو ذلت کے ساتھ زندہ رکھیں، ذلت اپنی بھی اور اس کی بھی، اپنی ذلت کیا؟ لوگوں کے طعنے، لوگوں کی ملامتیں کہ تمھارے گھر بیٹی ہے۔ اس کی ذلت کیا ہے؟ اس کی کوئی تکریم نہیں، اس کی اہانت ہی اہانت، اس کو نوکروں سے، جانوروں سے بدتر بنا کے رکھنا، مخصوص ایام میں بالکل جانوروں کے ڈربے میں داخل کر دینا۔ برتنوں کو چھو نہیں سکتی، ساتھ کھا پی نہیں سکتی۔ تو کیا ایک عورت کی تکریم تھی! ہاں شریعت اسلامیہ نے کفار کی اس عادتِ بد کو للکارا: ﴿وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُىِٕلَتْ ۝ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝﴾ [3] کہ ایک حشر کا دن قائم ہونے والا ہے جب اللہ رب العزت زندہ درگور کرنے والے اور جسے زندہ درگور کیا گیا دونوں کو سامنے کھڑا کرے گا۔ زندہ درگور کرنے والے سے پوچھا جائے گا: تو نے کس گناہ کی پاداش میں اس کو قتل کیا اور زندہ قبر میں گاڑ دیا۔ بچی سے پوچھا جائے گا: تمھارا کیا قصور تھا کہ تمھیں

[1] النحل 16:58. [2] النحل 16:59. [3] التکویر 81:8، 9.

پیدا ہوتے ہی قبر میں گاڑ دیا گیا؟ کس گناہ کے تحت؟ کیونکہ جو خون کا معاملہ ہے خواہ وہ حق ہو یا ناحق، پیش ہوگا۔ نبی ﷺ کی حدیث ہے: «أَوَّلُ مَا يُقْضَى بَيْنَ النَّاسِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِي الدِّمَاءِ» [1] قیامت کے دن سب سے پہلے حقوق میں سے خون کے تصفیے ہوں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث صحیح بخاری میں ہے: «أَنَا أَوَّلُ مَنْ يَجْثُو بَيْنَ يَدَيِ الرَّحْمٰنِ لِلْخُصُومَةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» [2] میں قیامت کے دن وہ پہلا شخص ہوں گا جو رحمان کے سامنے بیٹھوں گا ایک جھگڑے کے تعلق سے، ایک خون کے تعلق سے۔ سب سے پہلے اس امت میں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے دو زانو ہو کر کسی خون کا حساب میں نے دینا ہے۔ یہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ امیر المومنین کا فرمان ہے۔ وجہ کیا تھی؟ وجہ یہ تھی کہ اسلام کا پہلا قتل ان کی تلوار سے ہوا۔ معرکۂ بدر میں جب دونوں صفیں آمنے سامنے آگئیں تو کفار کی صف میں سے تین دشمن نکلے۔ ان کو وقت سے پہلے قتل ہونے کا شوق تھا۔ انھوں نے مبارزت کی، چیلنج کیا، ہم سے کوئی بھی لڑ لے۔ قصہ طویل ہے۔ تو ان تین شخصوں کی عمر کے تناسب سے اسلامی لشکر سے تین شخص نکلے۔ ان میں ایک ولید بن عتبہ تھا۔ انتہائی نوجوان، بڑی اس کی ہیبت، اس کے مقابلے میں امیر المومنین علی بن ابی طالب حیدر کرار رضی اللہ عنہ نکلے۔ اس کو بڑا زعم تھا، بڑا اتراتا تھا، مگر ان کا ایک وار نہ سہہ سکا اور جہنم واصل ہوگیا۔ یہ پہلا قتل راہ حق میں ہوا، مگر اللہ تعالیٰ اس کو بھی نہیں چھوڑے گا۔ علی اور ولید بن عتبہ دونوں کو اللہ تعالیٰ بلائے گا۔ اور یہ پہلا جھگڑا ہے، اس امت میں بہنے والا پہلا خون ہے۔ اللہ تعالیٰ نے علی رضی اللہ عنہ سے پوچھنا ہے: تم نے اس کو کیوں قتل کیا؟ مقتول سے پوچھنا ہے: تم کیوں قتل ہوئے؟

[1] صحيح مسلم، حديث: 1678. [2] صحيح البخاري، حديث: 3965.

پھر یہ سارے معاملے کھلیں گے۔ اللہ تعالیٰ یہ سننا پسند کرتا ہے۔ تیری راہ میں جہاد کرتے ہوئے قتل کیا۔ پھر کتنی تکریم دے گا، کتنا اجر دے گا اور کافر مقتول منحوس کو کتنی سزا اور کتنا گناہ دے گا۔ یہ معاملہ ہے۔ یہ جھگڑا لامحالہ پیش ہوگا۔ تو یہ ﴿وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُىِٕلَتْ ۝﴾ [1] زندہ درگور ہوئی بچی ایک سفاکیت کی بھینٹ چڑھی، کفار قریش کا یہ وتیرہ تھا۔ اسلام نے اس بدعادت کو للکارا۔ اس سے پنجہ آزمائی کی۔ بچیوں کو رحمت قرار دیا، خواتین کو رحمت قرار دیا، ان کی تکریم کی کہ تم اس قدر ان کی تذلیل اور اہانت پر مصر ہو۔ اور ادھر امن کے پیامبر، توحید کے داعی محمد رسول اللہ ﷺ سے ایک خاتون کے تعلق سے کیا جذبات ہیں؟ صحیح بخاری میں نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی حدیث ہے: «إِنِّي لَأَدْخُلُ فِي الصَّلَاةِ» بعض اوقات میں نماز میں داخل ہوتا ہوں «وَأَنَا أُرِيدُ إِطَالَتَهَا» اور میرا ارادہ ہوتا ہے کہ آج نماز لمبی پڑھاؤں گا۔ لمبی قراءت کروں گا۔ «فَأَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِيِّ» کسی بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں۔ «فَأَتَجَوَّزُ فِي صَلَاتِي» تو میں اپنی نماز چھوٹی کر دیتا ہوں۔ کس ڈر سے؟ «مِنْ شِدَّةِ وَجْدِ أُمِّهِ» [2] کہ اس کی ماں پر کیا بیت رہی ہوگی۔ یہ دو چار منٹ جو ماں پر گراں گزریں گے، محمد رسول اللہ ﷺ کو اس کا بھی احساس ہے کہ نماز چھوٹی کر دیتے ہیں۔ اس بچے کے رونے کی آواز سن کر کہ اس کی والدہ پر کیا بیت رہی ہوگی۔ یہ شفقت اور محبت اسلام نے عورت کو دی۔ تو عورت کیا ہے؟ عورت شقيقة الرجال ہے۔ مردوں کے ہم مثل، مردوں کے ہمسر ہے۔ تو بعض چیزوں میں اگر اسلام نے مردوں کو قوام (نگران) قرار دیا ہے تو بعض چیزوں میں عورتوں کو برتری حاصل ہے۔ کوئی فرق نہیں ہے۔ جب اس نتیجے پر غور کریں گے کہ

[1] التكوير 81:8. [2] صحيح البخاري، حديث: 709.

عورت کیا چیز ہے؟ عربی میں عورت کو «إِمْرَأَةٌ» کہتے ہیں یا «مَرْأَةٌ»۔ یہ مونث ہے اور اس کا مذکر ہے «مَرْءٌ» یا «إِمْرءٌ»۔ «إِمْرءٌ» کا مونث «إِمْرَأَةٌ» اور «مَرْءٌ» کا مونث «مَرْأَةٌ»۔ امرأة کی یا مرأة کی لفظی جمع نہیں ہے بلکہ اس کی جمع غیر لفظی ہے اور وہ ہے «نِسَآءٌ» عورتیں۔ عورت کیا چیز ہے؟ عورت ایک انتہائی محترم مخلوق ہے جو کسی نہ کسی طور مرد سے مشارکت رکھتی ہے۔ جو اسلام نے ہم کو فہم دیا ہے، اس فہم کی روشنی میں ہم عورت کی تعریف یہ کرتے ہیں: ایک انتہائی محترم ہستی جو اپنی عمر کے مراحل میں کسی نہ کسی طور مرد کی شریک کار ہے۔ پیدا ہوکر یہ مرد کی بیٹی ہوتی ہے۔ آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتی ہے۔ تھوڑی سی بڑی ہوکر کسی مرد کی بہن ہوتی ہے، تھوڑی سی اور بڑی ہوکر کسی مرد کی بیوی ہوتی ہے، تھوڑی سی اور بڑی ہوکر کسی مرد کی ماں ہوتی ہے۔ کسی نہ کسی مرحلۂ حیات میں یہ مردوں کے شریکِ کار ہے۔ یہ اسلام نے تکریم دی ہے۔ یہ مراحل اسلام نے بیان کیے ہیں۔ ہر مرحلے میں عورت کی عزت کا حکم دیا۔ جاہلیت کے دور میں بچی کو زندہ درگور کیا جا رہا ہے۔ سنیے، ہمارے پیغمبر نے کیا فرمایا۔ مسند احمد کی حدیث ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ «مَنْ كَانَتْ لَهُ أُنْثَى فَلَمْ يَئِدْهَا وَلَمْ يُهِنْهَا وَلَمْ يُؤْثِرْ وَلَدَهُ عَلَيْهَا أَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ» [1] اللہ تعالیٰ جس شخص کو بچی دے۔ «فَلَمْ يَئِدْهَا» اس نے اسے زندہ درگور نہیں کیا۔ «وَلَمْ يُهِنْهَا» اور نہ اس کی اہانت کی، نہ اس کو کمتر سمجھا۔ اور تیسری چیز پر توجہ دو، میں بھی دوں آپ بھی دیں، کیونکہ یہ چیز عام ہے ہمارے گھروں میں۔ «وَلَمْ يُؤْثِرْ وَلَدَهُ عَلَيْهَا» اور اپنے کسی بچے کو، بیٹے کو اس پر ترجیح نہ دے، بیٹے کو بیٹی پر ترجیح نہ دے۔ گھروں میں کھانا تقسیم ہوتا ہے پہلے

[1] مسند أحمد: 223/1.

بیٹوں کو ملتا ہے۔ اچھا اچھا ان کو دیا جائے۔ بچا کھچا بیٹیوں کو دیا جائے، یہ ناانصافی ہے۔ فرمایا ایسا نہ ہو بلکہ بچی اللہ نے دی ہے تو اپنے بیٹے کو اس پر ترجیح نہ دے۔ تو اس کو کیا صلہ ملے گا؟ «أَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ» اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل فرما دے گا۔ ان تین امور پر جنت ہے۔ تو اسلام نے کیا احسان کیا عورت پر! عورت کی کیا اہانت ہوتی تھی اور اسلام نے اس کو قعر مذلت سے، ذلت کے گڑھے سے اٹھایا اور آسمانوں کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ عورت کی تکریم کا حکم دیا اور اس تکریم کا صلہ جنت قرار دیا۔ تو عورت وہ مخلوق ہے جس کی تکریم سے آپ جنت حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ عورت حصولِ جنت کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ کس صورت میں؟ اپنے بیٹوں کو بیٹیوں پر ترجیح نہ دی جائے۔ برابر کا سلوک کیا جائے۔ کھلانے میں، پلانے میں، پہنانے میں ترجیح نہ دی جائے۔ تو یہ بچی، چھوٹی سی بچی جو پیدا ہوتے ہی اتنی باسعادت ہے کہ اپنے والدین کے لیے جنت کی ضمانت بن چکی ہے۔ اگر والدین حسن سلوک سے پیش آئیں، جنت کی ضمانت بن گئی۔ تو شریعت نے ایک عورت کو یہ مقام دیا، اس کو یہ تکریم دی، اس کو یہ عزت دی۔ کہاں اسی دور میں بچیوں کو زندہ درگور کیا جا رہا ہے اور کہاں اسی بچی کے بارے میں یہ ارشاد گرامی کہ بچوں کو بچیوں پر ترجیح نہ دے۔ بلکہ برابر کا رویہ رکھے، اچھا سلوک کرے تو اللہ تعالیٰ اس برابری پر، منصفانہ سلوک پر اس شخص کو جنت میں داخل فرمادے گا۔

نبی علیہ السلام کی بہت سی احادیث ہیں، ایک یہ ہے: «مَنِ ابْتُلِيَ بِشَيْءٍ مِّنَ الْبَنَاتِ فَصَبَرَ عَلَيْهِنَّ» اللہ تعالیٰ جس شخص کو بیٹیوں سے آزمائے اور وہ ان کی تربیت پر صبر کرے، ان سے حسن سلوک سے پیش آئے، تعلیم و تربیت کا اہتمام کرے، فرمایا کہ

«كُنَّ لَهُ حِجَابًا مِّنَ النَّارِ» [1] یہ بچیاں قیامت کے دن اس کے لیے جہنم کے سامنے حجاب بن جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ ان بیٹیوں کو اس شخص کے لیے جہنم اور اس کے درمیان حجاب بنا دے گا۔ ایک شخص نے کہا کہ یارسول اللہ! اگر دو بیٹیاں ہوں؟ فرمایا کہ دو بھی ہوں تو بھی۔ [2] کیا تکریم ہے اور کیا اعزاز ہے۔ بلکہ ایک حدیث میں پیغمبر علیہ السلام کا ارشاد ہے: «مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتّٰى تَبْلُغَا» جو دو بچیوں کی کفالت کرے حتی کہ وہ دونوں جوان ہو جائیں۔ «جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» یہ شخص قیامت کے دن آئے گا «أَنَا وَهُوَ» وَضَمَّ أَصَابِعَهُ [3] میں اور وہ شخص اس طرح ہوں گے۔ اس طرح آپ نے دو انگلیوں کو جوڑ کر اشارہ کیا کہ وہ شخص اور میں قیامت کے دن اس طرح ہوں گے۔ کون؟ جس کو اللہ نے دو بچیاں دیں۔ اور وہ ان کی کفالت کرتا ہے۔ کسی بخل کے بغیر اور کسی تذلیل اور اہانت کے بغیر، کسی طعنہ زنی کے خوف کے بغیر۔ اس کو شرف سمجھتا ہے۔ ان کو اللہ کی دَین اور آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیتا ہے، ان کی تعلیم اور تربیت کا اہتمام کرتا ہے اور ان سارے مراحل میں صبر کرتا ہے۔ فرمایا: قیامت کے دن میں اور وہ شخص اس طرح ہوں گے۔ یہ سارے احکام کس چیز کی دلیل ہیں؟ یہ شریعت اسلامیہ، شریعت مطہرہ ایک خاتون کے لیے کس قدر محسن ہے۔ اس کو کتنی بلندی اور رفعت عطا فرمائی۔ مردوں کو کس طرح ترغیب اور تحضیض دی کہ وہ خواتین کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ وہ سلوک جو جاہلی معاشروں میں ہوتا ہے اور کافروں کے معاشرے میں ہوتا ہے، انتہائی برا سلوک ہے۔ یہ کتنا اعلیٰ سلوک ہے کہ اللہ رب العزت جنتوں کے وعدے فرما رہا ہے۔ ان کی تربیت پر، کفالت پر اور حسن اہتمام پر جنت کے وعدے

[1] جامع الترمذي، حديث: 1913. [2] سنن ابن ماجه، حديث: 3670. [3] صحيح مسلم، حديث: 2631.

فرما رہا ہے۔ اور پیغمبر علیہ السلام کس سعادت کی بات فرما رہے ہیں کہ میں اور وہ قیامت کے دن یوں ہوں گے، بالکل ساتھ۔ یہ ایک خاتون کے لیے وہ شرف ہے جو ہمارے دین نے خاتون کو عطا فرمایا۔ جس کا ہم سب کو علم اور شعور ہونا چاہیے اور معرفت ہونی چاہیے۔ اور ہم اس راستے سے اپنے پروردگار کی رضا اور اس کا قرب حاصل کریں۔

یہی بچی کسی کی بہن ہے تو پیغمبر علیہ السلام کی حدیث ہے کہ جو شخص تین بہنوں کی آزمائش میں ڈال دیا جائے، تین بہنیں اس کے گھر میں ہیں۔ اگر وہ حسن اہتمام کرتا ہے اور ان کی مقدور بھر تربیت، کفالت جو اس سے ہو وہ کرتا ہے، کر رہا ہے تو اس کے لیے بھی آپ ﷺ نے جنت کا وعدہ فرمایا، یعنی حدیث میں جس طرح تین بیٹیوں کا ذکر ہے اس طرح تین بہنوں کا بھی ذکر ہے۔ بنات اور اخوات دونوں کا ذکر ہے، تین بیٹیاں ہوں یا تین بہنیں ہوں۔ [1] اور اگر بھائی ان بہنوں کی کفالت میں محنت کرتا ہے اور کفالت میں بخل نہیں کرتا، تربیت اور تعلیم کا اہتمام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ بھی جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔

اور یہی عورت کل کو بیوی بنتی ہے۔ یہ بھی اس کا ایک روپ ہے۔ تو قرآن پاک نے کس طرح مرد اور عورت کی محبت اور مروت کا ذکر کیا۔ دلوں کی رحمت کا ذکر کیا۔ دونوں کو ایک دوسرے کا لباس کہا۔ اور کتنے احکام شریعت میں موجود ہیں۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی حدیث ہے: «خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَ أَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي» [2] تم سب میں بہترین وہ ہے جو اپنی بیوی کے لیے بہترین ہے۔ جس کے اچھے اخلاق کی گواہی اس کی بیوی دے۔ باہر تو تمھیں اچھا اخلاق رکھنا ہی پڑتا ہے۔ باہر بڑے بڑے مطلب

[1] سنن أبي داود، حديث: 5148. [2] جامع الترمذي، حديث: 3895.

ہوتے ہیں۔ کسی سے کاروباری، کسی سے لین دین اور کسی سے لالچ تو سب سے خوش اخلاقی سے پیش آنا پڑتا ہے۔ فرضی سلام تک کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن اصل اخلاق بندے کا وہ ہے جس کی گواہی گھر سے آتی ہے۔ دو حدیثیں جو عائشہ صدیقہ ؓ سے مروی ہیں کہ «كَانَ فِي مِهْنَةِ أَهْلِهِ» [1] جب اللہ کے پیغمبر گھر میں ہوتے تو اپنے اہل کی خدمت کرتے۔ کس کی بات ہو رہی ہے؟ جو اکرم الخلائق ہے۔ جس کا فرمان ہے: قیامت کے دن میں سارے نبیوں کا خطیب ہوں۔ اور فخر کی بات نہیں ہے۔ [2] «أَنَا سَيِّدُ وَلَدِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» میں قیامت کے دن پوری اولاد آدم کا سردار ہوں گا۔ «وَ أَوَّلُ مَنْ يَنْشَقُّ عَنْهُ الْقَبْرُ وَ أَوَّلُ شَافِعٍ وَّ أَوَّلُ مُشَفَّعٍ» [3] میں وہ پہلا شخص ہوں گا قیامت کے دن جس کی قبر پھٹے گی اور میں قبر سے باہر نکلوں گا۔ میں اول شافع ہوں گا۔ سب سے پہلی شفاعت میں کروں گا۔ اول مشفع ہوں گا، یعنی جس کی شفاعت قبول کی جائے۔ سب سے پہلا میں ہوں گا۔ کتنا اونچا مقام آپ کا! اور گھر میں اپنے اہل کی خدمت کرتے۔ حسن عشرت کا مظاہرہ کرتے۔ یہ نہیں کہ گھر میں فرعون بن کر رہتے۔ اپنے اہل کی خدمت کرتے تھے۔ دوسری گواہی، کسی نے ام المومنین سے پوچھا کہ «أَنْبِئِينِي عَنْ خُلُقِ رَسُولِ اللّٰهِ» اللہ کے پیغمبر کے اخلاق کے متعلق بتائیے؟ یعنی باہر تو ہم نے آپ کو دیکھا، آپ کے اخلاق دیکھے۔ گھر میں اخلاق کیسے تھے؟ فرمایا کہ «فَإِنَّ خُلُقَ نَبِيِّ اللّٰهِ ﷺ كَانَ الْقُرْآنَ» [4] پورا قرآن اللہ کے پیغمبر کا اخلاق ہے۔ یہ گھر کی تصویر ہے۔ قرآن ایک کتابی شکل میں ہے، قرآن اگر انسانی شکل میں ہوتا تو محمد کا چہرہ ہوتا، ﷺ۔ یہ گھر سے گواہی ہے۔ اور رویہ کیا ہے؟ اپنے اہل

[1] صحيح البخاري، حديث: 6039. [2] جامع الترمذي، حديث: 3610. [3] صحيح مسلم، حديث: 2278. [4] صحيح مسلم، حديث: 746.

کی خدمت کرنا۔ اتنا اونچا مقام اور یہ آپ کا حسن تعلق، حسن عشرت۔ بس عورت اگر بیوی کے روپ میں ہے تو کس تکریم کی مستحق ہے۔ نبی ﷺ فرما رہے ہیں کہ تم سب میں بہترین کون ہے؟ ٹھیک ہے نمازیں پڑھتے ہو گے، روزے رکھتے ہو گے، ہر سال حج کو جاتے ہو گے، عمرے کرتے ہو گے، زکاتیں دیتے ہو گے، ٹھیک ہے لیکن سب سے بہترین وہ ہے جس کے بہترین ہونے کی گواہی گھر سے آئے۔ گھر سے گواہی ملے کہ صرف یہ باہر ہی نمازیں نہیں پڑھتا گھر میں بھی پڑھتا ہے۔ صرف باہر لمبے لمبے سجدے نہیں کرتا گھر میں بھی اس کی نمازیں ایسی ہی ہیں۔ اور صرف باہر ہی اخلاق کا پیکر نہیں ہے بلکہ گھر میں بھی مجسم اخلاق ہے۔ گواہی گھر سے آئے تو یہ گواہی اس انسان کے بہترین ہونے کی تکمیل ہوگی۔ اگر گھر سے گواہی نہیں ہے صرف باہر ہی باہر اس کی پارسائی کے روپ نظر آتے ہیں تو یہ ناکافی گواہی ہے۔ ہاں گھر سے گواہی آتی ہے، اخلاق کیسا ہے؟ میل جول کیسا ہے؟ رویہ کیسا ہے؟ اور گھر میں رہن سہن کیسا ہے؟ تو پھر یہ گواہی مکمل ہوگی۔ اس حدیث میں اشارہ ہے کہ عورت جب بیوی کے روپ میں ہو بڑی تکریم اور بڑی عزت کی مستحق ہے۔ جس طرح اللہ کے پیغمبر تکریم کرتے تھے، حسن عشرت کی آپ تلقین کرتے تھے، خواتین اور ایک عورت کے لیے نبی ﷺ نے رفعت کا کتنا مقام ذکر کیا۔ مردوں کو ہدایتیں دیں کہ عورت کو قبیح نہ کہو، کبھی سرزنش کرنے کے لیے ہلکا پھلکا مارنا پڑے تو چہرے پر نہ مارو، اس کے حسن میں بگاڑ کا اندیشہ ہے۔ اور جو تم کھاؤ اس کو کھلاؤ۔ جو پہنو اس کو پہناؤ۔ یہ مساوی سلوک نہیں ہے؟ مساوی رویہ نہیں ہے؟ اور یہ صرف اسلام ہی کی شان ہے۔ اس رویے کی ترغیب اور تحضیض دی جارہی ہے۔ جبکہ دوسرے معاشروں میں خاتون کے ساتھ جو سلوک ہے وہ جانوروں جیسا ہے۔

اور جوں جوں یہ عورت آگے بڑھ رہی ہے اتنا ہی رتبے میں اضافہ ہو رہا ہے۔ کل یہ خاتون ماں بن جائے گی۔ تو شریعت میں کتنے احکام ہیں۔ ماں کا کیا مقام ہے؟ کیا عزت ہے؟ ایک صحابی پیغمبر علیہ السلام کے پاس آیا اور سوال کیا: «يَارَسُولَ اللّٰهِ! مَنْ أَحَقُّ بِحُسْنِ صَحَابَتِي؟» یارسول اللہ! سب سے زیادہ میرے حسن سلوک کا مستحق کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا: «أُمُّكَ» تمھاری والدہ ہے۔ پوچھا: «ثُمَّ مَنْ» پھر کون ہے؟ فرمایا: «ثُمَّ أُمُّكَ» پھر بھی تمھاری والدہ۔ پوچھا: پھر کون؟ فرمایا کہ پھر تمھاری والدہ۔ تین بار پوچھا، پھر کون؟ فرمایا، یہ پوچھتا ہی جارہا ہے تو پھر اس کی دلجوئی کی «ثُمَّ أَبُوكَ» [1] پھر تمھارا باپ۔ یہ باپ ہے، یہ بھی خوش ہو جائے۔ لیکن ذکر ماں ہی کا آرہا ہے۔ تین بار پوچھا۔ تمھاری ماں، تمھاری والدہ حسن سلوک کی مستحق ہے۔ کیا اس کا صلہ ہے؟ نبی ﷺ کا فرمان: ایک دن میں نے جنت سے کسی کی قرآن پڑھنے کی آواز سنی۔ خوش الحانی سے کوئی جنت سے قرآن پڑھ رہا ہے۔ میں نے غور کیا آواز کس کی ہے؟ تو یہ آواز میرے صحابی حارثہ بن نعمان کی تھی، حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہ۔ آگے کیا فرمایا کہ حارثہ کو یہ صلہ کیوں ملا؟ فرمایا کہ «كَذٰلِكَ الْبِرُّ، كَذٰلِكَ الْبِرُّ» [2] ماں کے ساتھ حسن سلوک کا نتیجہ یہ ہے۔ جو اپنی والدہ کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا، ماں کی خدمت کرے گا، اس کا صلہ یہی ہے، اس کا ثمرہ یہی ہے جو اللہ نے حارثہ کو دیا۔ یہ تمیز (امتیازی مقام) کیوں حاصل ہوا جنت میں ہے اور قرآن پڑھ رہا ہے۔ اور اللہ نے ان کی شان اجاگر کرنے کے لیے وہ آواز اپنے پیغمبر کو سنائی، حالانکہ حارثہ کی ایک نیکی اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ شہدائے بدر میں سے ہیں۔ بدر کے معرکے میں شہید

[1] صحيح البخاري، حديث:5971، و صحيح مسلم، حديث:2548. [2] مسند أحمد:166/1.

ہوا تھا۔لیکن پیغمبر علیہ السلام کے اس فرمان کا معنی یہ واضح کرتا ہے کہ حارثہ کو یہ مقام شہادت کی بنا پر نہیں ملا، جنت میں قرآن پڑھنا اور اس کی آواز پیغمبر کو سنوانا بلکہ حارثہ کو یہ عزت اس بنا پر ملی کہ اپنی ماں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا تھا۔تو فرمایا کہ سب سے زیادہ تمھارے حسن سلوک کی مستحق تمھاری والدہ ہے۔ یہ عورت جوں جوں بڑھ رہی ہے اس کی تکریم بڑھ رہی ہے۔اس کی شان بڑھ رہی ہے۔اللہ رب العزت نے اس عورت کو ماں ہونے کے ناتے احکام میں اپنے ساتھ جوڑا۔ ﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ [1] تمھارے پروردگار کے دو فیصلے: ایک یہ کہ مت پکارو مگر اسی کو، اپنی توحید کا ذکر کیا، یعنی دو حقوق کا ذکر کیا۔ ایک حق اللہ کا: حق توحید، اپنے حقِ توحید کے ساتھ ایک حق کو اور جوڑا ﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ اپنے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ وہ حدیث آپ کے ذہنوں میں ہوگی۔ جبریل امین نے بددعا دی اور اللہ کے پیغمبر نے آمین کہی، تین دعائیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ «شَقِيَ عَبْدٌ أَدْرَكَ وَالِدَيْهِ أَوْ أَحَدَهُمَا فَلَمْ يُدْخِلَاهُ الْجَنَّةَ» اس شخص کو اللہ کی رحمت سے دھتکار دیا جائے جو اپنے ماں باپ کو بڑھاپے کی حالت میں پالے، دونوں کو یا ان میں سے ایک کو، اور ان کی خدمت کرکے جنت حاصل نہ کرسکے۔ [2] جب ماں باپ کو پالیا اور جنت حاصل نہیں کرسکا تو جنت کب حاصل کرے گا؟ کتنا اونچا صلہ! تو ان دونوں نصوص میں والدین کا ذکر ہے۔ ایک اور حدیث میں ارشاد ہے: «أَطِعْهُمَا وَ إِنْ ظَلَمَاكَ» اپنے ماں باپ کی بات مانو خواہ وہ تم پر ظلم کرتے ہیں۔ ان کے ظلم پر صبر کرو، ان کی اطاعت کرو۔ ہاں ان کی اطاعت

[1] بنيٓ إسرآءيل 23:17. [2] الأدب المفرد للبخاري، حديث: 644.

میں خالق کی معصیت نہ ہو۔ جب تک ایسا خدشہ نہیں ہے تب تک ان کی اطاعت کرو، ان کی عزت اور تکریم کرو۔ حتیٰ کہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی یہ نصیحت ان صحابہ کو بھی تھی جن کے ماں باپ مشرک تھے کہ شرک میں ان کی اطاعت نہیں مگر جو انسانی حقوق ہیں ان میں ان کا خیال رکھو۔ ان کی عزت، ان کی تکریم، ان کی خدمت کرو۔ تو ان نصوص میں ماں باپ دونوں کا حکم ہے، لیکن ماں باپ میں سے والدہ کا حق زیادہ اہم ہے۔ تبھی نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے سائل سے کہا تھا کہ سب سے زیادہ تمھارے حسن سلوک کی مستحق تمھاری والدہ ہے۔ اور چوتھی مرتبہ والد کا ذکر کیا، یعنی والدہ کا حق کتنا مقدم ہے۔ شریعت نے کتنی تکریم دی! کتنا بڑا احسان ہے خواتین پر شریعت کا کہ ایک خاتون کو ماں کے روپ میں کیا شرف اور کیا مرتبہ عطا فرما دیا۔ اور یہ فہم سلف صالحین کا بھی تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک یمنی کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ وہ حج کرنے گیا تھا۔ اور اس کی پشت پیچھے ایک گٹھڑی تھی، اس کو اٹھائے پھر رہا ہے۔ حرم مکہ میں ایک مجلسِ درس جمی ہوئی ہے اور ایک محدث درس دے رہا ہے۔ پوچھا: «مَنِ الْمُحَدِّثُ؟» یہ محدث کون ہے؟ لوگوں نے کہا: عبداللہ بن عمر، نبی علیہ الصلاۃ والسلام کا صحابی عبداللہ بن عمر، امیر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا بیٹا۔ تو رستہ بناتے ہوئے آگے بڑھا۔ جب مجلس ختم ہوئی، ان سے ایک سوال کیا کہ یہ گٹھڑی، اس میں میرا سامان نہیں ہے بلکہ میری والدہ ہے۔ اور میں اس طرح اس کو پشت پر لاد کر لایا ہوں۔ رستے میں خدمت کرتے ہوئے پیدل ہی آیا ہوں۔ کہاں خراسان اور کہاں مکہ مکرمہ! پیدل لایا ہوں رستے میں خدمت کرتے ہوئے، صفائی ستھرائی کرتے ہوئے، کھلاتے پلاتے ہوئے اور پورا حج میں نے پیدل اپنی والدہ کو

پشت پر اٹھا کر کیا۔ اور اب میں نے اسی طرح واپس بھی جانا ہے۔ یہ کئی ماہ کی مشقت ہے۔ سوال یہ تھا کہ میں نے یہ سب کچھ کر کے اپنی ماں کا حقِ خدمت ادا کر دیا؟ فرمایا کہ نہیں۔ یوں اشارہ کیا: «لَا، وَلَا بِزَفْرَةٍ وَّاحِدَةٍ» ”نہیں، ابھی تک تم نے اپنی ماں کی زچگی کی ایک ٹیس کا حق بھی ادا نہیں کیا۔“ [1] شریعت کتنی محسن ہے ایک خاتون کے لیے۔ ایک خاتون کا مقام کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اللہ تعالیٰ دو حقوق کو ایک پیرائے میں، ایک ہی سیاق میں ذکر کر رہا ہے۔ ایک اپنا حق، حقِ توحید اور دوسرا حقوق العباد میں سے ماں باپ کا حق۔ اور پیغمبر علیہ السلام نے بھی ان دو چیزوں کو اسی سیاق میں جمع کیا جب آپ نے اکبر الکبائر کا ذکر کیا۔ بڑے بڑے گناہوں کی لسٹ آپ نے پیش کی تو «اَلْإِشْرَاكُ بِاللّٰهِ وَ عُقُوقُ الْوَالِدَيْنِ» پہلا اللہ کے ساتھ شرک کرنا، دوسرا ماں باپ کی نافرمانی کرنا، ان کو ایک ہی سیاق میں ذکر کیا۔ [2] کتنا مقدم حق ہے۔ اور شریعت ایک خاتون کو کہاں پہنچانا چاہتی ہے۔ اس کے کس شرف کا تعارف ہمارے سامنے پیش کرنا چاہتی ہے کہ جوں جوں یہ خاتون بچی سے بہن، بہن سے بیوی، بیوی سے ماں یہ مراحل آتے جا رہے ہیں، ان تمام مراحل میں یہ خاتون ایک مرد کی شریکِ کار ہے۔ اور توں توں اس کی عزت و تکریم میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، تکریم بڑھتی جا رہی ہے۔ اور جو شریعت کی اپنی تکلیف ہے، اس نے مردوں کو بھی مکلّف قرار دیا اور عورتوں کو بھی مکلّف قرار دیا۔ مرد بھی مکلّف ہیں، عورتیں بھی مکلّف ہیں۔ اس تکلیف میں شریعت نے جو توازن رکھا ہے وہ توازن بھی ایک عورت پر احسان ہے۔ جب اس کے مخصوص ایام آئیں تو نماز معاف ہے۔ اس کے ہاں بچے کی ولادت ہوگی، نماز معاف

[1] الأدب المفرد، حديث:11. [2] صحيح البخاري، حديث:6920.

ہے۔ ماہ رمضان کے روزے آ گئے نہ رکھو، بعد میں قضا دے لو۔ یہ آسانی پیدا کی۔ خواتین نے پیغمبر علیہ السلام سے سوال کیا کہ کیا ہم پر جہاد ہے؟ فرمایا کہ ہاں «جِهَادُ كُنَّ الْحَجُّ» ”تمھارا جہاد حج ہے۔“ [1] تم جا کر حج کر لو، تمھیں حج کا اجر ملے گا اور ایک مجاہد کا ثواب ملے گا۔ کیا یہ تکریم نہیں ہے؟ کتنی آسانی اور کس قدر اجر و ثواب کی بہتات ہے۔ «إِذَا صَلَّتِ الْمَرْأَةُ خَمْسَهَا وَصَامَتْ شَهْرَهَا وَحَصَّنَتْ فَرْجَهَا وَأَطَاعَتْ زَوْجَهَا، قِيلَ لَهَا: ادْخُلِي الْجَنَّةَ مِنْ أَيِّ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ شِئْتِ» ایک عورت اگر پانچ نمازیں پڑھ لے، رمضان کے روزے رکھ لے، یعنی پوری امانت داری کے ساتھ، اپنی عزت کی حفاظت کرے اور اپنے شوہر کی فرمانبرداری کر لے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا: جنت کے جس دروازے سے چاہو، داخل ہو جاؤ۔ [2] جنت کے آٹھ دروازے کھلے ہیں تمھارے لیے، جہاں سے چاہو داخل ہو جاؤ۔ کام کیا ہے؟ صرف چار کام۔ حالانکہ خاتون کے لیے راحت ہی راحت ہے۔ ایک انسان کی سیاست کی دو قسمیں ہیں۔ سیاست خارجیہ اور سیاست داخلیہ۔ داخلی سیاست گھر کی سیاست، یہ فریضہ عورت کا ہے۔ گھر کی مالکہ، گھر کی حکمران، گھر کی سیاست تیرے ذمے، تو اس گھر کی مالکہ ہے۔ سیاست خارجیہ، صبح گھر سے نکلنا اور شام تک ٹکریں مارنا رزق کے لیے، اکتساب کے لیے یہ مرد کی ذمہ داری ہے۔ عورت کو راحت ہی راحت ہے۔ اس راحت کے باوجود فرمایا کہ چار کام کر لے، جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیے جائیں گے۔ یہ عورت کا مقام ہے۔ ایک عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپ سے کسی چیز کا سوال کیا۔ آپ نے اسے تین کھجوریں عطا کر دیں۔

[1] صحيح البخاري، حديث:2875. [2] صحيح الجامع، حديث:660.

اس خاتون نے ایک کھجور ایک بچے کو دی، دوسری دوسرے کو دی۔ بچے جھٹ سے کھا گئے۔ اور وہ خاتون کھانے لگی تو دیکھا کہ میرے بچے اس کھجور کو دیکھ رہے ہیں۔ تو اس نے خود نہیں کھائی، اس کے دو ٹکڑے کر کے دونوں بچوں کو کھلا دیے۔ یہ منظر دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ «حَامِلَاتٌ وَّالِدَاتٌ رَحِيمَاتٌ لَوْلَا مَا يَأْتِينَ إِلَى أَزْوَاجِهِنَّ دَخَلَ مُصَلِّيَاتُهُنَّ الْجَنَّةَ» [1] یہ عورتیں حمل کی تکلیف برداشت کرتی ہیں، پھر پیدائش کی، پھر بچوں کے ساتھ شفقت اور محبت کا معاملہ کرتی ہیں۔ فرمایا کہ اپنے شوہروں کے ساتھ اگر یہ بدسلوکی نہ کریں تو نماز پڑھنے والی عورت کا ٹھکانہ جنت کے سوا کچھ نہیں۔ یعنی ان امور کی بنا پر۔ حمل کی تکلیف، رضاعت کی تکلیف، بچوں کے ساتھ محبت اور شفقت کی تکلیف، بڑے صبر کے ساتھ وہ ان مراحل کو طے کرتی ہے۔ فرمایا کہ اگر وہ نمازی ہو اور اپنے شوہر سے بدسلوکی نہ کرے تو اس کا ٹھکانہ جنت کے سوا کچھ نہیں۔ تو شریعت نے عورت کے فرائض میں کمی بھی کر دی اور اس کمی کے باوجود اجر میں اضافہ کر دیا۔ اجر کو بڑھا دیا۔ فرائض میں کمی کر دی، لیکن ثواب کو بڑھا دیا، یعنی کس کس پہلو سے عورت کی تکریم اور اس پر احسان کیا۔ پھر عورت کی معاشرتی زندگی کے تعلق سے شریعت کے جو احکام ہیں، وہ دین اسلام کی طرف سے ایک ایسی تکریم ہے کہ ایسی تکریم اور کوئی پیش نہیں کر سکتا۔ کوئی مذہب، کوئی قانون، کوئی دستور اس تکریم کو پیش نہیں کر سکتا، یعنی شرعی احکام ایک عورت کے تعلق سے، ایک عورت کے پردے کے تعلق سے، گھر کی چار دیواری کے تعلق سے۔ اس کی چادر کے تحفظ کے تعلق سے، اس کی عزت کی حفاظت کے تعلق سے جو نظام اور جو

[1] سنن ابن ماجه، حديث: 2013، و مسند أحمد: 5/252، 257.

احسان شریعت مطہرہ کا ہے وہ کسی اور دستورِ عالم کا نہیں ہے۔ کسی اور قانون میں نہیں ہے۔ ﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ﴾ [1] ”عورتو! اپنے گھروں میں ٹکی رہو۔“ تمھارے گھر کی چار دیواری جس کی تم مالک ہو، تمھارے لیے کافی ہے۔ اپنے گھر میں ٹکی رہو۔ اس میں تمھارا تحفظ، اس میں تمھاری چادر کا تحفظ، تمھاری عزت کا تحفظ، ایک عورت کے لیے یہ حکم ہے۔ اور یہ کوئی ظلم یا جبر نہیں ہے بلکہ عورت کی رعیت ہے، اس رعیت کی حد اس کا گھر ہے۔ اس گھر میں اس کا رہنا اس کی تکریم ہے۔ یہ مردوں کو ایک طرح سے سمجھایا گیا ہے کہ عورتوں کا کام کے لیے گھر سے باہر نکلنا اس کا کوئی جواز نہیں۔ بلکہ پیغمبر علیہ السلام کی حدیث ہے کہ عورت کا مردوں کے ساتھ کاروبار میں شریک ہونا علامات قیامت میں سے ہے۔ [2] علامات قیامت میں سے ایک عورت کا مردوں کے ساتھ کاروبار میں شریک ہونا ہے۔ آج کا کلچر عورت کو مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے کا داعی ہے۔ مگر ہماری شریعت کہتی ہے: ﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ﴾ اپنے گھروں میں ٹکی رہو۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے انتقال کے بعد نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی بیوی ام المومنین سودہ رضی اللہ عنہا اپنے گھر میں محصور ہو کر رہ گئیں۔ کسی نے کہا کہ تم کبھی تو گھر سے نکلو، کم از کم حج و عمرہ کرنے کے لیے نکلو۔ جیسے اور عورتیں جاتی ہیں، تم بھی چلی جایا کرو۔ کہا کہ نہیں۔ جو حج مجھ پر فرض تھا وہ کر چکی ہوں، عمرے بھی اپنے پیغمبر کے ساتھ، اپنے شوہر کے ساتھ کر چکی ہوں۔ اب میرے پروردگار کا حکم ہے کہ میں اپنے گھر میں رہوں۔ میں اپنے پروردگار کے حکم کو رد نہیں کر سکتی۔ [3] میں گھر ہی میں رہوں گی۔

ایک خاتون اس تکریم کو قبول کرتی ہے جو شرف شریعت نے دیا اور گھر سے نکلنا

[1] الأحزاب 33:33. [2] مسند أحمد: 1/407. [3] الدر المنثور، الأحزاب 34:33.

پڑے تو اپنی پوری چادر کی حفاظت کے ساتھ، اپنے پردے کی حفاظت کے ساتھ نکلتی ہے۔ کیسی کیسی خواتین ہیں۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی ایک حدیث ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے سنی۔ وہ حدیث کیا تھی؟ «مَنْ جرَّ ثَوْبَهُ خُيلَاءَ لَمْ يَنْظُرِ اللّٰهُ إِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيامَةِ» جو شخص اپنے کپڑے کو گھسیٹے گا، یعنی ٹخنے سے نیچے رکھے گا، اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن نہیں دیکھے گا۔ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جو اپنے کپڑے کو ٹخنے سے نیچے لٹکانے والا ہے، اللہ اس کو نہ دیکھے گا، نہ اس کو پاک کرے گا بلکہ اس کو عذاب الیم میں جھونک دے گا۔
ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے یہ حدیث سنی۔ کہا: یارسول اللہ! عورتوں کا کیا حکم ہے؟ یعنی لباس گھسیٹنے والا جہنمی ہے اور اللہ اس کو دیکھے گا نہیں۔ عورتوں کے لیے کیا حکم ہے، یہ تو پریشانی ہمارے لیے ہے کہ ہم بھی اوپر رکھیں۔ فرمایا کہ نہیں، تمھیں نیچے رکھنا ہے۔ «يُرْخِينَ» عورتیں اپنے لباس کو لٹکائیں گی۔ ٹخنوں سے نیچے رکھیں گی۔ کہا: یارسول اللہ! اتنا تو کافی نہیں ہے۔ کپڑے کو ٹخنوں سے نیچے کر لینا، اتنا کافی نہیں ہے۔ پاؤں کے کھل جانے کا اندیشہ ہے۔ آپ ایک عورت کی فکر دیکھیں۔ پاؤں کے کھل جانے کا اندیشہ ہے۔ فرمایا کہ «يُرْخِينَ شِبْرًا» تو پھر اپنی چادر پاؤں سے ایک بالشت نیچے کر لیں۔ جو اوپر کا عبایہ ہے یا جو بھی چادر ہے، اس کو اپنے پاؤں تک رکھے اور پاؤں سے ایک بالشت نیچے کر لے۔ کہا کہ یارسول اللہ! اس میں بھی اندیشہ ہے پاؤں کے کھل جانے کا، مثلاً: ہوا آتی ہے یا بعض اوقات موڑ مڑتی ہیں تو ہوا ٹکراتی ہے۔ اس میں بھی اندیشہ ہے پاؤں کے کھل جانے کا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «فَيُرْخِينَهُ ذِرَاعًا» پھر ایک ہاتھ اس کو نیچے لٹکائیں۔ [1] پورا ایک ہاتھ اس کو نیچے لٹکائیں، یعنی خواتین نے

[1] جامع الترمذي، حديث:1731، و مسند أحمد:24/2.

کس طرح اپنی اس تکریم کے پہلو کو قبول کیا۔ اور یہاں ایک بات بڑی آسانی سے آپ سمجھ جائیں گے۔ کچھ لوگ، ان میں علماء بھی ہیں، جو چہرے کی بے پردگی کے قائل ہیں۔ اس حدیث پر غور کرو، جو شریعت ایک عورت کے پاؤں ڈھانپ رہی ہے وہ اس کے چہرے کو ننگا کرے گی؟ یعنی پاؤں ڈھانپ رہی ہے، ایک ایک ہاتھ کپڑے کو لٹکاؤ۔ پاؤں نہیں کھلنا چاہیے تو وہ شریعت عورت کے چہرے کو برہنہ کرے گی، یعنی تھوڑا سا تدبر کیجیے۔ اتنی تکریم! یہ دین اسلام ہے۔ ایک اور پہلو، پیغمبر علیہ السلام کی ایک اور حدیث۔ نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے خواتین کو عیدگاہ آنے کا حکم دیا۔ عید کی نماز پڑھو۔ یہاں تک فرمایا کہ اگر مخصوص ایام ہوں پھر بھی آجاؤ۔ نماز نہ پڑھو مگر دعاؤں میں شریک ہو جاؤ۔ یہاں تک فرمایا کہ اگر تمھارے پاس جلباب، یعنی بڑی چادر نہ ہو تو تم اپنی کسی سہیلی سے عبایہ چادر مستعار لے لو، ادھار لے لو۔ اس میں لپٹ کر آؤ۔ اگر سہیلی کے پاس عبایہ نہیں ہے، چادر ایک ہی ہے تو دونوں اس ایک میں لپٹ کر آجاؤ۔ سوال یہ کہ ایک بھی نہ ہو تو پھر نہ آؤ، پھر مجبوری ہے۔ حالانکہ معاملہ عبادت کا ہے۔ اور شریعت عبادت میں عورت کو بھی بلا رہی ہے، لیکن پورے پردے کے ساتھ۔ تو غیر عبادت کے لیے، بازار جانا ہے، شاپنگ کرنی ہے، سیر وتفریح کے لیے جانا ہے، اس میں عورت کی بے پردگی کا کوئی جواز بنتا ہے؟ یعنی شریعت عبادت کے لیے بھی گھر سے نکال رہی ہے تو کس اہتمام سے۔ تو یہاں عبادت مقصود نہیں ہے، دوسرے کام ہیں تو اس میں کوئی جواز ہے عورت کی بے پردگی کا۔ تو اللہ کا خوف کیجیے۔ یہ شریعت کیا چاہتی ہے اور ایک عورت کو کیا تکریم دینا چاہتی ہے؟ اس کو ایک کنز مکنون بنا کر پیش کر رہی ہے، ایک مخفی خزانہ جو پردے کے اندر ہے۔ یہاں تو کہا کہ جب چلو تو آہستگی سے چلو۔ قدموں کو پٹخ کر

نہ چلو۔ ﴿وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ﴾ [1] اپنے پاؤں پٹخ پٹخ کر نہ چلو۔ اللہ اکبر۔ تمھارے پاؤں کی جو آہٹ ہے اور بعض اوقات پاؤں میں اگر پازیب پہنی ہے تو اس کی جھنکار بھی بے پردگی کا باعث بن سکتی ہے۔ نہ بھی پہنی ہو تو یہ جو پاؤں کی آہٹ ہے، یہ بھی پردہ ہے۔ کسی اجنبی سے بات کرنی ہے تو کرخت ہو کر بات کرو۔ نرمی سے نہیں۔ نرمی سے بات کرو گی تو اس کے دل میں کوئی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کا شائبہ تک ختم کر دیا۔ تو شریعت ایک عورت کے تعلق سے کس قدر غیور ہے۔ آپ ﷺ نے سوال کیا کہ کوئی شخص اپنے گھر میں جائے اور کسی اجنبی کو اپنے گھر میں دیکھے، کیا کرو گے؟ تو سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں تلوار سے، تلوار کی پشت سے نہیں بلکہ تلوار کی دھار سے وار کر کے اس کی گردن ہی اڑا دوں گا۔ [2] آپ نے منع نہیں کیا۔ یہ غیرت حق ہے۔ اور شریعت اس تعلق سے غیور ہے۔ ایک عورت کے تعلق سے شریعت کا یہ حکم بڑی غیرت پر مبنی ہے۔ نبی علیہ السلام کی حدیث ہے: «مَنْ قُتِلَ دُونَ أَهْلِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ» جو مرد اپنی بیوی کے دفاع میں مارا جائے، وہ شہید ہے۔ [3] اس میں دو پیغام ہیں: ایک یہ کہ بیوی کا دفاع کرے۔ یہ ہمارے معاشرے کی زینت ہے۔ یہ ہماری شریعت کی زینت ہے، باقی معاشروں میں اپنی بیوی کا دفاع کرنا نہیں ہے۔ اگر دفاع کرتے کرتے تم نے اسے مار دیا، وہ خون معاف ہے۔ اگر تم قتل ہو گئے تو تم شہید ہو۔ تمھارے لیے شہادت کا مقام ہے۔ یہ غیرت ایک عورت کے تعلق سے ہے۔ دین اسلام اس غیرت کا داعی ہے۔ اس غیرت کا متقاضی ہے۔ چھوٹا سا تاریخی واقعہ یاد آ گیا۔ قاضی موسیٰ کی مجلس میں ایک عورت پیش ہوئی۔ اس عورت کے اولیاء بھی تھے، باپ یا بھائی وغیرہ۔ انھوں

[1] النور 31:24. [2] صحيح البخاري، حديث: 7416، و صحيح مسلم، حديث: 1499.
[3] جامع الترمذي، حديث: 1421.

نے اس عورت کے شوہر کے خلاف عدالت میں دعویٰ دائر کیا کہ شوہر نے پانچ سو دینار حق مہر مقرر کیا تھا۔ اب وہ دینے سے انکار کر گیا ہے۔ پانچ سو دینار حق مہر مقرر کیا تھا۔ اور اس نکاح میں فلاں فلاں گواہ تھا۔ ظاہر ہے کہ گواہی گھر کے فرد کی تو نہیں چلے گی۔ بچی کی گواہی اس کا باپ تو نہیں دے گا۔ وہ اس کے اہل میں سے ہے۔ گواہی تو غیر ہی دے گا۔ قاضی نے کہا: گواہ پیش کرو۔ شوہر بھی بیٹھا ہوا ہے، عورت بھی موجود ہے۔ اور دو تین گواہ پیش ہو گئے۔ اس مجلس نکاح میں ہم تھے اور یہ مہر ہم نے سنا تھا۔ انھوں نے یہ گواہی دینی تھی۔ مگر شہادت کے سارے مراتب پورے کرنے کے لیے قاضی نے یہ حکم دیا کہ یہ گواہی دینے والے مرد ہیں، پہلے اس خاتون کو دیکھیں گے تاکہ پہچان سکیں کہ وہی خاتون ہے۔ کوئی دھوکا نہ ہو، کوئی دغا نہ ہو تاکہ گواہی پوری معرفت کے ساتھ ہو۔ اور پورے وثوق کے ساتھ ہو، چنانچہ عورت کو چہرہ کھولنے کا حکم دیا کہ اپنے چہرے کو ذرا بے نقاب کرو اور اپنے پردے کو ہٹا کر گواہوں کو دیکھنے کا موقع دو۔ مرد پیچھے سے بول اٹھا: میری بیوی کو، اس کے چہرے کو برہنہ نہ کیا جائے وہ مہر میں قبول کرتا ہوں۔ وہ پانچ سو دینار میں ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ یہ ہے غیرت۔ عورت نے سنا کہ میرا شوہر اس طرح میری غیرت کا محافظ ہے۔ اس نے کہا: میں نے اپنے شوہر کا مہر معاف کر دیا۔ یہ پانچ سو دینار میں نے معاف کر دیے۔ قاضی عش عش کر اٹھا۔ «اِجْعَلُوهَا فِي مَكَارِمِ الْأَخْلَاقِ» اس واقعے کو سونے کے پانی سے لکھو۔ مکارم اخلاق میں یہ واقعہ ہمیشہ زندہ اور تابندہ رہے گا۔ یہ دینی غیرت ہے۔ یہ غیرت کس نے دی؟ یہ احکام کہاں سے آئے؟ یہ دین اسلام کی خوبی ہے کہ ہماری شریعت کس طرح روشنی مہیا کرتی ہے۔ اور کس طرح ایک خاتون کی محافظ ہے۔ بس خواتین

اپنی ذمہ داریوں کو پورا کریں۔ اللہ تعالی کی عبادت کی، روزوں کی، نمازوں کی اور دیگر شرعی احکام کی حفاظت کریں اور پھر جو بعض چیزوں سے روکا گیا، مثلاً: شوہر کی ناشکری، نافرمانی اور زبان کی حفاظت، زبان پر طعن و ملامت نہ ہو۔ گالی گلوچ نہ ہو۔ نبی ﷺ کے سامنے دو عورتوں کا ذکر ہوا: ایک عورت کی حسن عبادت کا ذکر ہوا۔ اور اس کی فیاضی کا ذکر ہوا۔ مگر صحابہ نے کہا ہے کہ «تُؤْذِي جِيرَانَهَا بِلِسَانِهَا» زبان کی میٹھی نہیں ہے۔ اس نے اپنے پڑوسیوں کو ہمیشہ تکلیف اور اذیت میں ڈال رکھا ہے۔ پڑوسیوں پر مسلط ہے۔ فرمایا کہ «هِيَ فِي النَّارِ» یہ عورت جہنم میں جائے گی۔ اس کی عبادتیں، محنتیں، نمازیں کہاں گئیں، صدقے اور خیرات کہاں گئیں۔ ایک اور عورت کا ذکر ہوا۔ غریب ہے۔ فرض کا اہتمام کرتی ہے۔ نوافل کا اہتمام نہیں کر پاتی۔ صدقہ نہیں دے پاتی۔ ہاں کبھی کبھی کچھ ٹکڑے پنیر کے سخاوت کرتی ہے۔ مگر «لَا تُؤْذِي جِيرَانَهَا بِلِسَانِهَا» زبان کی میٹھی ہے۔ اخلاق اچھے ہیں۔ کسی کی غیبت نہیں کی، کسی کی چغلی نہیں کی۔ سب وشتم نہیں کیا۔ گالی گلوچ نہیں کی۔ زبان کی اچھی ہے۔ فرمایا: «هِيَ فِي الْجَنَّةِ» [1] اپنے حسن خلق کی بنا پر جنت کی مستحق ہے۔ تو بہت تھوڑی ذمہ داری ہے، بہت تھوڑی۔ اللہ کے پیارے پیغمبر نے عید کا خطبہ ارشاد فرمایا: آپ نے محسوس کیا کہ اس دفعہ مجمع بڑا ہے، میری آواز پیچھے نہیں گئی ہوگی۔ بلال حبشی ؓ کو ساتھ لے کر خواتین کے اجتماع میں چلے گئے۔ انھیں بھی کچھ نصیحت کی اور دو باتیں خاص طور پر ارشاد فرمائیں۔ «يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ! تَصَدَّقْنَ وَ أَكْثِرْنَ الْإِسْتِغْفَارَ» اے عورتو! صدقہ دو اور کثرت سے استغفار کرو۔ «فَإِنِّي رَأَيْتُكُنَّ أَكْثَرَ أَهْلِ النَّارِ» میں نے جہنم

[1] مسند أحمد:440/2.

میں تمھیں زیادہ دیکھا ہے۔ تم جہنم میں زیادہ ہو اور مرد کم ہیں۔ ایک عورت نے ہمت کر کے پوچھ لیا: یارسول اللہ! کیوں؟ فرمایا: دو اسباب ہیں: «تُكْثِرْنَ اللَّعْنَ وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ» تمھاری زبانوں پر لعن طعن بہت ہوتا ہے۔ غیبتیں، ملامتیں، گالی گلوچ اور شوہروں کی ناشکری کرتی ہو۔ شوہروں کی نافرمانی کرتی ہو۔ [1] ان دو اسباب کی بنا پر تم جہنم میں زیادہ ہو۔ لیکن یہ نہ سمجھا جائے کہ خواتین جنت میں کم ہوں گی۔ خواتین جس طرح جہنم میں مردوں سے زیادہ ہیں، اسی طرح جنت میں بھی مردوں سے زیادہ ہوں گی۔ اس کی دلیل نبی ﷺ کی حدیث ہے کہ جنت میں ہر مرد کو اس کی بیوی کے ساتھ دنیا کی دو عورتیں بھی دی جائیں گی۔ معنی جو مردوں کی تعداد ہے اس سے دگنی تعداد عورتوں کی ہے۔ یہ شرف نہیں کیا؟ یہ تشریف وتکریم نہیں ہے ایک خاتون کے لیے؟ باقی جو لوگ پروپیگنڈہ کرتے ہیں ہمارے دین اسلام کے خلاف، وہ سب کج فہمی کا نتیجہ ہے۔ یہ اسلام کو بدنام کرنے کی سازش ہے کہ عورت کی کیا تکریم ہے؟ اس کی گواہی آدھی، اس کی دیت آدھی، اس کی میراث آدھی۔ ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ [2] کہ بیٹے کا حصہ دگنا ہے اور عورت کا حصہ اس سے آدھا۔ تو کیا تکریم ہے؟ بھائی! یہ تکریم ہے۔ تم نہیں سمجھتے۔ اگر مرد کو دگنا دیا جارہا ہے اور عورت کو آدھا دیا جارہا ہے تو عورت کا سرمایہ جو اس کو حاصل ہے، وہ منجمد کرسکتی ہے۔ اس کو خرچ نہ کرے اپنے لیے محفوظ رکھے، اسے اختیار ہے۔ لیکن مرد کے ذمے کفالت ہے۔ عورتوں کی کفالت، بہنوں کی کفالت، بیٹیوں کی کفالت۔ وہ اپنے اس مال کو خرچ کرتے ہیں۔ مرد نے تجارت کرنی ہے۔ اسے کسی نفع بخش کاروبار میں لگا سکتا ہے۔ لیکن ایک عورت نے یہ کچھ نہیں

[1] صحیح مسلم، حدیث: 79. [2] النسآء 11:4.

کرنا، اس کو مال ملنا ہے۔ اس کی ذمے داری میں کسی کی کفالت نہیں۔ اگر آپ حساب لگائیں گے تو عورت کو زیادہ نوازا جارہا ہے۔ عورت کی دیت آدھی ہے۔ مرد کی دیت پوری ہے۔ مرد کی دیت سو اونٹ ہے۔ عورت کی پچاس اونٹ۔ بھائی تھوڑا سا سوچو۔ ایک بیوی اور شوہر۔ اگر شوہر قتل ہوجائے تو اس کی دیت سو اونٹ ہے وہ کس کو ملے گی؟ وہ اس کی بیوی کو ملے گی۔ عورت قتل ہوجائے تو اس کی دیت پچاس اونٹ ہے۔ کس کو ملے گی؟ مرد کو۔ زیادہ مال کس کو مل رہا ہے؟ عورت کو یا مرد کو، یعنی شریعت اس حکم کے ذریعے کس کو نواز رہی ہے؟ یہ سب کج فہمی کا نتیجہ ہے۔ اسلام کو بدنام کرنے کی ایک سازش ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں جو تکریم ایک خاتون کو میسر ہے وہ کسی اور معاشرے میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان بعض مسائل پر، ان فرمودات پر عمل کی توفیق دے اور ہم یہ شریعت جس کے اتنے محاسن ہیں، اتنا اس کا حسن، اللہ کے لیے ہم اس شریعت کے حسن کو اپنے اوپر قائم کریں اور اپنے آپ کو اچھا بنائیں۔ خود کو شریعت کے تناظر میں حسین بنائیں۔ تاکہ کل ہم اللہ تعالیٰ کو پسند آجائیں۔ جو اللہ کے پیغمبر کی دعا ہے کہ یااللہ تجھ سے دو چیزوں کا سوالی ہوں: ایک مجھے اپنے چہرے کے دیدار کی لذت عطا فرمادینا اور دوسرا میرے دل کو اپنی ملاقات کے شوق سے بھر دے۔ [1] یہ شوق کیا ہے؟ میرے اندر تیری ملاقات کا شوق پیدا ہوجائے۔ جب شوق پیدا ہوگا، پھر آپ تیاری کریں گے نا۔ کسی بچھڑے ہوئے عزیز کے آنے کی، آمد کی اطلاع مل جائے تو اس سے ملاقات کا شوق آپ کے اندر پیدا ہوگا۔ اس کی تیاری کریں گے۔ اس کا اہتمام کریں گے۔ اچھے پکوان بنوائیں گے۔ اچھے کپڑے پہنیں گے۔ تو یااللہ! میرے

[1] سنن النسائي، حديث: 1306، و مسند أحمد: 364/4.

اندر، میرے دل میں تیری ملاقات کا شوق پیوست ہوجائے۔ ہر وقت کی ملاقات جو میرے سامنے رہے۔ اس کی میں تیاری کروں۔ ایسا بن کر روز قیامت تیرے سامنے آؤں کہ میں تجھے پسند آجاؤں۔ تجھے اچھا لگوں۔ اللہ پاک اس کی توفیق دے۔

«وَأَقُولُ قَوْلِي هٰذَا وَ أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِي وَلَكُمْ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ»

قرآن اور رمضان

قرآن اور رمضان

خطبہ مسنونہ کے بعد:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝ سَلٰمٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝﴾

’’اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان بڑا رحم والا ہے۔

بے شک ہم نے اس (قرآن) کو لیلۃ القدر میں نازل کیا۔ اور آپ کو کیا معلوم کہ لیلۃ القدر کیا ہے؟ لیلۃ القدر ہزار مہینے سے بہتر ہے۔ اس رات میں فرشتے اور روح (جبریل) اپنے رب کے حکم سے ہر کام کے لیے نازل ہوتے ہیں۔ (وہ رات) طلوع فجر تک سلامتی (ہی سلامتی) ہے۔‘‘[1]

---

[1] القدر 97:1-5.

قرآن پاک کا نزول

اس نشست کے لیے عنوان آپ نے سن لیا تھا، رمضان اور قرآن پاک کا تعلق۔ یہ بات معلوم ہے کہ قرآن پاک کا نزول ماہِ رمضان میں ہوا تھا: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْاٰنُ﴾ رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن حکیم نازل ہوا۔ اور اس کا مکمل نزول رمضان کی ایک رات میں ہوا جسے شب قدر یا لیلۃ القدر کہا جاتا ہے۔ مکمل نزول کا معنی یہ ہے کہ اس رات اللہ رب العزت نے پورا قرآن لوح محفوظ سے اتار دیا۔ آسمانوں کی طرف بھیج دیا، اپنے فرشتوں کے سپرد کر دیا اور پھر فرشتہ جبریل علیہ السلام اللہ تعالی کے امر سے، اللہ کے حکم سے مختلف اوقات میں قرآن پاک لے کر نبی ﷺ پر آتا رہا۔ کبھی دس آیتیں، کبھی ایک سورت، کبھی پانچ آیتیں، کبھی ایک آیت۔ تو قرآن پاک کے دو نزول ہیں۔ ایک ہے مکمل نزول، یہ نزول لوح محفوظ سے آسمان کی طرف ہوا بیک وقت پورا قرآن۔ اور یہ کب ہوا؟ شب قدر میں۔ دوسرا نزول آہستہ آہستہ کبھی پانچ آیتیں، کبھی دس آیتیں۔ یہ آسمان سے زمین کی طرف، جس کی مدتِ تکمیل تقریباً 23 سال ہے۔ اللہ رب العزت کی حکمت اور اس کے امر کے تحت اللہ کا فرشتہ کچھ آیات اللہ کے نبی کے پاس لے کر آتا۔ تو یہ دوسرا نزول ہے جبکہ اصل جو اول نزول ہے یہ شب قدر میں ہوا۔

رمضان کی فضیلت بوجہ قرآن

میں سمجھتا ہوں کہ رمضان کی جو شان ہے، جو مقام ہے اور شب قدر کا جو مرتبہ ہے، جو مقام ہے یہ نزولِ قرآن کی بنا پر ہے کہ اللہ رب العزت نے اس مہینے کو قرآن پاک

کے نزول کے ساتھ مشرّف بنایا ہے۔ یہ قرآن پاک کی مرافقت، قرآن پاک کا نزول اور قرآن پاک کی مصاحبت کا اثر ہے کہ رمضان تمام مہینوں سے ممتاز قرار پایا ہے۔ اور اس کا مرتبہ و مقام یقیناً بہت بلند ہے صرف تعلق بالقرآن کی بنا پر۔ ایک فارسی کے شاعر نے کہا تھا:

جمالِ ہم نشین در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

''میرے ہم نشین کے حسن و جمال نے مجھ پر اثر کر دیا، وگرنہ میں تو مٹی ہی ہوں جو ہوں۔''

کہ مٹی اٹھا کر سونگھی، اس میں خوشبو آ رہی تھی۔ پوچھا کہ تم میں سے یہ خوشبو کیوں اٹھ رہی ہے؟ مٹی نے جواب دیا کہ یہاں ایک پھول اگا ہوا ہے، اس پھول نے مجھ میں خوشبو پیدا کر دی ہے۔ ''جمال ہم نشین'' یہ ہم نشین کا اثر ہے، یہ اس کی خوشبو ہے، یہ مصاحبت کا اثر ہے کہ مٹی میں بھی خوشبو آ جاتی ہے، پھول کی صحبت سے۔ تو قرآن پاک کے نزول سے رمضان کا مہینہ مبارک ہو گیا۔ بڑا اجر، بڑا ثواب، بڑا مرتبہ، بڑا اونچا مقام اور جو بھی شان ہے وہ آپ سب جانتے ہیں۔ یہ مہینہ تمام مہینوں سے ممتاز ہے اور شب قدر تمام راتوں سے افضل ہے۔ ایک رات کا قیام، ایک رات کی عبادت ایک ہزار مہینوں کی عبادت سے افضل ہے۔ اتنا اونچا مقام ہے۔

اس رات کا قیام ایک ہزار مہینے کی عبادت سے افضل ہے۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ إِيمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ» [1] جو شخص شب قدر کا قیام کرلے ایمان کے ساتھ اور احتساب کے ساتھ، اچھے عقیدے کے ساتھ اور احتساب کے ساتھ۔ احتساب کے معنی اللہ سے اجر لینے کی امید ہو، ریاکاری نہ ہو، اس رات کو جاگے اور قیام کرے۔ «غُفِرَلَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ» ''اللہ تعالیٰ اس کے سابقہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔'' یہ اس رات کا مقام ہے، اس رات کا قیام سارے گناہوں کی بخشش کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ مقام اسی لیے حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس عظیم رات میں قرآن پاک اتارا۔ ﴿فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ﴾ ''اس رات بڑے بڑے امور کے فیصلے ہوتے ہیں۔'' [2] یہ تعلق بالقرآن کی بنا پر، جبریل امین نبی پاک ﷺ کے ساتھ رمضان میں قرآن کا دور کیا کرتے تھے، یعنی انھوں نے بھی قرآن کے دَور کے لیے رمضان کے مہینے کا انتخاب کیا۔ جس سال رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا اس سال کے رمضان میں دوبار دور کیا۔ [3]

قرآن اور روزے کا شفاعت کرنا

اس عمل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن پاک کی تلاوت کا رمضان کے ساتھ ایک گہرا تعلق ہے۔ اسی لیے پیغمبر علیہ السلام کا فرمان ہے: «إِنَّ الصِّيَامَ وَالْقُرْآنَ يَشْفَعَانِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» ''روزہ اور قرآن دونوں قیامت کے دن بندے کے لیے سفارش کریں گے۔'' دونوں مل کر سفارش کریں گے، دونوں ساتھ آئیں گے۔ اور یہ عظیم سفارش ہے۔ بندہ اللہ کے سامنے کھڑا ہے۔ اس کی نیکیاں اور بدیاں شمار ہو رہی ہیں۔ نیکیوں

[1] صحيح البخاري، حديث:1901. [2] الدخان 44:4. [3] صحيح البخاري، حديث:4998.

اور بدیوں کا وزن ہو رہا ہے۔ اور یہ وزن کا مرحلہ بڑا کٹھن اور گھمبیر مرحلہ ہے۔ امام لالکائی شرح اعتقاد اہل السنہ میں یہ حدیث لائے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ قیامت کے دن اعمال تولے جائیں گے۔ اور فیصلہ کیسے ہوگا؟ یہ بڑی ہولناک حقیقت ہے۔ فیصلہ کیسے ہوگا؟ فرمایا: «مَنْ رَجَحَتْ حَسَنَاتُهُ عَلَى سَيِّئَاتِهِ مِثْقَالَ صُؤَابَةٍ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ رَجَحَتْ سَيِّئَاتُهُ عَلَى حَسَنَاتِهِ مِثْقَالَ صُؤَابَةٍ دَخَلَ النَّارَ» [1] یہ فیصلہ ہے۔ فرمایا کہ جس کی نیکیاں گناہوں سے جُوں کے انڈے کے برابر بڑھ گئیں، وہ جنت میں جائے گا اور جس کے گناہ نیکیوں سے جُوں کے انڈے کے برابر بڑھ گئے، وہ جہنم میں جائے گا۔

یہ جُوں کا انڈہ جس کا کوئی وزن نہیں ہوتا، دنیا کا کوئی پیمانہ اس کا وزن نہیں کر سکتا۔ اتنا چھوٹا انڈہ، اتنے چھوٹے انڈے کے بقدر اگر اس کے گناہ بڑھ گئے، نیکیاں کم ہوگئیں تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جہنم کا فیصلہ کر دے گا۔ کتنی خوفناک حقیقت ہے۔ اس وقت ایک آواز آئے گی: «يَا رَبِّ! إِنِّي مَنَعْتُهُ مِنَ النَّوْمِ بِاللَّيْلِ» ''اے اللہ! میں نے اس بندے کو راتوں کو سونے نہیں دیا۔ میں نے اسے جگائے رکھا، یہ لمبے قیام کرتا اور میری تلاوت کرتا۔'' یہ قرآن کی آواز ہے۔ اور قرآن کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اللہ کی صفت ہے۔ یہ اللہ سے سفارش کر رہا ہے۔ میں نے اسے سونے نہیں دیا۔ دوسری آواز آئے گی: «يَا رَبِّ! إِنِّي مَنَعْتُهُ مِنَ الشَّهَوَاتِ بِالنَّهَارِ» ''اے اللہ! میں نے اس بندے کو کھانے سے، پینے سے اور دیگر خواہشات سے روکے رکھا۔'' ایک آواز دن کے تعلق سے ہے اور ایک آواز رات کے تعلق سے ہے۔ دن کی آواز

[1] كنز العمال، حديث:39025.

روزے کی اور رات کی آواز قرآن کی۔ یہ راتوں کی گھڑیوں میں اٹھ کر مجھے پڑھتا، میری تلاوت کرتا، دونوں کہیں گے: «فَشَفِّعْنِي فِيهِ» ''میری سفارش قبول کرلے اس بندے کے بارے میں۔'' اس کو معاف کر دے، اس کا حساب آسان کر دے۔ «فَيُشَفَّعَانِ» حدیث کے الفاظ ہیں کہ دونوں کی سفارش قبول کر لی جائے گی۔ [1]

اللہ رب العزت قرآن اور روزے کی سفارش قبول کر کے اس بندے کی نجات، مغفرت اور جنت کے داخلے کا حکم کر دے گا۔ یہ تعلق وہاں بھی قائم ہے روزے کا اور قرآن کا۔ اس حدیث میں ایک نکتہ ہے کہ قرآن پاک کی تلاوت رات کو چھپ کر کی جائے تاکہ یہ عمل اخلاص پر قائم رہے۔ بندہ دن کو بھی کرے، لیکن رات کی گھڑیاں ضرور منتخب کرے۔ رات کی تاریکیوں کے عمل، اندھیروں کے عمل اور تنہائیوں کے نیک عمل اللہ کو بڑے پسند ہیں۔ «ثَلَاثَةٌ يَضْحَكُ اللّٰهُ إِلَيْهِمْ» ''تین بندے ایسے ہیں جن کے عمل کو دیکھ کر اللہ ہنستا ہے، مسکراتا ہے۔'' [2] وہ عمل چاہے گھنٹوں قائم رہے۔ اللہ تعالیٰ ان بندوں کو دیکھ کر گھنٹوں مسکراتا رہتا ہے۔ کیا توجہ اور پیار کا عالم ہے۔ ان میں سے ایک نیک بندہ وہ ہے جو لوگوں سے چھپ کر رات کا قیام کرے، لمبا قیام، قرآن کی تلاوت کرے۔ جس کی یہ حرص ہے کہ کسی کو یہ عمل دکھائی نہ دے، یہ عمل تاریکی اور تنہائی میں ہو۔ جب تک وہ قیام میں مصروف رہتا ہے، قرآن پاک کی تلاوت کرتا رہتا ہے اس وقت تک اللہ رب العزت اسے دیکھ کر مسکراتا رہتا ہے۔

یہ ہے اللہ کی رضا۔ نبی ﷺ نے صحابی طلحہ کا جنازہ پڑھایا۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم نے

[1] صحيح الجامع الصغير للألباني: 23/3، و شعب الإيمان للبيهقي حديث: 1839.

[2] مسند أحمد: 80/3 ضعفه الألباني.

اللہ کے پیغمبر ﷺ کی دعا سنی اس صحابی کے بارے میں: «اَللّٰهُمَّ الْقَ طَلْحَةَ وَأَنْتَ تَضْحَكُ إِلَيْهِ وَهُوَ يَضْحَكُ إِلَيْكَ» ''اے اللہ! تو اپنے اس بندے طلحہ سے اس طرح ملنا کہ تو اسے دیکھ کر ہنسے، یہ تجھے دیکھ کر ہنسے۔'' [1] یہ محبت اور رضا کتنی بڑی نعمت ہے۔ جب تک وہ بندہ چھپ کر تاریکی میں، اندھیرے میں قرآن پڑھتا رہے گا اور قیام میں مصروف رہے گا تب تک اللہ رب العزت اسے دیکھ کر ہنستا رہے گا، مسکراتا رہے گا۔ یہ روزہ اور قرآن دونوں ساتھ آرہے ہیں بندے کی سفارش کرنے کے لیے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ان دونوں کا باہم بڑا گہرا تعلق اور ساتھ ہے۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے: «اِقْرَءُوا الْقُرْآنَ» ''قرآن خوب پڑھو۔'' «فَإِنَّهُ يَأْتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَفِيعًا لِّأَصْحَابِهِ» ''یہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کی سفارش کرنے کے لیے آئے گا۔'' [2] بعض سورتوں اور آیتوں کا یہ مقام حدیثوں میں بیان ہوا ہے کہ یہ سورتیں اور آیتیں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس بندے کو بخشوائیں گی۔ تُحَاجَّانِ کے الفاظ ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے اس وقت تک جھگڑیں گی، لڑیں گی جب تک اس بندے کو جنت میں نہ پہنچا آئیں۔ رات کی گھڑی میں سورۂ ملک کی تلاوت، جس کے بارے میں حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات کو اس وقت تک سوتے نہیں تھے جب تک اس سورت کی تلاوت نہ کر لیتے۔ [3] سورۂ ملک، تیس آیتیں اور سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں، ان کی بھی یہی فضیلت ہے۔ [4] کچھ آیتیں، کچھ سورتیں ایسی ہیں جن کو خاص طور پر پڑھنا چاہیے۔

[1] الإصابة في تمييز الصحابة: 525/3. [2] صحيح مسلم، حديث: 804. [3] صحيح الجامع الصغير: 446/1. [4] صحيح مسلم، حديث: 807.

سورۂ اخلاص کی فضیلت

ایک شخص ہر نماز میں سورۂ اخلاص پڑھتا تھا۔ وجہ پوچھی گئی؟ اس نے کہا کہ «إِنِّي أُحِبُّهَا» ”مجھے اس سورت سے بہت محبت ہے۔“ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «حُبُّكَ إِيَّاهَا أَدْخَلَكَ الْجَنَّةَ» ”اس سورت کی محبت نے تمھیں جنت میں پہنچا دیا ہے۔“[1]

معاویہ بن معاویہ المزنی رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا۔ نبی ﷺ اس کا جنازہ پڑھتے ہیں۔ جنازے کے بعد آپ پر عجیب انکشاف ہوا۔ اس کے جنازے میں جبریل امین بھی تھے۔ پچاس ہزار فرشتوں کے ساتھ اللہ کے نبی سے ملنے آئے تو آپ نے جبریل سے پوچھا کہ اسے آپ نے اتنا اعزاز کیوں دیا؟ اس کے جنازے میں آپ نے شرکت کی، اس اعزاز کی وجہ؟ فرمایا کہ ہمیں خاص طور پر اللہ نے بھیجا ہے۔ اس کا ایک عمل تھا بڑا ہی پیارا عمل۔ «كَانَ يَقْرَءُ قُلْ هُوَاللّٰهُ أَحَدٌ قَائِمًا وَّقَاعِدًا وَّرَاكِبًا وَّجَالِسًا» ”یہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، سواری پر جاتے ہوئے ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ پڑھا کرتا تھا۔“[2]

یہ سورت کثرت سے پڑھا کریں۔ یہ تلاوت اگر ماہِ صیام میں روزے کے ساتھ ہو، تو کتنا اس کا اجر وثواب ہوگا، لہٰذا تلاوت قرآن کا اس ماہ صیام کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ، امام دارالہجرہ پوری زندگی حدیثیں پڑھتے پڑھاتے رہے۔ تلامذہ کا ایک حلقہ ہوتا جنھیں درس حدیث دیتے رہے۔ ان کا یہ عمل منقول ہے کہ جب رمضان شروع ہوتا، حدیثوں کے دفاتر بند کر دیا کرتے اور قرآن کی تلاوت میں منہمک ہوجاتے۔ پھر ایک ایک نشست میں کئی کئی پارے پڑھتے۔ اس ایک مہینے میں کئی بار قرآن مکمل

[1] صحيح البخاري، حديث:774. [2] السنن الكبرٰى للبيهقي:260/2.

کرتے۔ بعض محدثین نے لکھا ہے کہ قرآن پاک کم از کم تین دن میں ختم کرنا چاہیے لیکن رمضان کے علاوہ۔ رمضان میں خوب پڑھو۔ اگر دن میں ختم کر سکتے ہو تو کرلو۔ اس کی ایک ایک گھڑی سے فائدہ اٹھاؤ۔

قرآن پڑھنے کے فوائد اور روزہ

کثرت سے قرآن پڑھنے کے بڑے فائدے ہیں۔ ایک تو دل کا زنگ دور ہوتا ہے۔ کچھ اعمال ایسے ہیں جن سے دلوں کا زنگ دور ہوتا ہے، یہ پتھر دل موم ہوجاتے ہیں۔ قرآن کی تلاوت، اللہ کا ذکر، یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرنا، یتیم کی کفالت اور انفاقِ مال۔ ان تمام امور سے دل نرم ہوتے ہیں اور دلوں کے زنگ دور ہوتے ہیں۔ اس بارے میں حدیثیں موجود ہیں۔ قرآن پاک کی تلاوت سے دل نرم ہوتے ہیں اور دل نرم کیوں نہ ہوں، قرآن کی تو شان یہ ہے: ﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خٰشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ فرمایا کہ ”اس قرآن کو اگر ہم پہاڑوں پر اتار دیں تو تم پہاڑوں کو دیکھتے، اللہ کی خشیت سے ریزہ ریزہ ہوجاتے۔“[1] اگر قرآن کے نزول کے ساتھ یہ پہاڑ مکلّف ہوتا تو اتنی سخت مخلوق اللہ کی خشیت سے ریزہ ریزہ ہوجاتی۔ دل تو پھر بھی ایک کمزور سی چیز ہے۔ گوشت کا لوتھڑا ہے، یہ تو ضرور نرم ہوگا۔ قرآن پاک کی تلاوت کا یہ فائدہ ہے۔ کثرت سے قرآن کی تلاوت کیا کرو۔ رمضان کے مہینے میں، روزے کی حالت میں، رمضان کی راتوں میں کثرت سے تلاوت قرآن کا ایک فائدہ یہ ہے کہ بندے کی زبان منفی امور سے کٹ جائے گی۔ منفی امور کیا ہیں؟

[1] الحشر 21:59.

جن کو آفات اللسان کہا جاتا ہے۔ زبان کی آفتیں: غیبت، جھوٹ، دروغ گوئی، چغلی، الزام تراشی، بہتان طرازی، یہ زبان کی وہ آفتیں ہیں جو بندے کو برباد کر دیتی ہیں۔

یہ بات یاد رکھو! جس چیز کے جتنے فضائل زیادہ ہوں اس چیز کی قدر کو اگر ضائع کرو گے تو گناہ بھی اسی مقدار میں ہوگا۔ محمد رسول اللہ ﷺ جن کے عمل، جن کی نیکیاں، جن کا اسوہ، جن کی سیرت امت کے لیے آئیڈیل ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ اگر تم کفار کی طرف مائل ہوگئے، معصیت کی طرف مائل ہوگئے تو تمھیں زندگی میں بھی دہرا عذاب دوں گا اور قیامت کے دن بھی دہرا عذاب۔ [1] اسی طرح رمضان کے تقدس کو اگر مجروح کروگے، روزہ رکھ کر جھوٹ بولو گے، یا غیبتیں کرو گے، اس کا وبال بھی اسی طرح شدید ہوگا جس طرح اس کا ثواب عظیم ہے۔ ثواب کیا ہے؟ «اَلصَّوْمُ لِي وَأَنَا أَجْزِي بِهِ» حدیث قدسی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''روزہ میرے لیے ہے، اس کی جزا میں ہی دے سکتا ہوں اور کوئی نہیں دے سکتا۔'' [2] کسی کو معلوم ہی نہیں اس کی جزا۔ سارے فرشتے مل کر بھی اس کی جزا نہیں دے سکتے۔ انھیں پتہ نہیں اس کا ثواب کیا ہے۔ اس کا ثواب میں ہی دوں گا۔ تو اس لیے اس عظیم عبادت کا تقدس پامال کرو گے تو وبال بھی اسی طریقے سے ہوگا۔ وبال کیا ہے؟ «بُعْدًا لِّمَنْ أَدْرَكَ رَمَضَانَ فَلَمْ يُغْفَرْ لَهُ» ''جو رمضان کا مہینہ پالے اور پھر اپنے گناہ بخشوا نہ سکے، اسے اللہ کی رحمت سے دھتکار دیا جاتا ہے۔'' [3] اللہ کی رحمت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهِ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِي أَنْ

[1] بنيٓ إسرآءيل 17:74، 75. [2] صحيح البخاري، حديث:7492. [3] مصنف ابن أبي شيبة: 2/3.

يَّدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ» ''جو شخص جھوٹ کہنا اور جھوٹ اپنانا نہ چھوڑے (رمضان کے مہینے میں) تو اللہ تعالیٰ کو اس کے بھوکا اور پیاسا رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' [1] وہ یہ ڈھونگ چھوڑ دے، جائے کھائے پیے، اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ وبال بھی اتنا ہی شدید۔ تو کیوں نہ اس زبان کی حفاظت کی جائے اور اس کا بہترین فارمولا تلاوتِ قرآن ہے۔ قرآن پڑھو گے تو دل نرم ہوگا، بندش دور ہوگی۔ رکاوٹیں دور ہوں گی۔ عداوتیں دور ہوں گی۔ اور قرآن کی تلاوت کے دوران میں غیبت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور جب دلوں کی رنجشیں دور ہوجائیں گی تو مستقبل میں زبان محفوظ رہے گی۔ یہ قرآن پاک کی تلاوت کا پھل ہے۔

بندہ زندگی بھر نیک عمل کرتا ہے اور نیک عمل کرتے کرتے جنت کے دہانے پر پہنچ جاتا ہے۔ حدیثوں میں شبر (بالشت) کے الفاظ ہیں تو اس کے اور جنت کے درمیان میں ایک بالشت کا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے اور وہاں پہنچ کر زبان سے ایک کلمہ ایسا بولتا ہے، ایک بات ایسی کہہ دیتا ہے کہ اس کی ایک ہی بات اس کو جہنم میں پھینک دیتی ہے۔ [2] اس میں کوئی تمیز نہیں چھوٹے بڑے کی۔ غلط بول بولنے والا کوئی ہو، بڑا ہو، چھوٹا ہو، گناہ گار ہو یا کوئی نیکوکار ہو۔ سیدہ عائشہ صدیقہ ؓ کا اتنا اونچا مقام ہے۔ انھیں ایسے شرف اور امتیاز حاصل ہیں کہ شاید ہی امت کے کسی انسان کو حاصل ہوں۔ اللہ کے پیغمبر سے پوچھا گیا: آپ کو سب سے بڑھ کر پیار کس سے ہے؟ فرمایا کہ عائشہ سے۔ [3] ایک حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «فَضْلُ عَائِشَةَ عَلَى النِّسَاءِ

[1] صحيح البخاري، حديث:1903. [2] صحيح البخاري، حديث:6478. [3] صحيح البخاري، حديث:3662.

كَفَضْلِ الثَّرِيدِ عَلٰى سَائِرِ الطَّعَامِ» ''عائشہ کی فضیلت دنیا کی تمام عورتوں پر ایسی ہے جیسے ثرید کی فضیلت تمام کھانوں پر ہے۔'' [1] اللہ کے پیغمبر کو کھانے میں سب سے زیادہ ثرید پسند تھا۔ ثرید بولتے ہیں روٹی کے ٹکڑے کر کے ان کو شوربے میں بھگو دیا جائے۔ جب وہ اچھی طرح نرم اور ملائم ہو جائے تو پھر آپ اس کو تناول فرمائیں۔ اسے ثرید بولتے ہیں۔ فرمایا کہ جو ثرید کی فضیلت تمام کھانوں پر ہے، وہ عائشہ کی فضیلت تمام عورتوں پر ہے۔

رسول اللہ ﷺ عائشہ صدیقہ کے ساتھ جنھیں یہ امتیاز حاصل ہے، ایک لحاف اوڑھے سو رہے ہوتے، اس حال میں جبریل وحی لے کر آ جاتے۔ [2] اور بعض اوقات وحی لے کر آتے اور جاتے ہوئے کہتے کہ عائشہ کو میرا سلام کہنا۔ [3] ان پر الزام لگا تو براءت کے لیے اللہ نے وحی اتار دی۔ [4] ایسی وحی جو تا قیام قیامت منبروں پر اور محرابوں میں پڑھی جائے گی۔ قرآن کا حصہ بن گئی۔ اتنی عظیم ان کی شان، اتنا عظیم ان کا مقام، امت کی فقیہہ، امت کی محدثہ، دو ہزار سے زیادہ جنھوں نے اللہ کے پیغمبر کے عمل اور فرامین منتقل فرمائے۔ نبی ﷺ کے عمل دیکھے اور منتقل فرمائے۔ نبی ﷺ کی حدیث ہے کہ تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں: ایک قرآن دوسری چیز میرے اہل بیت۔ [5] اس کے کیا معنی؟ ہمارے پاس قرآن ہے اور اہل بیت ہیں۔ اہل بیت تقریباً میری آدھی زندگی کا عمل تم تک پہنچائیں گے۔ میں گھر میں کیا کرتا ہوں؟ یہ عام لوگ نہیں جانتے، یہ میرے گھر والے جانتے ہیں۔ یہ علم میرے اہل بیت تم تک پہنچائیں گے۔

[1] صحيح البخاري، حديث:3433. [2] صحيح البخاري، حديث:2581. [3] صحيح البخاري: 3768. [4] النور 24:11. [5] جامع الترمذي، حديث:3786 و 3788.

تو اس حدیث کا مصداق سب سے اول کون ہے؟ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جو اللہ کے پیغمبر کی دو ہزار سے زائد سنتیں اور آپ کا علم اور آپ کے فرامین نقل کرتی ہیں۔ کتنا اونچا مقام ہے؟ ایک دفعہ نبی ﷺ کی ایک بیوی نے دوسری بیوی کو ٹھگنا کہہ دیا کہ چھوٹے پن کی ہو، اور ان کا قد واقعی چھوٹا تھا۔ جو عیب بیان کیا وہ موجود تھا۔ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: «لَقَدْ قُلْتِ كَلِمَةً لَّوْ مُزِجَتْ بِمَاءِ الْبَحْرِ لَمَزَجَتْهُ» [1] ''تم نے ایک ایسی بات کہہ دی ہے کہ تمھاری بات اگر سمندر میں ڈال دی جائے تو سمندر کا پانی کڑوا اور سیاہ ہو جائے۔'' یعنی تمھارے اس ایک کلمے کو، تمھاری اس ایک بات کو سمندر میں گرا دوں سمندر کے پانی کی سفیدی ختم ہو جائے، پانی سیاہ ترین اور کڑوا ترین ہو جائے۔ اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ غیبت کرنے والا کون ہے: کوئی گناہ گار ہے یا کوئی مسجد کا چودھری ہے، کوئی مدرسے کا مہتمم ہے یا کوئی حاجی ہے یا کوئی متقی اور پرہیز گار ہے، کوئی بھی ہے۔ عائشہ سے بڑھ کر کوئی نہیں ہوسکتا۔ اللہ اکبر۔ اس لیے زبان کے غلط استعمال کو روکیں۔ بندہ جب تک قرآن پڑھے گا، کسی کی غیبت نہیں کرے گا۔ اس لیے کثرت سے قرآن پاک کی تلاوت کا اہتمام کریں۔ روزے کی جو حفاظت ہے اس میں مرکزی کردار قرآن پاک کی تلاوت کا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «إِنَّ لِلّٰهِ عِنْدَ كُلِّ فِطْرٍ عُتَقَاءَ» [2] رمضان میں اللہ کے کچھ بندے عتیق ہیں۔ عتقاء، عتیق کی جمع ہے۔ عتیق بولتے ہیں آزاد کردہ غلام کو یا ایسے شخص کو جسے آزاد کر دیا جائے۔ جیل سے آزاد کر دیا جائے یا کسی تکلیف سے آزاد کر دیا جائے، یا کسی غلامی سے آزاد کر دیا جائے۔ فرمایا کہ رمضان کے مہینے میں کچھ

[1] سنن أبي داود: 4875. [2] سنن ابن ماجه، حديث:1643، والمعجم الكبير للطبراني: 288/7.

اللہ کے عتیق ہیں جن کو اللہ اپنے خاص آرڈر سے جہنم سے آزاد کرتا ہے اور کب کرتا ہے؟ «عِنْدَ كُلِّ فِطْرٍ» رمضان میں ہر افطاری کے وقت، اللہ اپنے آرڈر سے ان کو جہنم سے آزاد کر دیتا ہے۔ یہ بھی بڑی فضیلت ہے۔ افطار کے وقت اس لیے کہ ان کا دن بھر کا معمول دیکھا جاتا ہے۔ روزہ ان کا محفوظ رہا ہے یا نہیں؟ آنکھوں سے کیا دیکھا؟ اگر دن بھر آنکھوں سے قرآن دیکھتے رہے، اللہ تعالیٰ کے فرامین دیکھتے رہے یہ آنکھوں کی کتنی بڑی عبادت ہے۔ محدثین نے لکھا ہے کہ قرآن کا حافظ بھی ہو تو اس کے لیے بھی بہتر ہے کہ زبانی پڑھنے کے بجائے دیکھ کر پڑھے تاکہ آنکھوں سے قرآن کو دیکھنے کا ثواب بھی اسے ملے۔ روزہ ہاتھوں کا بھی ہے، روزہ زبان کا بھی ہے، روزہ کانوں کا بھی ہے۔ بلند آواز سے پڑھے گا، اپنی آواز کو خود سنے گا، آنکھوں سے قرآن دیکھے گا، زبان سے قرآن کی تلاوت کرے گا روزے کی حالت میں۔

اللہ اچھی آواز کو پسند کرتا ہے

رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے: «مَا أَذِنَ اللّٰهُ لِنَبِيٍّ مَّا أَذِنَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَّتَغَنّٰى بِالْقُرْآنِ»[1] اللہ تعالیٰ کسی کلام اور کسی بات کو اتنی توجہ اور شوق سے نہیں سنتا جتنا شوق سے قرآن کی تلاوت سنتا ہے۔ بندہ قرآن پڑھ رہا ہے، کوشش کرے اچھی آواز سے پڑھے۔ اچھے طریقے سے گائے، ایسا نہ گائے کہ قرآن کو بگاڑ دے۔ شد اور مد کو بگاڑ دے۔ جس طرح ہمارے بعض واعظ جھوم جھوم کر پڑھتے ہیں۔ وہ قرآن کیا پڑھتے ہیں؟ قرآن کی توہین کرتے ہیں۔ اچھی آواز سے پڑھنا اور گانا دوسرا گانا نہیں۔ قرآن پاک

[1] صحيح البخاري، حديث:5024.

کے قواعد کا، تلاوت کے قواعد کا، مخارج کا، حروف کی ادائیگی کا اور جو زبر، زیر تمام حرکات ہیں اور جو مد اور شد ہیں، ہر چیز کا اعتبار کرے اور اچھی آواز نکالنے کی کوشش کرے۔ اس اچھی آواز کو جس شوق سے اللہ سنتا ہے، اتنے شوق سے دنیا کی کسی اور بات کو نہیں سنتا۔ اللہ کتنے شوق سے بندے کو دیکھ رہا ہے۔ تو تلاوت قرآن کے کتنے محاسن ہیں۔ بندہ قرآن کو دیکھ رہا ہے، یہ آنکھوں کی عبادت ہے۔ بندہ قرآن کی تلاوت کر رہا ہے تو یہ بنی اس کی زبان کی عبادت۔ اپنی تلاوت کو سن رہا ہے تو یہ ہوئی اس کے کانوں کی عبادت۔ اور اس کا وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت میں صرف ہو رہا ہے۔ منفی امور سے بچا ہوا ہے، وہ خود زبان کی آفتوں سے محفوظ ہے۔ اسی طرح اگر اس کا روزہ گزرتا جائے تو بالآخر جب افطار کا وقت ہوگا، اس کا روزہ تمام گناہوں سے پاک ہوگا تو اللہ رب العزت افطار کے وقت اس بندے کو جہنم سے آزاد کرنے کا پروانہ اور اپنا حکم جاری کر دے گا اور ہر روز ایسا ہوگا۔

اعتکاف کی فضیلت

خاص طور پر میرے معتکف بھائی جو اعتکاف میں بیٹھے ہوئے ہیں، جو اعتکاف کی چار دیواری میں چھپے ہوئے ہیں، کوشش کریں کہ زیادہ وقت اندر ہی گزاریں۔ لوگوں سے چھپ کر قرآن کی تلاوت کریں، اللہ کا ذکر کریں۔ یہ اعتکاف کی عبادت اسی لیے ہے تاکہ بندہ ریاکاری سے بچنے کی پوری کوشش کرے۔ چار دیواری کے اندر محصور ہے، کسی کو معلوم نہیں اندر کیا ہو رہا ہے۔ وہ اندر اللہ کا ذکر کرے، قرآن کی تلاوت کرے، اپنا اخلاص پیش کرے، اسی لیے اس عبادت کی اتنی شان ہے۔ رسول اللہ ﷺ

کا فرمان ہے: «مَنِ اعْتَكَفَ يَوْمًا» جو ایک دن کا اعتکاف کر لے اللہ کے لیے، ایک دن کا اعتکاف۔ «جَعَلَ اللَّهُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ جَهَنَّمَ ثَلَاثَ خَنَادِقَ كُلُّ خَنْدَقٍ أَبْعَدَ مِمَّا بَيْنَ الْخَافِقَيْنِ» [1] ایک دن کا اعتکاف کر لے، اللہ اس کے اور جہنم کے درمیان تین خندقیں کھدوا دیتا ہے۔ ہر خندق کا فاصلہ مشرق اور مغرب کے فاصلے کے بقدر ہوگا۔ یہ خندق اتنی چوڑی ہوتی ہے کہ اس کا فاصلہ مشرق اور مغرب کے فاصلے کے برابر ہوتا ہے۔ جہنم سے اتنی دوری پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ تو ایک دن کے اعتکاف کی فضیلت ہے اور اگر یہ اعتکاف پورے عشرے کا ہو، دس دن کا ہو، دس راتوں کا ہو تو اس کا ثواب کتنا ہوگا۔ کوشش کریں کہ اندر رہیں، اللہ کا ذکر کریں، قرآن پاک کی تلاوت کریں، اللہ کے پیغمبر پر درود بھیجیں۔ اس کا فائدہ یہ بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث کا مفہوم ہے۔ ایک شخص اگر قرآن پاک پڑھتا رہے تو اس کے دل کی جو بھی تمنائیں ہیں، جو بھی خواہشات ہیں اللہ بن مانگے پوری کر دے گا۔ [2]

تو حقیقت یہ ہے کہ رمضان کا اور قرآن کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ قرآن کا نزول اس مہینے میں ہوا۔ اور روزے کی حالت میں قرآن کی تلاوت اس لیے بھی ضروری ہے کہ روزہ اور قرآن لازم وملزوم ہیں۔ یہاں بھی اکٹھے اور قیامت کے دن بھی اکٹھے آئیں گے اور بندے کی شفاعت کریں گے، تو حقیقت یہ ہے کہ نیکیوں کے یہ مواقع ہیں، ان کو ضائع نہ کریں۔ قرآن پاک کی تلاوت کریں اور اپنے روزے کو قرآن پاک کی تلاوت سے مزین کریں تا کہ وہ فضائل ہم کو حاصل ہوں جن کی برکت سے افطار کے وقت اللہ تعالیٰ ان گردنوں کو جہنم سے آزاد کر دے۔

[1] ضعيف الترغيب والترهيب: 1/167. [2] جامع الترمذي، حديث: 2926، ضعفه الألباني.

روزے دار کے لیے دو خوشیاں

«لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ، فَرْحَةٌ عِنْدَ فِطْرِهِ وَفَرْحَةٌ عِنْدَ لِقَاءِ رَبِّهِ» [1] اللہ تعالیٰ روزے دار کو دو موقعوں پر خوش کر دے گا۔ ایک افطار کے وقت اللہ اسے خوش کر دے گا۔ یہ خوشی دو طرح کی ہے: ایک روحانی اور ایک جسمانی۔ جسمانی خوشی اس طرح کہ افطاری کی نعمتیں سامنے پڑی ہوئی ہیں، بندہ دن بھر کا بھوکا اور پیاسا۔ افطار کرے گا، اللہ کی یہ نعمتیں کھائے گا، یہ بھی خوشی کی بات ہے۔ اللہ کا رزق کھائے گا، بندہ بھی خوش اور اللہ بھی خوش ہے اور اللہ خوش کیوں نہ ہو؟ اللہ کا پاکیزہ رزق اللہ کے نیک بندے کھا رہے ہیں۔ اللہ خوش کیوں نہ ہو؟ اللہ اپنے بندے سے پیار کرتا ہے، اتنا پیار کہ ایسا پیار ماں اپنے بیٹے سے نہیں کرتی۔ اور آپ دیکھتے ہیں کہ ماں بیٹے کو کس طرح کھلاتی ہے؟ کھانا لے کر بیٹے کے پیچھے پیچھے گھومتی ہے۔ بیٹا آگے بھاگ رہا ہے، ضد کر رہا ہے نہیں کھاؤں گا اور ماں منتیں کر رہی ہے کہ کھا لے۔ جب بیٹا کھاتا ہے تو کتنی خوش ہوتی ہے ماں!! میرے بیٹے نے کھا لیا۔ بیٹا نہ کھائے تو ماں رات بھر تڑپتی ہے کہ بیٹا بھوکا سو گیا۔ تو اللہ کو تو ماں سے بھی زیادہ پیار ہے اپنے بندوں سے۔ اللہ کی نعمتیں آپ کھائیں گے، اللہ کتنا راضی ہوگا۔ افطار کے دستر خوان کو وسیع کرو، خود بھی کھاؤ، ڈٹ کے کھاؤ اور اپنے بھائیوں کو بھی کھلاؤ۔ دعوتِ افطار کرو۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ”جو کسی روزے دار کو افطار کروائے گا، اللہ تعالیٰ اسے ان روزے داروں کے برابر ثواب دے دے گا، اس طرح کہ ان کے ثواب میں کمی نہیں ہوگی۔“ [2] ایک تو یہ خوشی ہے۔ دوسری خوشی روحانی خوشی ہے کہ اس وقت اللہ رب العزت اپنے بعض بندوں کو جہنم سے آزاد کر دیتا ہے۔

[1] صحيح مسلم، حديث: 1151. [2] سنن ابن ماجه، حديث: 1746.

اور دوسری خوشی کب ہوگی؟ «عِنْدَ لِقَاءِ رَبِّهِ» جب یہ بندہ اپنے رب سے جا ملے گا۔ دنیا کو چھوڑ جائے گا۔ اپنے کاروبار، رشتے دار، برادری اور قوم سب کو چھوڑ جائے گا، اپنے پروردگار سے جا ملے گا۔ اس وقت اللہ رب العزت بندے کو اتنا نوازے گا، اتنا نوازے گا کہ بندہ خوش ہوجائے گا۔کوئی پریشانی باقی نہیں رہے گی۔ «فَرْحَةٌ عِنْدَ لِقَاءِ رَبِّهِ» ''دوسری خوشی اس وقت ہوگی جب بندہ اپنے رب سے جا ملے گا۔'' رمضان کی یہ شان ہے۔رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ جنت سے کہتا ہے: «اِسْتَعِدِّي وَتَزَيَّنِي لِعِبَادِي» ''اے جنت تو تیار ہوجا اور میرے بندوں کے لیے سج جا۔'' «يُوشِكُ أَنْ يَّسْتَرِيحُوا مِنْ تَعَبِ الدُّنْيَا إِلَى دَارِي وَكَرَامَتِي» [1] ممکن ہے میرے بندے رمضان کے مہینے میں دنیا کو چھوڑ کر میرے پاس آ جائیں، دنیا کی مشقتوں سے آرام پانے کے لیے میرے پاس آ جائیں۔ اس وقت ان کی ضیافت کے لیے، ان کے استقبال کے لیے تو بالکل تیار ہو، سجی سنوری ہو، بالکل تیار ہو جا۔ رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے جب اللہ رب العزت اپنی جنت کو سنوارتا ہے، جنت کو سنورنے کا حکم دیتا ہے، جنت تو سنوری ہوئی ہے۔ اس میں مزید حسن پیدا ہوتا ہے، مزید نظافت پیدا ہوتی ہے۔ کن کے لیے؟ روزے دار بندوں کے لیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس ماہ صیام کا حق ادا کرنے کی توفیق دے۔ قرآن کی تلاوت کے ساتھ اپنے شب و روز کو مزین کرنے کی توفیق عطا فرما دے۔

وَأَقُولُ قَوْلِي هٰذَا وَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِي وَلَكُمْ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

[1] ضعیف الترغیب و الترہیب: 147/1.

رمضان کیسے گزاریں؟

رمضان کیسے گزاریں؟

خطبہ مسنونہ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر روزہ رکھنا اسی طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح ان لوگوں پر فرض کیا گیا تھا جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔''[1]

اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور (ہر) شخص کو دیکھنا چاہیے کہ اس نے کل (قیامت) کے لیے آگے کیا بھیجا ہے، اور تم اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ کو خوب خبر ہے اس کی جو تم عمل کرتے ہو۔''[2]

اللہ رب العزت کا ہم پر احسان ہے کہ ہماری زندگیوں میں ایک بار پھر یہ رمضان کا

[1] البقرۃ 2:183۔ [2] الحشر 59:18۔

مہینہ آیا۔ اس وقت یہ خوب آب و تاب کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔ یہ نیکیوں کا موسمِ بہار، مجھ جیسے سیاہ کاروں کی مغفرت کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اس کی ایک ایک ساعت قابل قدر اور اس لائق ہے کہ اسے غنیمت جانا جائے۔ اپنے پروردگار کو راضی کرنے کی سبیل کی جائے کیونکہ اللہ کی رضا ہی درحقیقت دنیا اور آخرت کی فوز وفلاح کی ضامن ہے۔

روزے کی فرضیت وفضیلت

رمضان کے روزے ایک بڑا محکم اور مؤکّد فریضہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کے ایک طویل خواب کا واقعہ منقول ہے۔ دو فرشتے بحالت خواب آپ کو باہر لے گئے۔ آپ نے مختلف مناظر مشاہدہ فرمائے۔ ایک منظر یہ بھی بیان کیا کہ وہ فرشتے مجھے چلتے چلتے ایک پہاڑ پر لے گئے۔ «جَبَلًا وَّعْرًا» وہ بڑا دشوار گزار پہاڑ تھا۔ فرشتوں نے کہا: «سَنُسَهِّلُهُ لَكَ» تم چڑھو، ہم آسانی پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ چڑھنے لگے۔ فرمایا کہ میں اس پہاڑ کے وسط میں پہنچا۔ میں نے چیخ پکار کی، رونے دھونے کی بڑی آوازیں سنیں۔ میں نے پوچھا کہ «مَا هٰذِهِ الْأَصْوَاتُ؟» یہ آوازیں کیا ہیں؟ فرشتوں نے بتایا: «عُوَاءُ أَهْلِ النَّارِ» یہ جہنمیوں کی چیخ پکار ہے۔ میں نے عرض کی کہ میں انھیں دیکھنا چاہتا ہوں، ان کا گناہ کیا ہے؟ مجھے وہ منظر دکھایا گیا۔ «مُعَلَّقِينَ بِعَرَاقِيبِهِمْ» کچھ لوگوں کو ایڑیوں سے باندھ کر الٹا لٹکایا گیا۔ «مُشَقَّقَةٌ أَشْدَاقُهُمْ» ان کے جبڑے پھٹے ہوئے ہیں اور ان سے خون کے فوارے چھوٹ رہے ہیں اور وہ مسلسل چلا رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ان کا کیا گناہ ہے؟ مجھے بتایا گیا: «يُفْطِرُونَ قَبْلَ تَحِلَّةِ صَوْمِهِمْ» یہ وہ لوگ ہیں جو

روزے رکھا کرتے تھے لیکن قبل از وقت افطار کرلیا کرتے تھے۔ [1] یہاں بتانا یہ مقصود ہے کہ جو دن بھر روزہ رکھے اور عین افطار سے کچھ ساعتیں قبل، دو منٹ، چار منٹ قبل اگر افطار کر لیتا ہے، یہ اس کی سزا ہے۔ الٹے لٹکا دیے گئے۔ جبڑے پھٹے ہوئے ہیں اور مسلسل تکلیف میں ہیں۔ جب تک قیامت قائم نہیں ہوجاتی یہ کیفیت قائم ہے۔ ان لوگوں کا کیا انجام ہوگا جو روزے رکھتے ہی نہیں ہیں؟ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ بڑا محکم فریضہ ہے۔ اسی لیے بعض احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جو شخص بلاعذر ایک روزہ چھوڑ دے، پھر زمانے بھر کے روزے اس ایک روزے کا کفارہ نہیں بن سکتے، [2] لہٰذا اس کی فرضیت کو پہچانو۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ كُتِبَ عَلَيۡكُمُ ٱلصِّيَامُ ﴾

''اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کردیے گئے ہیں۔'' [3]

سب سے پہلے ہمیں ان کی فرضیت کا شعور ہونا چاہیے۔ روزے کی جزا غیر محدود ہے۔ اس روزے کی قدر کیجیے۔ اس کی حدود کو پہچانیے۔ اور یہ کوشش کیجیے کہ ہمارا روزہ عنداللہ مقبول ہوجائے۔ صرف عمل کافی نہیں ہے بلکہ عمل کی قبولیت اصل چیز ہے۔ اس نیکی کی حفاظت کیجیے۔ اس نیکی کو دوچند کرنے کے لیے، اجر کو بڑھانے کے لیے، قبولیت کے زیادہ مواقع حاصل کرنے کے لیے ان چیزوں کو تلاش کرو جو اللہ کے پیغمبر روزے کی حالت میں کثرت سے کیا کرتے تھے۔ اس میں ایک عمل قرآن پاک کی تلاوت ہے۔

[1] المستدرك للحاكم: 253/3. [2] صحيح البخاري، قبل حديث: 1935، وسنن أبي داود، حديث: 2396. [3] البقرة 2:183.

قرآن مجید کی تلاوت

رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے:

«اَلصِّيَامُ وَالْقُرْآنُ يَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»

روزہ اور قرآن دونوں مل کر قیامت کے دن بندے کی سفارش کریں گے۔ [1]

یعنی قرآن اور صیام کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ اللہ رب العزت نے قرآن پاک کا نزول بھی رمضان میں فرمایا۔ لوح محفوظ سے قرآن پورے کا پورا رمضان کے مہینے میں فرشتوں کے سپرد کیا گیا اور پھر فرشتے آیات لے کر وقتاً فوقتاً اللہ کے پیغمبر کے پاس آتے لیکن پورے قرآن کا نزول لوح محفوظ سے آسمان کی طرف فرشتوں تک منتقل ہوا ماہِ رمضان میں۔ «كَانَ يَعْرِضُ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ الْقُرْآنَ كُلَّ عَامٍ مَرَّةً» جبریل امین اللہ کے پیغمبر کے ساتھ قرآن کا دور بھی رمضان کے مہینے میں کرتے تھے۔ [2] اس کا معنی یہ کہ رمضان کی عبادت اور قرآن کی تلاوت ان دونوں کا بڑا گہرا تعلق ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «اِقْرَءُوا الْقُرْآنَ فَإِنَّهُ يَأْتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَفِيعاً لِأَصْحَابِهِ» [3] قرآن کی تلاوت کرو، اس لیے کہ قرآن پاک قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کی سفارش کرتا ہوا آئے گا۔ یہ کتنا عظیم مقام ہوگا۔ ایک طرف روزے کی شفاعت، ایک طرف قرآن کی شفاعت۔ یہ قرآن کیا ہے؟ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ کلام الرحمٰن ہے۔ صفت الرحمٰن ہے۔ اس شفاعت کی کیا تاثیر ہوگی؟ اس لیے قرآن پاک کی کثرت سے تلاوت کریں لیکن رمضان کے مہینے میں اس کا اور بھی اہتمام کیجیے۔ اپنے اوقات کو، شب و روز کو قرآن پاک کی تلاوت میں صرف کیجیے۔

[1] مسند أحمد: 174/2. [2] صحيح البخاري، حديث: 4998. [3] صحيح مسلم، حديث: 804.

رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے: «يُؤْتَى بِالْقُرْآنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَأَهْلِهِ الَّذِينَ كَانُوا يَعْمَلُونَ بِهِ، تَقْدُمُهُ سُورَةُ الْبَقَرَةِ وَآلِ عِمْرَانَ ...... تُحَاجَّانِ عَنْ صَاحِبِهِمَا» قیامت کے دن قرآن کو لایا جائے گا اور پیچھے پیچھے وہ لوگ ہوں گے جو دنیا میں قرآن کی کثرت سے تلاوت کیا کرتے تھے۔ قرآن اس طرح آئے گا کہ پورے قرآن کے آگے سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران ہوں گی۔ پیچھے باقی قرآن ہوگا۔ اور پیچھے پڑھنے والے ہوں گے۔ سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کس شان سے آئیں گی؟ فرمایا کہ «تُحَاجَّانِ عَنْ صَاحِبِهِمَا» اپنے پڑھنے والوں کے لیے جھگڑتی ہوئی آئیں گی۔ یااللہ! میرے پڑھنے والوں کو تو نے آج ضرور کامیاب کرنا ہے۔[1]

یہ سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کی تلاوت کا مقام ہے کہ جو ان سورتوں کی کثرت سے تلاوت کرتے ہیں، یہ سورتیں ان بندوں کی خاطر قیامت کے دن اللہ سے جھگڑیں گی کہ یااللہ! ان بندوں کو ضرور معاف کر۔ ان کا ٹھکانہ جنت ہے۔ سورۃ الاخلاص ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝﴾ کے بارے میں فرمایا: «أَلَا! إِنَّهَا تَعْدِلُ ثُلُثَ الْقُرْآنِ» یہ ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔[2] دیکھیں! اللہ رب العزت نے ہمارے لیے کیسے کیسے مواقع تیار کررکھے ہیں۔ کیسے کیسے مواقع ہمیں مہیا کردیے۔ ایک چھوٹی سی سورت ایک تہائی قرآن کے برابر۔ چھوٹی چھوٹی سورتیں کس طرح ہماری عافیت اور نجات کا سامان پیدا کرتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ایک صحابی ہر رکعت میں ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ﴾ پڑھا کرتا تھا۔ اللہ کے پیغمبر نے پوچھ لیا کہ تم یہ سورت کیوں پڑھتے ہو؟ کہا کہ «إِنِّي أُحِبُّهَا» مجھے اس سورت سے بہت محبت ہے۔ فرمایا کہ «حُبُّكَ إِيَّاهَا أَدْخَلَكَ الْجَنَّةَ»[3]

[1] صحيح مسلم، حديث:805. [2] صحيح مسلم، حديث:812. [3] صحيح البخاري، حديث:774م

مجھے اللہ نے وحی کے ذریعے بتادیا کہ اس سورت سے محبت کی بنا پر اللہ رب العزت نے تمھیں جنت عطا فرمادی ہے۔

تو قرآن کے ساتھ تعلق بالخصوص رمضان کے مہینے میں یہ بڑا مبارک اور عظیم تعلق ہے۔ ماہِ صیام اور قرآن میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ یہ شوق، یہ محبت، قرآن کی تلاوت کا عزم اور شوق اللہ رب العزت جس دل میں ڈال دے، وہ بڑا عظیم انسان ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ یہاں مدینہ منورہ میں ایک بڑی محترم خاتون ہے ام ایمن رضی اللہ عنہا۔ اللہ کے پیغمبر گاہے گاہے اس کی زیارت کرنے جایا کرتے تھے۔ پتہ نہیں اس کا کیا حال ہوگا۔ چلو! ہم اس کی زیارت کرکے آتے ہیں۔ چنانچہ اللہ کے پیغمبر کے یہ دونوں دوست، یہ دونوں ساتھی ام ایمن رضی اللہ عنہا کے گھر چلے گئے۔ ام ایمن دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ گئیں کہ اب محمد رسول اللہ ﷺ نظر نہیں آتے۔ یہ دونوں ساتھی تسلیاں دے رہے ہیں کہ تم کیوں روتی ہو؟ اگر اللہ کے پیغمبر چلے گئے تو وہ بڑے بہترین حال میں ہیں۔ وہ بہشتوں کے وارث ہیں۔ اللہ کی نعمتوں میں متمتع ہورہے ہیں۔ اس میں رونے کی بات نہیں۔ وہ بڑے بہترین حال میں ہیں۔ ام ایمن رضی اللہ عنہا نے کہا: یہ بات میں بھی جانتی ہوں اور میرا رونا اس بنیاد پر نہیں ہے «وَلٰكِنْ إِنَّمَا أَبْكِي عَلَى الْوَحْيِ الَّذِي انْقَطَعَ»[1] میں اس لیے روتی ہوں کہ اللہ کے پیغمبر کے انتقال سے وحی کا نزول بند ہوگیا۔ وحی موقوف ہوگئی۔ اللہ کے پیغمبر زندہ تھے، جبریل وحی لے کرآتے، قرآن اترتا ہم سنتے، بڑی لذت آتی۔ لذت کے مواقع چھن گئے۔ دیکھیں ایک عورت کے دل میں

[1] مسند أحمد:3/248.

قرآن کی محبت، قرآن سننے کا شوق، نئی نئی آیتیں اور نئی نئی وحی کو حاصل کرنے کا شوق اللہ نے کیسا ڈالا ہوا ہے کہ یہ شوق دل سے جاتا ہی نہیں۔ اللہ کے پیغمبر کے جانے سے وحی کا سلسلہ موقوف ہوگیا، مجھے اس بات پر رونا آ رہا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے: «لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ» محمد ﷺ کو صرف دو انسانوں پر رشک آتا ہے۔ رشک کا معنی یہ کہ میں بھی ان جیسا بن جاؤں۔ کون؟ محمد رسول اللہ ﷺ قائدالانبیاء۔ کہا: مجھے کسی پر رشک نہیں آتا۔ نہ کسی کے حسن پر کہ مجھے یوسف علیہ السلام جیسا حسن مل جائے، نہ کسی کی طاقت پر کہ مجھے کسی پہلوان کی طاقت مل جائے۔ نہ کسی کی دولت پر کہ مجھے قارون جیسے خزانے مل جائیں۔ لیکن مجھے دو انسانوں پر رشک آتا ہے کہ میں ان جیسا بن جاؤں۔ «رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ الْقُرْآنَ فَهُوَ يَتْلُوهُ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ» ایک تو وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن دے دیا، اس کے سینے کو قرآن سے منور کردیا اور وہ دن رات قرآن کی تلاوت کرتا ہے۔ مجھے رشک آتا ہے کہ میں بھی اس جیسا بن جاؤں، حالانکہ اللہ کے پیغمبر قرآن کے حافظ تھے، صاحب وحی تھے۔ جبریل امین کے دوست، معلم قرآن، دن رات قرآن کی تلاوت کرتے لیکن فرماتے ہیں کہ مجھے قرآن پڑھنے والے پر رشک آتا ہے۔ قرآن کی تلاوت کا شوق اللہ نے جس کے سینے میں ڈال دیا، مجھے اس پر رشک آتا ہے۔

رمضان اور سخاوت

اور دوسرا «رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ مَالًا» وہ شخص جس کو اللہ نے مال دیا ہے۔ «فَسَلَّطَهُ عَلَى هَلَكَتِهِ فِي الْحَقِّ» وہ اس مال کو لگا دیتا ہے ان لوگوں پر جو دین حق کے کام

کرتے ہیں۔ فرمایا کہ وہ اپنا مال ان لوگوں پر لگا دیتا ہے بغیر گنے، بغیر دیکھے ان پر خرچ کرتا ہے۔ فرمایا کہ مجھے بھی اس انسان پر رشک آتا ہے کہ کاش میں بھی ایسا بن جاؤں۔ [1] حالانکہ محمد رسول اللہ ﷺ بہت بڑے سخی، سخاوت میں آپ کے مقام کو کوئی پا نہیں سکتا۔ «أَنَّهُ لَا يَرُدُّ سَائِلًا» آپ کا منصب کہ آپ نے کبھی کسی سائل کو لوٹایا نہیں۔ [2] اور خاص طور پر رمضان کے مہینے کے تعلق سے، حدیث میں آتا ہے کہ جونہی یہ داخل ہوتا تو جناب محمد رسول اللہ ﷺ تیز آندھی کی رفتار سے بھی بڑھ کر اپنا مال خرچ کیا کرتے تھے۔ [3] کتنے بڑے سخی؟ فرمایا کہ «مَا أُحِبُّ أَنَّ أُحُدًا ذَاكَ عِنْدِي ذَهَبٌ» میں نہیں چاہتا کہ اللہ تعالیٰ احد پہاڑ میرے لیے سونا بنا دے، میں نہیں چاہتا۔ کتنا بڑا پہاڑ! فرمایا: مجھے مال کا شوق ہی نہیں۔ اگر احد پہاڑ سونا بن جائے تو کروڑہا ٹن یہ سونا بن جائے۔ اگر احد پہاڑ میرے لیے سونا بن گیا تو تین دن گزرنے سے پہلے وہ سارا سونا غریبوں میں تقسیم کردوں گا۔ اپنے پاس ایک دینار بھی نہیں رکھوں گا۔ «إِلَّا دِينَارًا أَرْصُدُهُ لِدَيْنٍ» ہاں، اگر مجھے معلوم ہوا کہ میرا کوئی ساتھی، میرا کوئی دوست مقروض ہے، اس پر ایک دینار قرضہ ہے اور وہ یہاں موجود نہیں تو اس کے لیے ایک دینار سنبھال کر رکھ لوں گا کہ وہ آئے اور اپنا قرضہ ادا کردے، باقی تین دن گزرنے سے قبل میں سارا مال تقسیم کردوں گا۔ [4] کتنے بڑے سخی ہیں! فرمایا کہ مجھے اگر رشک آتا ہے تو اس سخی پر آتا ہے جو دین حق کی راہ میں کام کرنے والوں پر اپنا مال مسلط کر دے، ان پر ڈال دے۔ ڈالنے کا معنی جیسے بوریاں لاد دی جاتی ہیں اس طرح لاد دے

[1] صحيح البخاري، حديث: 7529 و صحيح مسلم، حديث: 816. [2] صحيح البخاري، حديث: 2093. [3] صحيح البخاري، حديث: 1902. [4] صحيح مسلم، حديث: 94 بعد الحديث: 991.

ان کے سروں پر کہ حق کی راہ میں اس مال کو خرچ کریں، اور مال داروں کے لیے نجات کا یہی ایک راستہ ہے ورنہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «اَلْمُکْثِرُوْنَ هُمُ الْأَخْسَرُوْنَ» زیادہ دولت والے قیامت کے دن سب سے زیادہ خسارے میں ہوں گے «إِلَّا مَنْ فَعَلَ هٰكَذَا وَهٰكَذَا» سوائے اس کے جو اپنے مال کے ساتھ یوں کرے۔ آپ نے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کر کے بتایا کہ تجوری کھولے اور یوں نکال نکال کر لوٹاتا جائے۔ [1] فرمایا کہ یہ خسارے میں نہیں ہے۔ یہ تو ایسا انسان ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ اس انسان پر رشک کرتے ہیں۔

روزے کی حفاظت

رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے: «رُبَّ صَائِمٍ لَّيْسَ لَهُ مِنْ صِيَامِهِ إِلَّا الْجُوعُ وَرُبَّ قَائِمٍ لَّيْسَ لَهُ مِنْ قِيَامِهِ إِلَّا السَّهْرُ» ”بہت سے روزے دار ایسے ہیں کہ جن کا حصہ ان کے روزوں سے سوائے بھوک اور پیاس کے کچھ نہیں اور بہت سے قیام کرنے والے ہیں جن کا حصہ ان کے قیام سے سوائے شب بیداری کی تکلیف کے اور کچھ نہیں۔“ [2] یہ کون لوگ ہیں؟ جو ریاکاری کے ذریعے اپنے روزے کو فاسد کرتے ہیں۔ بعض لوگ مجسم ریاکاری بن جاتے ہیں۔ پورا رمضان ان کے سر سے ٹوپی نہیں اترتی۔ تسبیح ہاتھ میں لے کر گھومتے ہیں۔ لوگوں کو دکھا رہے ہیں کہ ہم روزے سے ہیں۔ یہ رمضان کا مہینہ ہے۔ اللہ کے بندو! یہ ایک عبادت اللہ نے ایسی بنائی ہے جو کسی کو دکھائی نہیں دیتی جب تک خود اس کا اہتمام نہ کریں «اَلصَّوْمُ لِي»

[1] مسند أحمد: 2/525، وفيض القدير: 4/198. [2] سنن ابن ماجه، حديث: 1690، و صحيح الجامع للألباني: 2/327.

روزہ میرے لیے ہے۔ [1] اس جملے پر خوب غور کرو اور اس کے اس مقام کو پہچانو۔ یہ عبادت سراسر اخلاص کی بنیاد پر ہے۔ ریاکاری، نمود و نمائش اور اس قسم کے کسی اور تعلق سے اس عبادت کو فاسد نہ کرو، باطل نہ کرو بلکہ اس کے حقیقی اجر کو سمیٹنے کی کوشش کرو۔ ان مواقع کو تلاش کرو جو اللہ رب العزت کی رضا کا زیادہ باعث ہیں۔ رمضان کا مہینہ اللہ رب العزت نے ہمیں ایک بڑا عظیم اور بڑا عجیب مہینہ عطا فرمایا ہے۔

سحری کی فضیلت

دیکھیں آپ سحری کھاتے ہیں وہ آپ کی ضرورت ہے۔ آپ کھا رہے ہیں، آپ پی رہے ہیں۔ وہ آپ کی ضرورت ہے۔ سارا دن آپ نے فاقہ برداشت کرنا ہے، پیاس برداشت کرنی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے کہ یہ سحری غذائے مبارک ہے۔ اس کھانے میں برکت ہے۔ رزق کی کشادگی ہے۔ رسول اللہ ﷺ ایک دفعہ سحری کھا رہے تھے، عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ پاس سے گزرے، فرمایا کہ «هَلُمَّ إِلَى الْغَدَاءِ الْمُبَارَكِ» [2] ”اے عرباض! آؤ میرے ساتھ بیٹھو، یہ بابرکت کھانا کھالو۔“ رسول اللہ ﷺ کی ایک اور حدیث ہے: «إِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى الْمُتَسَحِّرِينَ» ”اللہ اور اس کے فرشتے سحری کھانے والوں پر صلاۃ بھیجتے ہیں۔“ [3] اللہ کے صلاۃ بھیجنے کا معنی رحمت اتارنا اور فرشتوں کے صلاۃ بھیجنے کا معنی استغفار کی دعائیں کرنا۔ جب تک آپ سحری کھا رہے ہیں، حالانکہ وہ آپ کی ضرورت ہے، اللہ رحمتیں اتار رہا ہے اور فرشتے آپ کے لیے استغفار کی دعائیں

[1] صحيح البخاري، حديث: 7492. [2] صحيح الترغيب والترهيب: 1/257. [3] صحيح الجامع للألباني: 2/172.

کررہے ہیں۔ روزے کی کس کس خوبی کا ذکر کیا جائے؟ روزہ بذاتِ خود ایک بہت بڑی نیکی ہے۔ ترکِ طعام، ترکِ شراب، ترکِ شہوات بذاتِ خود بہت بڑی نیکی ہے۔ یہ نیکی اگر اور عبادات کے ساتھ جمع ہو جائے تو اس کا اجر الگ ہے۔

افطاری کرانے کی فضیلت

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «مَنْ فَطَّرَ صَائِماً كَانَ لَهُ مِثْلُ أَجْرِهِمْ مِّنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أُجُورِهِمْ شَيْئًا» جو شخص کسی روزے دار کو افطار کرادے (اسے ایک کھجور پیش کردے، پانی کا ایک گھونٹ اخلاص سے پیش کردے) تو اللہ رب العزت افطار کرانے والے کو روزے دار کے برابر اجر دے دیتا ہے۔[1] اجر دوگنا ہوگیا۔ ایک اس کا اپنا اجر، ایک افطار کرانے کی بنا پر اجر۔ فرمایا کہ اللہ رب العزت اس کو اجر دے گا۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ روزے دار کا اپنا اجر کم کردیا جائے گا۔ فرمایا کہ اس کے اجر سے ایک سوئی کی نوک کے برابر بھی کمی نہیں کی جائے گی۔

رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے: «إِنَّ لِلصَّائِمِ عِنْدَ فِطْرِهِ لَدَعْوَةً مَّا تُرَدُّ»[2] روزے دار کے لیے افطار کے وقت ایک دعا ہے جو مسترد نہیں ہوتی۔ وہ جو دعا کرے گا، اللہ قبول کرے گا۔ کیسے کیسے مواقع ہیں۔ افطار کے وقت آپ جو دعا کریں گے، اللہ قبول کرے گا۔ اس دعا کو اللہ رد نہیں کرے گا۔ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے: «لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ: فَرْحَةٌ عِنْدَ فِطْرِهِ وَفَرْحَةٌ عِنْدَ لِقَاءِ رَبِّهِ»[3] ”روزے دار کے لیے دو فرحتیں اور دو خوشیاں ہیں: ایک خوشی افطار کے وقت اور دوسری خوشی اس وقت ملے گی

[1] سنن ابن ماجه، حديث: 1746. [2] سنن ابن ماجه، حديث: 1753. [3] صحيح مسلم، حديث: 1151.

جب وہ دنیا کو چھوڑ جائے گا اور اپنے پروردگار سے جا ملے گا۔“ اس وقت اللہ تعالیٰ اس کو اتنا دے گا کہ اس کو خوش کردے گا۔ جدائی محسوس نہیں ہوگی۔ وہ دنیا کو چھوڑ کر آرہا ہے۔ تجارتوں کو چھوڑ کر، بیوی بچوں کو چھوڑ کر، ماں باپ کو چھوڑ کر آرہا ہے۔ یہ جدائیاں محسوس نہیں ہوں گی بلکہ اللہ رب العزت روزے کی بنا پر اسے اس قدر نوازے گا کہ اس کو خوش کردے گا۔ کوئی تنہائی محسوس نہیں ہوگی۔ انسیت ہوگی، محبت ہوگی، رحمتیں اس بندے پر نچھاور ہوں گی، یہ روزے دار کی خوشی ہے۔

رمضان اور قیام

غور کریں رمضان کا ہر ہر لمحہ، ہر ہر مقام کس قدر اجر وثواب کا باعث ہے۔ شب بیداری، رات کو جاگنا، رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے: «مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَلَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ»[1] جو شخص رمضان کا قیام کرلے ایمان کے ساتھ، اچھے عقیدے کے ساتھ اور احتساب کے ساتھ۔ احتساب کا معنی اللہ سے ثواب لینے کی نیت ہو۔ ریاکاری نہ ہو، دکھاوا نہ ہو بلکہ یہ عبادت اخلاص کی بنیاد پر ہو کہ اس کا اجر اللہ سے لینا ہے۔ فرمایا کہ «غُفِرَلَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ» تو اس قیام کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس کی سابقہ زندگی کے سارے گناہ معاف کردے گا۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک اور حدیث ہے: «مَنْ قَامَ مَعَ الْإِمَامِ» جو شخص رمضان کا قیام اپنے امام کے ساتھ کرے، مسجد میں جائے، امام کے ساتھ تراویح پڑھے، «حَتَّى يَنْصَرِفَ» حدیث کے الفاظ ہیں کہ لوٹے بھی امام کے ساتھ، یہ قیام شروع بھی کرے تو امام کے ساتھ اور

[1] صحيح البخاري، حديث: 37.

لوٹے بھی تو امام کے ساتھ، معنی پورا قیام امام کے ساتھ کرے «كُتِبَ لَهُ قِيَامُ لَيْلَةٍ» اللہ رب العزت اس کو اتنا ثواب دے گا گویا اس نے پوری رات شب بیداری کی۔ [1]

اللہ رب العزت نے کیسے کیسے مواقع ہمیں عطا فرما دیے۔ ایک رات ایسی بنا دی کہ اس ایک رات کی عبادت، اللہ اکبر! پچاسی سال کی عبادت سے افضل ہے۔ ﴿لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ﴾ شب قدر کی ایک رات کی عبادت ایک ہزار مہینے کی عبادت کے برابر نہیں بلکہ افضل ہے۔ [2] پچاسی سال کی عبادت سے افضل ہے۔

اعتکاف

رمضان کے آخری دس دن اللہ کے پیغمبر ﷺ اعتکاف کرتے، اخلاص کے پیکر لیکن آپ اعتکاف کرتے۔ مسجد کے اندر چادریں لگی ہوتیں اور آپ اندر داخل ہو جاتے، اندر بیٹھ کر ذکر و اذکار کرتے، چھپ کر روتے، اللہ کے سامنے گڑگڑاتے، قرآنِ پاک کی تلاوت کرتے، گھر سے مسجد میں آجاتے، یہ بھی چھپ جانا ہے۔ مسجد میں آ کر اپنے اعتکاف کی چادروں میں داخل ہو جاتے اور چھپ جاتے۔ جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ عبادت مکمل اخلاص کی بنیاد ہی پر ہو، ریاکاری نہ ہو۔ مکمل اخلاص ہو۔ تو ان مواقع کو غنیمت جانیں اور نیکی کے ان مواقع کو سمیٹنے کی کوشش کریں، ورنہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے: وہ شخص اللہ کی رحمت سے دھتکار دیا جاتا ہے جو رمضان کے مہینے کو پائے اور اپنے گناہوں کو بخشوا نہ سکے۔ ایک دفعہ جبریل امین نے بددعائیں کیں اور آپ نے آمین کہا۔ اس کا معنی یہ کہ عمومی حالات میں اجتماعی دعا مانگی جاسکتی ہے۔ دعا مانگنے والا اونچی آواز سے دعا کرے اور سننے والے آمین کہیں۔

[1] جامع الترمذي، حديث: 806. [2] القدر 3:97.

جبریل امین نے تین دعائیں مانگیں۔ اللہ کے پیغمبر ﷺ نے تینوں بار آمین کہا۔ صحابہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ! آپ نے کس چیز پر آمین کہا؟ فرمایا کہ جب منبر کے اوپر چڑھ رہا تھا تو جبریل میرے ساتھ تھے۔ انھوں نے پہلی بددعا یہ کی کہ «بَعُدَ مَنْ أَدْرَكَ أَبَوَيْهِ عِنْدَ الْكِبَرِ أَوْ أَحَدَهُمَا لَمْ يُدْخِلَاهُ الْجَنَّةَ» وہ شخص جو اپنے ماں باپ دونوں کو یا ماں باپ میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پالے اور ان کی خدمت کرکے جنت کو حاصل نہ کر پائے تو اللہ کی رحمت سے دھتکار دیا جائے۔ میں نے کہا: آمین۔ دوسری بددعا یہ تھی: «بَعُدَ مَنْ ذُكِرْتَ عِنْدَهُ وَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْكَ» اس شخص کو بھی اللہ کی رحمت سے دھتکار دیا جائے جس کے سامنے آپ کا نام لیا جائے اور وہ آپ پر درود نہ پڑھے۔ میں نے کہا: آمین۔ اور تیسری بددعا یہ کی تھی: «بَعُدَ مَنْ أَدْرَكَ رَمَضَانَ فَلَمْ يُغْفَرْ لَهُ» اس شخص کو بھی اللہ کی رحمت سے دھتکار دیا جائے جو اس ماہ صیام کو پالے، رمضان کے مہینے کو پالے اور اپنے گناہوں کو بخشوا نہ سکے۔ [1]

میرے بھائیو! جہاں یہ مہینہ فضائل و برکات کا باعث ہے وہاں ہم پر ایک ننگی تلوار مسلط ہے کہ اگر اس مہینے کو پالینے کے باوجود اپنے گناہوں کو نہ بخشوا سکے، گناہوں سے پاک صاف نہ ہوسکے تو یہ مہینہ ہمارے لیے بربادی کا قلعہ ثابت ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے: «مَنْ حُرِمَهَا فَقَدْ حُرِمَ الْخَيْرَ كُلَّهُ» جو شخص اس ماہ مبارک کی خیر و برکات سے محروم کر دیا جائے، وہ شخص ہر خیر سے محروم ہے۔ [2] پھر نہ اس کو حج کا فائدہ، نہ اس کو نماز کا فائدہ، نہ اس کو زکاۃ کا فائدہ کہ یہ بندہ بدنصیب رمضان سے فائدہ نہیں اٹھا سکا تو کس نیکی سے فائدہ اٹھائے گا؟

[1] المعجم الكبير للطبراني: 14/14. [2] سنن ابن ماجه، حديث: 1644.

میری بہنیں توجہ کریں۔ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے: «إِنَّمَا النِّسَاءُ شَقَائِقُ الرِّجَالِ» [1] ان سارے احکام میں، ان سارے معاملات میں، ان سارے فضائل میں عورتیں مردوں کی طرح ہیں۔ جو ثواب مردوں کے لیے ہے وہی عورتوں کے لیے ہے۔ بلکہ روزے کا ثواب تو عورت کے لیے کچھ زیادہ ہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے: «إِذَا صَلَّتِ الْمَرْأَةُ خَمْسَهَا وَصَامَتْ شَهْرَهَا وَحَصَّنَتْ فَرْجَهَا وَأَطَاعَتْ بَعْلَهَا فَلْتَدْخُلْ مِنْ أَيِّ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ شَاءَتْ» [2] عورت اگر پانچ وقت کی نماز پڑھ لے، رمضان کے روزے رکھ لے، اپنی عزت کی حفاظت کرلے، اپنے شوہر کی فرمانبرداری کرلے تو قیامت کے دن آئے گی اس طرح کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کے سارے دروازے کھول دے گا اور کہے گا کہ جہاں سے چاہو داخل ہو جاؤ۔ حفاظت کیجیے اس کی۔ اخلاص کی حفاظت کریں۔ یہ کام بڑا مشکل ہے۔ سفیان بن عیینہ کا قول ہے کہ میں نے اعمال کو پرکھا، نیکیوں کو دیکھا، یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کون سا عمل مشکل ہے۔ کبھی میرے سامنے جہاد آتا کہ شاید یہ مشکل ہے۔ لیکن نہیں یہ بڑا آسان ہے۔ کبھی دعوت آتی کہ یہ جہاد کبیر ہے۔ شاید یہ مشکل ہو، نہیں یہ بھی آسان ہے۔ نمازیں، روزے، سردیوں کے وضو، گرمیوں کے وضو، پھر یہ صدقات اور زکاۃ، مال خرچ کرنا یہ مشکل ہے، نہیں یہ سب عمل آسان ہیں۔ جہاد آسان، دعوت آسان، نمازیں آسان، روزے آسان، زکاۃ آسان، صدقات آسان۔ مجھے سارے عمل آسان لگے۔ فرماتے ہیں کہ سب سے مشکل کام جو مجھے دکھائی دیا، جو مجھے محسوس ہوا وہ تھا نیت کی حفاظت۔ نیت کی حفاظت، یہ کام بڑا مشکل ہے۔ اور واقعتاً بڑا مشکل

[1] سنن أبي داود، حديث: 236. [2] المعجم الكبير للطبراني: 411/19.

ہے۔ شیطان چلتے چلتے انسان کی نیت پر وار کرجاتا ہے۔ اسے چیک کرو۔ نیت کو سامنے رکھو، اس کی حفاظت کرو۔ سارے عمل، سارے کام اللہ کی رضا کے لیے ہونے چاہئیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان تمام اعمال کی توفیق عطا فرمادے۔ حفظِ نیت کی توفیق عطا فرمادے۔ یااللہ! ان ٹوٹی پھوٹی عبادات کو قبول فرمالے۔ یااللہ! ان بندوں میں ہمیں شامل فرمالے جن کے روزے تیرے ہاں مقبول ہوتے ہیں۔ ہمیں روزوں کی جزا جس کا تو نے وعدہ فرمایا، وہ عطا فرمادے۔

وَ أَقُولُ قَوْلِي هٰذَا وَ أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِي وَلَكُمْ وَ آخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ.

رزقِ حلال ہی کیوں ......؟

رزقِ حلال ہی کیوں ......؟

خطبہ مسنونہ کے بعد:

﴿يَاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا﴾

"اے رسولو! تم پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو۔"[1]

وَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فِي حَدِيثٍ طَوِيلٍ: «رَجُلٌ يُطِيلُ السَّفَرَ أَشْعَثَ أَغْبَرَ يَمُدُّ يَدَيْهِ إِلَى السَّمَاءِ، يَا رَبِّ، يَا رَبِّ وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ وَّ مَشْرَبُهُ حَرَامٌ وَ مَلْبَسُهُ حَرَامٌ وَّ غُذِيَ بِالْحَرَامِ فَأَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ»[2]

قابلِ قدر علمائے کرام، حاضرینِ مجلس! اس نشست کے لیے عنوانِ گفتگو آپ نے سن لیا ہے کہ اسلام میں آخر رزقِ حلال ہی کیوں؟ اللہ رب العزت جو توفیق دے گا، ان شاءاللہ بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

رزقِ حرام کا پہلا حملہ

اسلام میں سب سے پہلا مسئلہ اعتقادی ہے۔ سب سے زیادہ عقیدے کی اہمیت

[1] المؤمنون 51:23. [2] صحیح مسلم، حدیث: 1015.

ہے۔ اور رزق حلال سے دور ہونے والا یا رزقِ حلال پر قناعت نہ کرنے والا اور رزقِ حرام کا متلاشی ضعفِ عقیدہ اور ضعفِ ایمان کا مریض ہے کیونکہ حرام ذرائع وہی اختیار کرتا ہے جس کو اپنے رب پر توکل نہ ہو۔ یہ توکل کے منافی ہے کہ حلال کو چھوڑ کر حرام ذرائع کو تلاش کیا جائے۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «ذَاقَ طَعْمَ الْإِيمَانِ مَنْ رَّضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّ بِالْإِسْلَامِ دِينًا وَّ بِمُحَمَّدٍ رَّسُولًا» [1] جو شخص تین چیزوں پر راضی ہو گیا، اس نے ایمان کی مٹھاس پالی۔ ایمان کی حلاوت اور لذت سے وہ آشنا ہو گیا جو تین چیزوں پر راضی ہو جائے: پہلی چیز یہ کہ اللہ کو رب مان کر راضی ہو جائے۔ یہ رب مان کر راضی ہونا کیا ہے؟ رب ماننے کا معنی یہ ہے کہ اللہ ہی میرا خالق ہے، اللہ ہی مالک ہے، اللہ ہی رازق ہے، وہی مجھے پالنے والا ہے۔ رب کا معنی پالنے والا، پرورش کرنے والا۔ اللہ تعالیٰ ہی مجھے پالنے والا ہے، وہی روزی دینے والا ہے، ہر چیز پر قادر ہے۔ اللہ کو رب مانے تو اس پر راضی بھی ہو جائے۔ اس نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا۔ ایمان کی حلاوت اور مٹھاس اس نے پالی۔ لیکن اللہ کو رب مان کر راضی ہونا وہی کر سکتا ہے جو رزقِ حلال پر اکتفا کرے، چاہے فاقوں کی نوبت آ جائے لیکن حرام ذرائع کی طرف نہ جائے اور رزق حلال کو حاصل کرنا اپنا نصب العین بنا لے۔ اگر یہ عمل نہیں ہے تو اللہ کو رب ماننے اور راضی ہونے کے سارے دعوے لغو اور فضول ہیں۔ اس کی عملی دلیل یہی ہے کہ اللہ کو رب مان کر راضی ہونے والا وہی ہے جو رزق حلال پر اکتفا کرے گا اور جو اس سے تجاوز کرے گا اسے نہ اللہ پر توکل ہے اور نہ وہ اس پر راضی ہے کہ اللہ میرا رب ہے۔ اور

[1] صحیح مسلم، حدیث: 34.

اس نے اپنے رزق کی راہیں اپنے ہاتھ میں تھام لیں۔ اب معیشت کے حرام ذرائع کو وہ اپناتا ہے تو یہ توکل کے بھی منافی ہے اور اس حدیث کے بھی خلاف ہے۔ اس لیے رزق حرام کا جو پہلا حملہ ہے وہ انسان کے عقیدے اور ایمان پر ہے ورنہ اللہ تو روزی دینے والا ہے: ﴿وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا﴾ [1] زمین پر چلنے والی کوئی بھی مخلوق ہو، اس کی روزی اللہ کے ذمے ہے۔ «لَوْ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَوَكَّلُونَ عَلَى اللّٰهِ حَقَّ تَوَكُّلِهِ لَرُزِقْتُمْ كَمَا تَرْزُقُ الطَّيْرُ، تَغْدُو خِمَاصًا وَّتَرُوحُ بِطَانًا» [2] اگر تمھیں اپنے پروردگار پر کماحقہ توکل ہو، بھروسہ ہو (اور رزق کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دو۔ اللہ کے بتائے ہوئے راستوں پر تکسّب کی شکل ضرور ہو، اس کے خلاف نہ چلے اور صحیح معنی میں توکل کر لو) تو اللہ تمھیں بھی اس طرح روزی دینے پر قادر ہے جس طرح پرندے کو دیتا ہے۔ (نہ اس کے پاس ہنر ہے نہ کوئی فن ہے، نہ کوئی سرمایہ کاری ہے، نہ کوئی تجارت ہے لیکن) «تَغْدُو خِمَاصًا» صبح اپنے گھونسلے سے نکلتا ہے تو خالی پیٹ ہوتا ہے، «وَتَرُوحُ بِطَانًا» اور شام کو لوٹتا ہے تو پیٹ بھرا ہوا ہوتا ہے۔ معنی یہ کہ رزق حرام کی زد میں سب سے پہلے انسان کا عقیدہ ہے، اصل بات مستحکم اور قوی عقیدے سے بنتی ہے، عقیدے کا معاملہ کمزور نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ إِلَّا مُؤْمِنٌ» "جنت میں صرف مومن ہی داخل ہوں گے۔" [3]

ایک تو یہ آپ کے سوال کا پہلا جواب ہے کہ رزقِ حلال اس لیے ضروری ہے تاکہ اس بنیاد پر آپ کا عقیدہ مستحکم رہے، آپ کا توکل مضبوط ہو اور ربوبیت پر ایمان اور اللہ کی

[1] هود 11:6. [2] مسند أحمد: 30/1، وجامع الترمذي، حديث: 2344. [3] صحيح البخاري، حديث: 4203.

ربوبیت پر رضا مندی میں کوئی خلل اور اضطراب نہ رہے۔ انسان اپنے آپ کو سمجھائے کہ جس پروردگار کو رب مانا ہے اس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں۔ «یَاعِبَادِي! لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ، وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ، قَامُوا فِي صَعِيدٍ وَّاحِدٍ فَسَأَلُونِي، فَأَعْطَيْتُ كُلَّ إِنْسَانٍ مَّسْأَلَتَهُ، مَانَقَصَ ذٰلِكَ مِمَّا عِنْدِيْ إِلَّا كَمَا يَنْقُصُ الْمِخْيَطُ إِذَا أُدْخِلَ الْبَحْرَ» [1] اے میرے بندو! اگر تمھارے پچھلے اور تمھارے اگلے، یعنی جو پیدا ہو کے مر چکے ہیں وہ زندہ ہو کر دوبارہ آ جائیں اور جو موجود ہیں وہ بھی ہوں اور جنھوں نے قیامت تک پیدا ہونا ہے وہ آج ہی پیدا ہو لیں اور اسی طرح جن بھی، سب ایک میدان میں جمع ہو جائیں اور جمع ہو کر بیک آواز ایک ہی وقت میں سب مجھ سے مانگیں جو دل میں آئے۔ حکومتیں مانگیں، بادشاہتیں مانگیں، دولتوں کے انبار مانگیں «فَأَعْطَيْتُ كُلَّ إِنْسَانٍ مَّسْأَلَتَهُ» اور پھر میں اسی لمحے آن واحد میں سب جو مانگ رہے ہیں، یہ سب کچھ دینے کے بعد میرے خزانوں میں اتنی کمی بھی نہیں آئے گی جیسے ایک سوئی سمندر میں ڈبو کر نکال لی جائے تو وہ سوئی سمندر کا کتنا پانی کم کرے گی؟ وہ سوئی تھوڑا سا پانی کم کر دے گی لیکن سب کو دینے کے بعد میرے خزانوں میں اتنی کمی بھی نہیں آئے گی۔ کیا یہ حدیث ہم سے یہ تقاضا نہیں کرتی کہ اپنے پروردگار پر پختہ توکل کریں۔ اللہ کے بندو! یہ پختہ توکل کامیابی کی اساس ہے جس کی بنیاد رزق حلال ہے اور اگر توکل مستحکم ہوگا تو اللہ تعالیٰ ایسے انسانوں کی لغزشوں کو معاف کر کے جنت میں داخل کر دے گا۔ بلکہ مجھے کہنے دیجیے کہ بلا حساب داخل کر سکتا ہے۔ صحیح بخاری کی حدیث اس کی دلیل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے خواب میں

[1] صحيح مسلم، حديث:2577.

میدان محشر دیکھا۔ انبیاء اپنی امتوں کو لے کر کھڑے ہوئے ہیں اور میں نے اپنی امت بھی دیکھی۔ اور میں نے اپنی امت میں ستر ہزار افراد ایسے دیکھے جنھوں نے بلاحساب جنت میں داخل ہونا ہے۔ یہ ستر ہزار کے لفظ بخاری کی حدیث کے ہیں۔ اور مسند احمد کی روایت میں ہے: «فَاسْتَزَدْتُّ فَزَادَنِي» میں نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ یا اللہ! اس تعداد کو بڑھا دے۔ تو اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول کر لی اور فرمایا: «مَعَ كُلِّ أَلْفٍ سَبْعِينَ أَلْفًا» یہ ستر ہزار ہیں ان میں سے ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار اور بھی دیتا ہوں جن کا کوئی حساب نہیں لوں گا، جنت میں داخل کر دوں گا۔ [1] نبی کریم ﷺ یہ بیان فرما کے چلے گئے اور صحابہ جنت کے حریص، جنت کے متمنی، جنت کی طلب میں مخلص، باتیں کرنے لگے کہ یہ کون ہو سکتے ہیں؟ کسی نے کہا کہ شاید یہ ہم ہوں، ہم اللہ کے پیغمبر کے صحابی ہیں، جنھوں نے اللہ کے پیغمبر کی مدد کی، اسلام کی پہلی جماعت۔ کسی نے کہا کہ نہیں ہم میں سے اکثر پہلے مشرک تھے بعد میں مسلمان ہوئے۔ شاید یہ وہ ہوں جو پیدا بھی اسلام کی حالت میں ہوں اور مریں بھی اسلام کی حالت میں۔ ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے۔ آپ ﷺ کو بتایا گیا اور پوچھا گیا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا: یہ کوئی مخصوص طبقہ اور مخصوص گروہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جن میں چار خوبیاں جمع ہوں گی۔ «هُمُ الَّذِينَ لَا يَسْتَرْقُونَ وَلَا يَتَطَيَّرُونَ وَلَا يَكْتَوُونَ وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ» [2] یہ استرقاء نہیں کرتے، اکتواء نہیں کرتے، تطیّر نہیں کرتے، ان تمام چیزوں کا تعلق بھی توکل کے ساتھ ہے۔

استرقاء کا مفہوم کہ کوئی تکلیف آ جائے، کوئی بیماری آ جائے تو یہ نہیں کہ بھاگوں دم

[1] مسند أحمد:359/2. [2] صحيح البخاري، حديث:5705.

کروانے کے لیے فلاں حضرت کے پاس، فلاں درگاہ پر۔ یہ بات توکل کے منافی
ہے۔ انسان اگر اپنی بیماریوں پر کچھ صبر کر لے تو اسے کیا معلوم کہ اللہ کے ہاں کیا بلند
درجات ہیں۔ اور پھر استرقاء کہ فوراً جاؤ کسی دم کرنے والے کے پاس۔ یہ گھاٹا کیوں
ہو رہا؟ یہ بیماری کیوں آ گئی؟ وہ دم کرے تو صحت حاصل ہو۔ شریعت میں استرقاء کی
مخالفت یا عدم حوصلہ افزائی کی علت یہ ہے کہ جب تک اس درگاہ پر نہیں پہنچو گے، اس
وقت تک تمھارے دل میں اللہ کا خیال نہیں ہوگا، حضرت جی کا خیال ہوگا۔ اور یہ
بات توکل کے منافی ہے۔

«وَلَا يَتَطَيَّرُونَ» تطیّر نہیں کرتے۔ تطیّر ”طیر“ سے ہے، معنی پرندہ، پرندہ اڑانا۔
جاہلیت کی ایک رسم تھی، اپنے گھروں سے نکلتے، کسی مشن پر روانہ ہوتے تو جو پہلا پرندہ
راستے میں دکھائی دیتا اسے اڑاتے اور دیکھتے کہ یہ کس طرف گیا ہے۔ اگر دائیں
طرف گیا ہے تو سفر مبارک ہے۔ سفر جاری رکھتے اور اگر بائیں جانب گیا ہے تو سمجھتے
کہ یہ سفر منحوس ہے، وہیں سے لوٹ آتے۔ خیر وشر پرندوں میں تلاش کر رہے ہیں،
پتھر میں تلاش کر رہے ہیں۔ اللہ کے پیغمبر نے فرمایا کہ جس جماعت نے جنت میں
بلاحساب جانا ہے ان کے ایسے مستحکم عقیدے ہیں، ان کا توکل ایسا مثالی ہے، وہ سمجھتے
ہیں کہ خیر وشر اللہ کی طرف سے ہے، اللہ پر توکل کرتے ہیں۔

اکتواء نہیں کرتے۔ یہ کیّ سے ماخوذ ہے اور کیّ کے معنی ہیں کہ آگ سے جسم پر
داغ لگوانا۔ یہ طریقہ علاج ہے اور جائز ہے لیکن بظاہر ایک مکروہ شکل ہے، یعنی وہ
لوگ مرض تو جھیل لیتے ہیں لیکن اس قسم کا طریقہ علاج اختیار نہیں کرتے۔ کیونکہ اگر
انسان کے دل میں صحیح شرعی شعور ہو تو وہ سمجھتا ہے کہ مرض پر صبر بلند درجات کا باعث

ہے۔ اللہ کے پیغمبر کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں کے لیے جنت میں بڑے
اونچے درجے پیدا کیے ہوئے ہیں، لیکن ان کے اعمال ان درجات سے قاصر ہیں،
درجات اونچے ہیں اعمال قاصر ہیں۔ اتنی نمازیں، روزے اور اتنے نوافل نہیں ہیں۔
اعمال کم ہیں، درجے اونچے ہیں۔ اللہ رب العزت اپنے ان بندوں کو ان درجات تک
پہنچانے کے لیے انھیں کسی تکلیف میں اور کسی مرض میں مبتلا کر دیتا ہے، اس مرض پر
وہ اتنا صبر کرتے ہیں، اتنا صبر کرتے ہیں کہ اس درجے تک پہنچ جاتے ہیں جو اللہ نے
تیار کیا ہوا ہے۔ [1]

اور فرمایا کہ «وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ» جنھوں نے بلا حساب جنت میں داخل ہونا
ہے وہ اپنے رب پر پورا بھروسہ اور توکل کرتے ہیں۔ تو یہ توکل توحید کا ایک اہم ترین
باب ہے۔ بلکہ جامع المسائل ہے۔ توحید کی بہت سی اقسام توکل کے تحت آتی ہیں۔
رزقِ حلال کی جو پہلی بنیاد ہے، وہ استحکامِ عقیدہ ہے۔ ایک انسان اگر حلال ذرائع کا
متلاشی ہے اور وہ میسر نہیں آتے بلکہ صبر کرتا ہے، حرام کی طرف نہیں جاتا بلکہ صبر کرتا
ہے تو اس کا معنی یہ کہ اس کو توحید ربوبیت پر پورا یقین ہے اور اللہ پر توکل کرتا ہے۔
فاقے پر فاقہ برداشت کرتا ہے اور کوئی پروا نہیں کرتا بلکہ اس زندگی کو لذیذ سمجھتا ہے
کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: «مَنْ رَّضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا» جو اللہ کو رب مان کر
راضی ہو جائے۔ ایسا راضی ہو کہ فاقے ہوں تو پریشان ہونے کی بجائے خوش ہو۔
یہ لذت کی زندگی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ سیدہ عائشہ ﷞ فرماتی ہیں کہ
رسول اللہ ﷺ کے گھر میں تین تین چاند گزر جاتے اور آپ کے گھر میں چولھا نہیں

[1] صحيح ابن حبان: 169/7، والسلسلة الصحيحة: 173/4.

جلتا تھا کیونکہ اللہ کے پیغمبر توحید کا پہاڑ تھے۔ اور یہ توحید ربوبیت کا اہم ترین باب ہے۔ لہٰذا رزق حلال کی جو پہلی اساس ہے، وہ عقیدہ ہے۔ حرام مال کی زد میں انسان کا عقیدہ ہے۔ کم ازکم دو چیزیں اس پر مسلط اور دو حکم قائم ہیں: ایک ضعفِ توحیدِ ربوبیت اور دوسرا اضعف توکل۔

رزقِ حرام کا دوسرا حملہ

رزق حرام کا دوسرا حملہ بھی انسان کے ایمان پر ہے اور وہ نفاق کی زد میں ہے۔ صحیح بخاری میں حدیث ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ» ''منافق کی تین نشانیاں ہیں۔ بات کرے گا تو جھوٹ بولے گا اور اس کے پاس امانت رکھی جائے گی تو خیانت کرے گا اور جب وعدہ کرے گا تو وفا نہیں کرے گا۔'' [1] اس کا بڑا وسیع مفہوم ہے لیکن اس کے تانے بانے رزق حلال کے ساتھ جا کر ملتے ہیں۔ خیانت رزقِ حرام کی قبیح ترین قسم ہے۔ وہ انفرادی شکل میں بھی ہوسکتی ہے، اجتماعی شکل میں بھی ہوسکتی ہے لیکن جیسی بھی خیانت ہو، یہ نفاق کی علامت ہے۔ رزقِ حرام اس پہلو سے بھی انتہائی خطرناک ہے کہ جو انسان حرام ذرائع کا متلاشی ہوتا ہے، وہ نفاق کی زد میں ہے۔ ﴿إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ [2] منافقین کا انجام کیا ہے؟ جہنم میں سب سے نیچے ہوں گے اور صحیح مسلم کی روایت ہے کہ جہنم کی گہرائی اللہ کے پیغمبر نے بیان فرمائی۔ جب صحابہ نے ایک آواز سنی تو اللہ کے پیغمبر نے پوچھا: «هَلْ تَدْرُونَ مَا هٰذَا؟» ''کیا تم جانتے ہو کہ یہ آواز کہاں سے آئی؟'' صحابہ نے کہا: «اَللّٰهُ وَرَسُولُهُ

[1] صحيح البخاري:2682. [2] النسآء 145:4.

أَعْلَمُ» رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے آج سے ستر سال پہلے جہنم کی آگ میں ایک پتھر ڈالا تھا۔ آج وہ ستر سال کے بعد جہنم کی تہ میں جا کر گرا ہے اور یہ اس کے گرنے کی آواز ہے۔'' [1] اس تہ میں منافقین کا طبقہ ہوگا۔ یہ رزق حرام کی شاخیں کہاں جا کر ملیں۔ تو انسان کا عقیدہ اس سے مضطرب ہوتا ہے۔ وہ انسان نفاق کی زد میں ہے، وہ حلال وحرام کی تمیز نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے جو ہمیں پیدا کیا ہے، یہ حیات وموت کا جو نظام ہے، یہ ایک آزمائش ہے کہ کون عمل کرتا ہے اور کون نہیں کرتا۔ معنی یہ عمل کرنا ہمارا مقصدِ حیات ہے۔ ﴿الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ﴾ ''وہ جس نے موت وحیات کو پیدا کیا تاکہ وہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے۔ اور وہ زبردست ہے، خوب بخشنے والا۔'' [2] ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ ''اور میں نے جن اور انسان اسی لیے تو پیدا کیے ہیں کہ وہ میری ہی عبادت کریں۔'' [3] عمل کے بغیر کچھ نہیں۔ «مَنْ بَطَّأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ» [4] جس کی عمل کی سواری کمزور ہوگئی قیامت کے دن دنیا کا اور کوئی تعلق اس کے کام نہیں آئے گا۔ نہ مال، نہ دولت، نہ منصب، نہ کوئی رشتہ۔ کوئی چیز کام نہیں آئے گی۔ عمل کے بغیر نجات کی کوئی صورت نہیں۔ «يَا فَاطِمَةُ بِنْتَ مُحَمَّدٍ! أَنْقِذِي نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ فَإِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا» ''اے محمد کی بیٹی فاطمہ! اپنے آپ کو جہنم سے خود بچانا۔ میں تمھارے کسی کام نہیں آؤں گا۔'' «اِعْمَلِي» ''عمل کرو۔'' [5]

[1] صحیح مسلم، حدیث:2844. [2] الملك 2:67. [3] الذاريات 56:51. [4] صحیح مسلم، حدیث:2699. [5] صحیح مسلم، حدیث:204.

رزقِ حرام کا تیسرا حملہ

رزق حرام کا تیسرا نقصان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رزق حرام کی شکل میں انسان کی نیکیاں قبول نہیں کرتا۔ رزق حرام کا دانہ پیٹ میں چلا جائے، اس کے اعمال برباد، نیکیاں برباد، اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرتا۔ فرمایا کہ ﴿إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ﴾ [1] اللہ تعالیٰ تو متقین کی نیکیاں قبول کرتا ہے۔ اور تقویٰ، اصل تقویٰ کی بنیاد رزقِ حلال پر قائم ہے۔ اصل متقی وہ ہے جو حرام سے بچے، حرام مال سے بچے، حرام معیشت سے بچے۔ امام یحییٰ بن معین اکثر یہ اشعار پڑھا کرتے تھے:

اَلْمَالُ يَذْهَبُ حِلُّهُ وَحَرَامُهُ
يَوْمًا وَيَبْقَى فِي غَدٍ آثَامُهُ
لَيْسَ التَّقِيُّ بِمُتَّقٍ لِإِلٰهِهِ
حَتّٰى يَطِيبَ شَرَابُهُ وَ طَعَامُهُ
وَيَطِيبَ مَا يَحْوِي وَيَكْسِبُ كَفُّهُ
وَيَكُونُ فِي حُسْنِ الْحَدِيثِ كَلَامُهُ
نَطَقَ النَّبِيُّ لَنَا بِهِ عَنْ رَبِّهِ
فَعَلَى النَّبِيِّ صَلَاتُهُ وَسَلَامُهُ

فرماتے ہیں کہ مال چلا جائے گا، حلال کا ہو یا حرام کا اور اے بندے! کل تیرے گناہ

[1] المآئدة 5:27.

باقی رہ جائیں گے۔ جس مال کی خاطر تو قلابازیاں کھا رہا ہے، پسینے بہا رہا ہے، ختم ہو جائے گا اور کل صرف تیرے گناہ باقی رہ جائیں گے۔ فرماتے ہیں کہ

لَيْسَ التَّقِيُّ بِمُتَّقٍ لِإِلٰهِهِ

متقی وہ نہیں جو دعویٰ کرے کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں، (اور صرف زبانی کلامی یہ کہتا پھرے کہ) اللہ بڑا بادشاہ ہے۔

حَتّٰى يَطِيبَ شَرَابُهُ وَطَعَامُهُ

متقی تو وہ ہے جس کا کھانا بھی حلال کا ہو اور پینا بھی حلال کا ہو۔

وَيَطِيبَ مَا يَحْوِي وَيَكْسِبُ كَفُّهُ

جو مال اس کے پاس جمع ہے، وہ بھی حلال کا ہو اور اس کے ہاتھ جو مال کماتے ہیں، وہ بھی حلال کا ہو۔

وَيَكُونُ فِي حُسْنِ الْحَدِيثِ كَلَامُهُ

اور گفتگو بھی اخلاق سے کرے، بد خلق متقی نہیں ہو سکتا۔ فرماتے ہیں کہ یہ باتیں میری نہیں ہیں، ایک محدث کا قول ہے کہ یہ باتیں میری نہیں ہیں۔

نَطَقَ النَّبِيُّ لَنَا بِهِ عَنْ رَبِّهِ

جو کچھ آپ کو بتا رہا ہوں یہ اللہ کے نبی نے اپنے پروردگار سے بیان کیا ہے۔

فَعَلَى النَّبِيِّ صَلَاتُهُ وَ سَلَامُهُ

اللہ تعالیٰ ہماری طرف سے اپنے پیغمبر پر لاکھوں کروڑوں درود و سلام قبول فرمائے۔ [1]

[1] شعب الإيمان: 7/518.

رزقِ حرام کی زد میں آپ کے عمل بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے عمل قبول نہیں کرے گا۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث کا معنی یہ ہے، اس حدیث کے بہت سے شواہد ہیں، بہت سے متون ہیں اور یہ متون استدلال کے قابل ہیں۔ اللہ کے پیغمبر کا فرمان ہے کہ ایک شخص اگر چالیس درہم کا اور ایک روایت میں ہے دس درہم کا کپڑا خریدتا ہے اور اس میں ایک درہم حرام کا شامل ہو جائے، نو درہم حلال کے ہیں، ایک درہم حرام کا شامل ہو جائے تو اللہ رب العزت اس کے ایک بار کپڑے پہننے سے چالیس دن تک اس کی کوئی نیکی قبول نہیں کرے گا۔ [1] اس کی نمازیں، سجدے، سب رائیگاں جائیں گے، یعنی رزقِ حرام کی آمیزش کی وجہ سے آپ کے عمل قبول نہیں ہوں گے۔ یہاں تو نو درہم حلال کے اور ایک درہم حرام کا ہے۔ حلال وحرام کی آمیزش ہے اور غلبہ بھی حلال کو ہے۔ لیکن جس کا سرمایہ ٹوٹل حرام کا ہو، جس کی معیشت کی بنیاد ہی حرام ہو، اس کا کیا انجام ہوگا؟ غور کیجیے!

رزقِ حرام کا چوتھا حملہ

اس دنیا میں مجھ جیسے گناہ گار کے لیے سب سے بڑا سہارا دعا اور توبہ کا سہارا ہے۔ لیکن ہماری یہ دعائیں، ہماری یہ توبہ، ہمارے یہ استغفار، یہ بھی رزقِ حرام کی زد میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ دعائیں قبول نہیں کرتا۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «اَلدُّعَاءُ سِلَاحُ الْمُؤْمِنِ» ”دعا مومن کا ہتھیار ہے۔“ [2] سب سے بڑا ہتھیار دعا ہے۔ جو آپ کے ایٹمی ہتھیار ہیں، ان سے بڑا ہتھیار

[1] مسند أحمد:98/2. [2] مسند أبي يعلىٰ:344/1.

دعا ہے۔ براہِ راست آپ اپنے خالق سے مخاطب ہوتے ہیں۔ جناب عمر بن خطاب ﷛ آدھی دنیا کے فاتح جب کسی مہم کو شروع کرتے، لشکرکشی فرماتے، قافلہ بھیجتے، ارادہ فرما لیتے تو بھیجنے سے پہلے غور کرتے کہ اس مشن کے لیے کماحقہ دعا میں نے کی یا نہیں کی۔ دعا کا حق ادا ہوا یا نہیں ہوا، اگر دل مطمئن ہوتا کہ ہاں اللہ تعالیٰ سے خوب دعائیں کیں، پھر اس مہم کو روانہ کرتے ورنہ آدھی دنیا کے فاتح پھر دعا کرنے بیٹھ جاتے اور اگر دعائیں قبول ہی نہ ہوں، دعائیں قبول نہ ہونے کی سب سے بنیادی وجہ رزق حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «رَجُلٌ يُّطِيلُ السَّفَرَ أَشْعَثَ أَغْبَرَ يَمُدُّ يَدَيْهِ إِلَى السَّمَاءِ، يَا رَبِّ، يَا رَبِّ! وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ وَّمَشْرَبُهُ حَرَامٌ وَّمَلْبَسُهُ حَرَامٌ وَّغُذِيَ بِالْحَرَامِ فَأَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ؟» [1]

ایک شخص لمبا سفر کر کے جاتا ہے۔ اس لمبے سفر سے مراد سفرِ حج ہے۔ اب حج جیسی عبادت کتنی پاکیزہ عبادت، لمبا سفر کر کے جاتا ہے۔ «أَشْعَثَ أَغْبَرَ» اس کا سر خاک آلود ہے اور پاؤں گرد و غبار سے اٹے پڑے ہیں۔ یہ پوزیشن حج کے موقع پر عرفہ کے میدان میں ہوتی ہے۔ گرد و غبار سے بھرا پڑا ہے، کھلے آسمان کے نیچے احرام کی دو چادریں باندھے بیٹھا ہے۔ کھڑا ہوا دعائیں کر رہا ہے «يَمُدُّ يَدَيْهِ» اپنے دونوں ہاتھ پھیلا پھیلا کر دعائیں کر رہا ہے۔ «يَا رَبِّ! يَا رَبِّ!» اور دعاؤں میں یا رب کہہ رہا ہے، یا رب! یارب! بتاؤ یہاں پر استجابت کی کوئی رکاوٹ ہے؟ یعنی خود سفرِ حج، مقدس سفر ہے۔ ایک ہے سفر، ایک ہے سفرِ حج۔ دونوں میں فرق ہے لیکن حج کا سفر نہ بھی ہو عام سفر ہو، تجارت کا ہو، کوئی بھی سفر ہو، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «ثَلَاثُ

[1] صحيح مسلم، حديث: 1015.

دَعَوَاتٍ مُّسْتَجَابَاتٌ» تین دعائیں اللہ قبول کر لیتا ہے۔ «دَعْوَةُ الْوَالِدِ وَ دَعْوَةُ الْمُسَافِرِ وَدَعْوَةُ الْمَظْلُومِ» ”ایک مسافر کی دعا، ایک مظلوم کی دعا، ایک باپ کی دعا بیٹے کے حق میں اللہ قبول کر لیتا ہے۔“[1] یعنی مسافر کی دعا بھی قابلِ قبول ہے اور یہ سفر تو حج کا ہے۔ یہ سفر نہیں بلکہ سفرِ حج ہے۔ فرض ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «مَنْ حَجَّ هٰذَا الْبَيْتَ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ»[2] جو شخص بیت اللہ کا حج کرے اور فسق و فجور نہ کرے، کسی گناہ کا ارتکاب نہ کرے، گالی گلوچ نہ دے اور اس کا سفر بالکل شریعت کے مطابق ہو، اس کا حج اللہ کے پیغمبر کے طریقے کے مطابق ہو، فرمایا کہ وہ حج کر کے گناہوں سے پاک صاف ہو کر یوں لوٹے گا جیسے اس کی والدہ نے اس کو آج ہی پیدا کیا ہو۔ استجابت، پھر کہاں کھڑا ہے؟ عرفہ کے میدان میں۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «يَضَعُ الشَّيْطَانُ التُّرَابَ عَلٰى رَأْسِهِ يَدْعُو بِالْوَيْلِ وَالثُّبُورِ» عرفہ کے میدان میں تو شیطان اپنے سر پہ خاک ڈالتا ہے اور کہتا ہے: میں مارا گیا، مجھے موت آ جائے۔ شیطان کہتا ہے: مجھے موت آ جائے، مر جاؤں میں۔ میں نے فلاں بندے پر چالیس سال لگائے، فلاں بندے پر ساٹھ سال لگائے، فلاں بندے پر پچاس سال محنت کی۔ اس نے ایک ہی بار اللہ کو کہہ کر اپنے گناہوں کو بخشوا لیا، اللہ نے گناہوں کو معاف کر دیا۔ میری محنتیں برباد ہو گئیں، مجھے موت آ جائے۔[3] عرفہ کا میدان ہے، جہاں اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کے بیچ عرفہ والوں کو سامنے

[1] سنن أبي داود، حديث: 1536، و سنن ابن ماجه، حديث: 3862. [2] صحيح البخاري، حديث: 1820. [3] أخبار مكة للفاكهي: 15/5.

رکھ کر فخر کرتا ہے کہ دیکھو میرے بندوں کو کس طرح عبادت کر رہے ہیں، کس طرح دعائیں کر رہے ہیں۔ استجابت کی صورتیں آپ دیکھیں: «أَشْعَثَ أَغْبَرَ» یہ جو خاک آلود کیفیت اور حالت ہے، سر خاک آلود، پاؤں خاک آلود، اللہ کو بڑی پسند ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے جب بارش کی دعا کرنی ہوتی بکھرے بالوں کے ساتھ، بوسیدہ کپڑوں کے ساتھ جنگل میں نکل جایا کرتے۔ شہری بستی کو چھوڑ کر جنگلوں اور میدانوں کا رخ کرتے تھے، بکھرے ہوئے بال لے کر جاتے تھے۔ بوسیدہ کپڑے اور پھٹا پرانا لباس لے کر جاتے تھے۔ ایسے ہی رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «رُبَّ أَشْعَثَ أَغْبَرَ مَدْفُوعٍ بِالْأَبْوَابِ ذِي طِمْرَيْنِ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ» کچھ بندے ایسے ہیں جن کے سر خاک آلود، کپڑے خاک آلود اور 'ذِي طِمْرَيْنِ' دو بوسیدہ کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ ایک اوپر اوڑھے ہوئے ہے، ایک نیچے باندھے ہوئے ہے۔ «مَدْفُوعٍ بِالْأَبْوَابِ» جس کی ظاہری کیفیت کی بنا پر دروازوں پر دھکے دے کر نکال دیا جاتا ہے کہ اندر نہیں جاؤ سیٹھ صاحب ناراض ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی کیا قیمت ہے؟ «لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ»[1] جب یہ اللہ پر قسم کھا لے کہ یا اللہ ایسا ہوگا، یا اللہ ایسا کر! تو اللہ تعالیٰ ایسا کر دے۔

اللہ تعالیٰ کو ایسے بندے پسند ہیں اور یہ «أَشْعَثَ أَغْبَرَ» خاک آلود ہیئت کے ساتھ اللہ کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔ کیسی کیسی استجابت کی صورتیں ہیں۔ «يَمُدُّ يَدَيْهِ» اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے کھڑا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «إِنَّ رَبَّكُمْ حَيِيٌّ كَرِيمٌ» ”تمھارا رب بڑا باحیا، کرم والا ہے۔“ «يَسْتَحْيِي مِنْ عَبْدِهِ إِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ إِلَيْهِ

[1] صحيح مسلم، حديث: 2622، 2854، و المستدرك للحاكم: 364/3.

أَنْ يَرُدَّهُمَا صِفْراً» [1] ''جب بندہ اپنے ہاتھوں کو اللہ کے سامنے پھیلا دے تو اللہ کو شرم آتی ہے کہ ان ہاتھوں کو خالی لوٹائے۔'' استجابت کی کیسی کیسی صورتیں موجود ہیں۔ «یَا رَبِّ! یَا رَبِّ!» ''یارب! یارب! کہہ کر پکار رہا ہے۔'' ایک روایت میں نے پڑھی، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «إِذَا قَالَ الْعَبْدُ: يَا رَبِّ! أَرْبَعَ مَرَّاتٍ، يَقُولُ اللّٰهُ: لَبَّيْكَ يَا عَبْدِي سَلْ تُعْطَ» ''جب بندہ اپنی دعا میں چار دفعہ کہہ دے: یا رب! تو اللہ فرماتا ہے: «لَبَّيْكَ» ''میں حاضر ہوں میرے بندے۔'' «سَلْ» ''مانگ'' «تُعْطَ» ''تجھے دیا جائے گا۔'' [2] ایک محدث نے اس حدیث کے تحت لکھا ہے کہ یہ قرآن کی ایک آیت سے ماخوذ ہے۔

سورۂ آل عمران کی جو آخری آیات ہیں ان میں چار دفعہ ربنا! کا تکرار ہے: ﴿رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا﴾ اس طرح ان میں چار دفعہ ''رب'' کی تکرار ہے۔ اور شاید یہ اسی مقام سے ماخوذ ہو تو دیکھیں استجابت کی کیا کیا صورتیں جمع ہیں۔ یہ سب کچھ ہو گیا، اب نتیجہ کیا ہے؟ وہ دعائیں کر رہا ہے، یارب ! یا رب! کہہ رہا ہے۔ سر خاک آلود، عرفہ کے میدان میں کھڑا ہے، لمبا سفر طے کر کے گیا ہے، سفرِ حج کی طوالت کا تو کوئی اندازا ہی نہیں۔ معارف التنزیل میں ہے، محمد ابن یاسین ایک محدث بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک اور بزرگ تھے، سوچا چلو تعارف ہو جائے، حج کی حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ ہے کہ یہ ملتقیٰ ہے، یہاں ملاقاتیں ہوتی ہیں، تعارف ہوتے ہیں۔ تعارف کے لیے دونوں میں اثنائے طواف بات چیت ہوئی تو پھر پوچھا: یہاں کب پہنچے؟ گھر سے کب نکلے؟ اس قسم کی باتیں ہو رہی تھیں۔ محمد ابن یاسین

[1] سنن أبي داود، حديث: 1488. [2] مسند البزار: 130/18.

نے اپنا بتایا کہ مجھے گھر سے نکلنے میں اور بیت اللہ تک پہنچنے میں پانچ سال لگ گئے ہیں۔ دیکھیے کتنا لمبا سفر ہے۔ بابا جی سے پوچھا: آپ بتائیے۔ فرماتے ہیں کہ گھر سے نکلا تھا داڑھی کالی تھی اب تمھارے سامنے پوری سفید ہو چکی ہے۔ «يُطِيلُ السَّفَرَ» ''لمبا سفر۔'' مسافر کی دعا قبول ہوتی ہے اور یہ سفرِ حج ہے، عرفہ کے میدان میں کھڑا ہے۔ خاک آلود ہیئت ہے، پھٹے پرانے کپڑے ہیں، احرام کی دو چادریں ہیں۔ ہاتھ پھیلائے ہوئے ہے، یارب! یارب! کہہ رہا ہے۔ استجابت کی ساری صورتیں جمع ہیں۔ اب دعا قبول نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن فرشتوں کی طرف سے کیا جواب ملتا ہے یا اللہ کیا فرماتا ہے؟ فرماتا ہے کہ «مَطْعَمُهُ حَرَامٌ» ''اس کا کھانا حرام کا۔'' «مَشْرَبُهُ حَرَامٌ» ''اس کا پینا حرام کا۔'' «وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ» ''اس کا پہننا حرام کا۔'' «وَغُذِيَ بِالْحَرَامِ» ''اور یہ حرام کی خوراک دیا گیا۔'' حرام اس کی غذا تھی۔ «فَأَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ» اس کی دعا کہاں قبول ہو گی؟ بتائیے قبولیتِ دعا میں کون سی رکاوٹ ہے؟ صورتیں ساری جمع ہیں جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ دعائیں قبول کرتا ہے۔ لیکن یہاں قبول نہیں ہو رہیں۔ صرف ایک ہی وجہ نے تمام صورتوں کو ملیا میٹ کر دیا اور وہ کیا ہے؟ رزقِ حرام کہ تیری روزی حرام کی ہے، تیری دعائیں قبول نہیں ہوں گی۔ اس لیے آج دعائیں قبول نہیں ہو رہیں۔ ورنہ بیت اللہ کا اجتماع کوئی چھوٹا اجتماع نہیں ہوتا۔ لاکھوں مسلمان ہیں اور دعائیں کر رہے ہیں کشمیر کی آزادی، فلسطین کی آزادی کے لیے، لیکن دعائیں قبول نہیں ہو رہیں، اس لیے کہ عالمی معیشت ایک عجیب اور خطرناک جھنجٹ کے زیرِ سایہ ہے اور وہ ہے سود کی لعنت۔ سود اعلانِ جنگ ہے اللہ کے ساتھ ﴿فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ سود کھانے والو! تم سود نہیں کھا رہے، اللہ کے ساتھ جنگ کر رہے

ہو۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کیسے انتقام لیتا ہے۔ اس کا حملہ کیسا ہے؟ اس کی پکڑ کیسی ہے؟ ایک وزیر کا بیان آیا تھا کہ سودی معیشت کے بغیر گزارا نہیں ہوسکتا۔ اس سے چھٹکارے کی کوئی صورت ہی نہیں ۔ یہ گڑھی حبیب اللہ، جب مظفر آباد یا کشمیر کی طرف جاتے ہیں تو راستے میں ایک چھوٹا سا شہر آتا ہے، چونکہ یہاں آمد و رفت بہت ہوتی ہے تو وہاں سے گزرے، پوری بستی آباد تھی۔ اگلے روز یا دو تین دن کے بعد وہاں سے گزر ہوا تو پوری بستی صاف ہو چکی تھی۔ سیلاب نے ایسا حملہ کیا۔ جس وزیر نے یہ بیان دیا، انھی علاقوں کا تھا۔ پوری بستی ملیا میٹ ہوگئی۔ اللہ کے ساتھ جنگ کرنے والو! اس میں تمھاری خیر نہیں۔ تمھاری دعائیں اس لیے قبول نہیں ہو رہی ہیں۔ حج کا اجتماع کوئی چھوٹا اجتماع نہیں ہے۔ کچھ لوگ جمع ہو جائیں اور اللہ سے دعا کریں تو اللہ کو شرم آتی ہے کہ ان کے ہاتھ خالی لوٹائے۔ لیکن جہاں لاکھوں کی تعداد ہو، بیک آواز بیک وقت دعائیں مانگنے میں مصروف ہوں، دعائیں قبول نہیں ہو رہیں، اس لیے کہ جو بنا ہے وہ حرام معیشت پر ہے۔ یہ سودی لعنت ہے۔ نہ نیکیاں قبول ہو رہی ہیں، نہ توبہ قبول ہو رہی ہے اور نہ دعائیں قبول ہو رہی ہیں۔ ہمارے سہارے یہی تو ہیں۔ ہمارا سہارا عقیدہ ہے، ہمارا سہارا عمل ہے۔ مجھ جیسے گناہ گار کا سہارا دعا پر ہے۔ لیکن یہ قبول ہی نہیں ہو رہی کیونکہ معیشت کی اساس ہی حرام ہے۔ یہ رزقِ حرام کی تباہ کاریاں ہیں ﴿إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ﴾ [1] ”اللہ تعالیٰ تو متقین کی نیکیاں قبول کرتا ہے۔“ اور تقویٰ کی اساس حلال معیشت پر ہے۔ اور اللہ متقین کے اعمال قبول فرماتا ہے۔ اس لیے بعض سلف کا قول ہے کہ اگر مجھے ایک بار معلوم ہو جائے کہ اللہ نے میرا

[1] المآئدة 5:27.

ایک سجدہ قبول کر لیا ہے تو اس کے بعد موت آ جائے پروا نہیں، خوشی ہوگی کیونکہ اللہ متقین کی عبادت قبول کرتا ہے۔ تو اللہ کا ایک سجدہ قبول کر لینا، یہ سند ہوگی کہ میں متقی ہوں۔ میں پرہیز گار ہوں۔ تو اعمال کی قبولیت میں بہت بڑی تاثیر انسان کی روزی کی ہے۔ یہ جو کچھ بتایا اس میں معاشرے کی اصلاح، معاشرے کی تطہیر، اچھے لوگوں کا پیدا ہونا کہ میں جو دعا کروں، اللہ قبول کرے۔ اللہ مجھے مستجاب الدعوات بنا دے۔ یہ سعد رضی اللہ عنہ کی خواہش ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ معاملہ دعا کا نہیں ہے، ایک نسخہ ہے، ایک فارمولا ہے، تمھیں دیتا ہوں اس کو اپنا لو، تم مستجاب الدعوات بن جاؤ گے۔ فرمایا کہ «أَطِبْ مَطْعَمَكَ تَكُنْ مُسْتَجَابَ الدَّعْوَةِ» [1] روزی حلال کرلو، تمھاری معیشت حلال کی ہو جائے تو تم مستجاب الدعوات بن جاؤ گے۔

اس حدیث کا ایک راوی کہتا ہے کہ میں نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اللہ کے پیغمبر کے اس فرمان کے بعد تمھاری کیا کیفیت رہی؟ تو فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میری کیفیت یہ تھی کہ جو لقمہ اپنے پیٹ میں داخل کرتا، مجھے معلوم ہوتا کہ یہ لقمہ کہاں سے آیا ہے۔ جب تک یہ معلوم نہ ہوتا میں اس لقمے کو کھاتا ہی نہیں تھا چاہے فاقوں مروں۔ فاقے برداشت کر لیتا لیکن جب تک اس لقمے کا مخرج مجھے معلوم نہ ہو جاتا، اس وقت تک میں اسے کھاتا ہی نہیں تھا۔ ایک ایک لقمہ میں نے دیکھ کر حلال ذرائع سے کما کر کھایا، یہ میری حالت رہی، اللہ ہمیں بھی یہ توفیق عطا فرما دے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے میرے بھائیو! اصلاحِ عقیدہ، اصلاحِ عمل، اصلاحِ معاشرہ ان تمام چیزوں کی بنیاد انسان کی معیشت ہے۔ قبولِ اعمال، قبولِ توبہ، قبولِ دعا ان تمام چیزوں

[1] جامع العلوم والحکم: 12/5.

کی بنیاد انسان کی معیشت پر ہے، اس لیے معیشت حلال کی ہونی چاہیے۔ حرام معیشت انسان کو بالکل مفلوج کر دے گی۔ نہ اس کا عقیدہ قائم رہے گا، نہ اس کا عمل قائم رہے گا۔ رزق حرام پیٹ میں ہے تو اللہ اس کی دعائیں قبول نہیں کرے گا، ایسا انسان کامیاب نہیں ہو گا۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنْ سُحْتٍ» [1] جو گوشت حرام کے پیسے سے بنتا اور بڑھتا ہے، وہ گوشت جنت میں داخل ہو ہی نہیں سکتا۔ یعنی جب تک وہ گوشت انسان کے اوپر موجود ہے، جنت میں داخل نہیں ہوسکتا۔ پھر کیا معاملہ ہو گا؟ اس کا عقیدہ اگر ٹھیک ہے تو اللہ تعالیٰ اس گوشت کو جہنم کی بھٹی میں ڈال کر جلائے گا۔ سال بھر جلائے، دو سال جلائے، دس سال جلائے، سو سال جلائے اللہ کی مرضی۔ جب وہ گوشت جل جائے گا تو پھر ممکن ہے وہ اچھے عقیدے کی بنا پر جنت کا مستحق بن جائے۔ فرمایا: «اَللَّحْمُ الَّذِي نَبَتَ مِنْ حَرَامٍ فَالنَّارُ أَوْلٰى بِهِ» ''جو گوشت رزقِ حرام سے بنتا ہے، اس گوشت کی حق دار جہنم کی آگ ہے۔'' [2]

جنت ایسے گوشت کو قبول نہیں کرتی۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے لیے پوری جنت حلال کر دی۔ ایک درخت کو شجرۂ ممنوعہ قرار دے دیا، اس درخت کے قریب نہیں جانا۔ نظائر ہمارے سامنے موجود ہیں، پس ایک درخت کے قریب نہیں جانا، تو آدم و حوا علیہما السلام نے ﴿ذَاقَا الشَّجَرَةَ﴾ اس درخت کے پھل کو کھایا نہیں بلکہ چکھا: ﴿بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ﴾ اسی وقت برہنہ ہو گئے، جنت کے لباس اتار دیے گئے، پشیمان ہوئے، یا اللہ! توبہ کا موقع دے دے۔ فرمایا: دوں گا ضرور مگر جنت میں رہنے کے تم قابل نہیں ہو، اب زمین پر چلے جاؤ، زمین پر جا کے توبہ کرو۔ [3]

[1] المعجم الكبير للطبراني: 217/11، حديث: 11544. [2] شعب الإيمان: 56/5. [3] الأعراف 22:7.

یہ پہلا واقعہ بہت سے دروس کا حامل ہے۔ رزق حرام اور معیشت حرام کا انجام آپ دیکھ لیں کہ ایسے انسان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ کیونکہ اس کے عمل تو قبول ہی نہیں ہوں گے اور جنت کا داخلہ عمل اور جدوجہد چاہتا ہے اور یہاں سارے اعمال رائگاں جا رہے ہیں، نہ نماز مقبول، نہ روزہ مقبول، نہ حج مقبول۔ عمل کی قبولیت کا دار و مدار رزقِ حلال پر ہے۔ فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صٰلِحًا﴾ [1] اے انبیاء کی جماعت! پہلے حلال کھاؤ، پھر اس کے بعد نیک عمل کرو۔

ترتیب وار، اکلِ حلال پہلے اور عمل صالح بعد میں۔ معنی یہ کہ عمل صالح کی بنیاد اکلِ حلال ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ اللّٰهَ أَمَرَ الْمُؤْمِنِينَ بِمَا أَمَرَ بِهِ الْمُرْسَلِينَ» ''اللہ تعالیٰ نے مومنین کو وہی حکم دیا ہے جو انبیاء کو دیا ہے۔'' انبیاء سے کہا: ﴿كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ﴾ ''حلال کھاؤ۔'' [2] اور مومنین سے بھی کہا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ﴾ ''اے ایمان والو! حلال رزق کھاؤ۔'' [3]

حلال روزی کھاؤ۔ ایک ہی خطاب ہے انبیاء کو اور اہل ایمان کو بھی۔ اس کا معنی یہ کہ اس کے بغیر نجات کی کوئی صورت نہیں۔ چاہے وہ عام انسان ہو، اس کی نمازیں اور حج ہو اور چاہے وہ انبیاء کی جماعت ہو جن کی نیکیاں امتیوں کے لیے آئیڈیل ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے لیے بھی لازم قرار دیا ہے کہ تمھاری معیشت حلال کی ہو اور تمھارے عمل کی بنیاد رزقِ حلال پر ہو۔

رزقِ حرام کی صورتیں

رزقِ حرام کی شکلیں تو بہت سی ہیں۔ چند بڑی خطرناک صورتیں ہیں، ان کا بیان

[1] المؤمنون 51:23. [2] المؤمنون 51:23. [3] البقرة 172:2، و صحيح مسلم، حديث: 1015-(65).

ایک الگ وقت چاہتا ہے لیکن کچھ صورتیں ایسی ہیں جن کا ذکر ضروری ہے۔

پہلی صورت قرض

مثال کے طور پر ہمارے ہاں ایک وبا ہے قرض، قرض لے کر ادا نہ کرنا۔ یہ بڑا سنگین معاملہ ہے۔ جو انسان قرض چھوڑ کر مرجائے، اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو معاف نہیں کرتا، چاہے وہ شہیدِ معرکہ کیوں نہ ہو۔ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: اگر میں میدان جہاد میں شہید ہو جاؤں؟ کیا اللہ تعالیٰ میرے گناہوں کو معاف کر دے گا۔ فرمایا کہ ہاں۔اس نے لڑائی کی جو کیفیت بیان کی وہ یوں بیان کی: اگر میں میدان جہاد میں آگے بڑھتا رہوں اور پیچھے نہ ہٹوں، سارے زخم سینے پر کھاؤں، پشت پر نہ کھاؤں اور آگے بڑھتے بڑھتے شہید ہوجاؤں تو میرے گناہ معاف ہوجائیں گے؟ فرمایا کہ ہاں، شہادت کی موت تمام گناہوں کا کفارہ ہے، «يُغْفَرُ لَهُ فِي أَوَّلِ دُفْعَةٍ مِّنْ دَمِهِ» شہید جیسے ہی شہید ہوتا ہے تو شہادت کے پہلے لمحے اللہ تعالیٰ اسے یہ اعزاز دیتا ہے کہ اس کے تمام گناہ معاف کر دیتا ہے۔[1] بڑا خوش ہوا، میدان جہاد میں ٹہلتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا ہے، اللہ کے پیغمبر نے بلایا، فرمایا: «إِلَّا الدَّيْنَ» ''اے سائل! قرضہ معاف نہیں ہوگا۔'' «سَارَّنِي بِهِ جِبْرَائِيلُ أَنِفًا» ''تمھارے جانے کے فوراً بعد جبریل ساتوں آسمانوں سے نیچے آئے اور مجھے آکر کان میں یہ بتایا کہ اس کو بتا دو: قرض معاف نہیں ہوگا۔''[2] یہ ہمارے معاشرے کی بڑی خطرناک صورت ہے۔ قرض میں غفلت اور خلل، یہ ناقابل معافی ہے۔ اللہ کے پیغمبر تشریف فرما تھے۔

[1] سنن ابن ماجه، حديث:2799. [2] مسند أحمد:308/2.

کچھ صحابہ سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ فرمایا کہ «هَاهُنَا أَحَدٌ مِّنْ بَنِي فُلَانٍ» ''یہاں پر فلاں قوم کا کوئی نمائندہ ہے؟'' اور ایک نمائندہ موجود تھا مگر وہ شرم کی بنا پر جواب نہ دے سکا، پتہ نہیں کیا معاملہ ہے۔ آپ نے تین بار پوچھا۔ اس نے کہا: جی ہاں، یا رسول اللہ! اس قوم سے میرا تعلق ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «إِنَّ صَاحِبَكُمْ مَّأْسُورٌ بِدَيْنِهِ» تمھاری قوم کا ایک فرد جس کا انتقال ہوا؟ کب ہوا؟ معلوم نہیں، وہ اللہ کے ہاں کامیاب ہو چکا۔ اللہ نے جنتی ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دیا لیکن مقروض ہونے کی بنا پر جنت کے دروازے پر رکا ہوا ہے۔ جنت میں اس کا داخلہ ممکن نہیں جب تک قرضہ ادا نہ ہو، ویسے اس کے سارے گناہ معاف ہیں۔ کوئی گناہ کیے ہی نہیں ہوں گے۔ اس کی نیکیاں مقبول ہیں، جنتی ہے لیکن مقروض ہونے کی بنا پر جنت کے دروازے پر رکا کھڑا ہے، داخل نہیں ہونے دیا جا رہا۔ اس نے کہا: ''یا رسول اللہ! قرضہ میرے ذمہ ہے، میں اس کا قرض ادا کروں گا، پھر اس نے اس کی طرف سے سارا قرضہ ادا کر دیا۔''[1] نبی ﷺ کی روٹین ہوتی تھی کہ جب کوئی جنازہ آتا تو پوچھتے: «هَلْ عَلَيْهِ دَيْنٌ؟» ''اس پر قرضہ تو نہیں؟'' اگر قرضہ نہ ہوتا، نماز پڑھتے۔ اگر صحابہ کہتے: قرضہ ہے تو پوچھتے: «هَلْ تَرَكَ لَهُ وَفَاءً» ''قرضہ ادا کرنے کے لیے کوئی مال چھوڑا؟'' اگر صحابہ کہتے کہ ہاں، چھوڑا ہے تو پھر آپ نماز پڑھ دیتے۔ اگر صحابہ کہتے کہ کوئی مال نہیں تو پھر فرماتے: «صَلُّوا عَلَى صَاحِبِكُمْ» ''پھر تم خود ہی اس کا جنازہ پڑھ کے دفن کر دو۔ میں اس کی نماز نہیں پڑھتا۔''[2] ابوقتادہ انصاری ﷛ فرماتے ہیں: میرا ایک ساتھی اسی طرح فوت ہو

[1] سنن أبي داود، حديث:3341، و مسند أحمد:50/4. [2] صحيح البخاري، حديث:2298.

گیا۔ اللہ کے پیغمبر نے یہی پوچھا: اس پر قرضہ ہے؟ ہاں جی ہے۔ ''قرضہ ادا کرنے کے لیے مال چھوڑا؟'' نہیں۔ فرمایا: «صَلُّوا عَلٰی أَخِیکُمْ» ''پھر خود ہی اس کی نماز جنازہ پڑھ لو۔'' ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے اس پر ترس آ گیا۔ میرا دوست اور ساتھی ہے اور اللہ کے پیغمبر کے جنازے اور آپ کی دعا سے محروم ہو رہا ہے، میں نے کہا کہ «عَلَيَّ دَيْنُهُ» ''یا رسول اللہ! اس کا قرضہ میرے اوپر ہے، آپ اس کا جنازہ پڑھا دیں۔'' قرضہ تھا کتنا؟ صرف دو دینار۔ نماز آپ ﷺ نے پڑھا دی، اگلے دن ملے، ابوقتادہ! قرضہ ادا ہو گیا؟ کہا: جی مصروفیت تھی ادا نہیں کر سکا۔ آپ خاموش ہو گئے۔ پھر اگلے دن ملے، ابوقتادہ قرضہ ادا ہو گیا؟ جی ہاں! ادا ہو گیا۔ فرمایا کہ «اَلْآنَ بَرَدَتْ عَلَيْهِ جِلْدُهُ» آج تمھارے ساتھی کی قبر ٹھنڈی ہوئی ہے۔ [1] قرض کا معاملہ بڑا سنگین ہے۔

دوسری صورت

دوسری چیز جو بڑی سنگین ہے، وہ حقوق العباد میں کوتاہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «مَنْ كَانَتْ مَظْلَمَةٌ لِّأَخِيهِ مِنْ عِرْضِهِ أَوْ شَيْءٍ فَلْيَتَحَلَّلْهُ مِنْهُ الْيَوْمَ قَبْلَ أَنْ لَّا يَكُونَ دِينَارٌ وَّلَا دِرْهَمٌ» [2] اگر تم میں سے کسی نے اپنے کسی بھائی پر کچھ زیادتی کی ہو اس کی عزت کے بارے میں، اس کی عزت کو روندا ہو اس کی غیبت کر کے، بہتان لگا کے یا اس کی چغلی کر کے یا اس کو گالی دے کر کسی طریقے سے اس کی عزت کے درپے ہوا ہے یا اس کا مال حاصل کر کے، قرض لے کر واپس نہیں دیا، کسی اور طریقے سے دھوکا دے کر لے لیا تو فرمایا کہ «فَلْيَتَحَلَّلْهُ مِنْهُ الْيَوْمَ»

[1] مسند أحمد: 260/3. [2] صحیح البخاری، حدیث: 2449، و مسند احمد: 506/2.

اس کے پاس آج ہی جاؤ اور اپنے دامن کو بری کرا لو۔ اپنے آپ کو پاک صاف کرا لو، «قَبْلَ أَنْ لَّا يَكُونَ دِينَارٌ وَّلَا دِرْهَمٌ» قبل اس کے کہ وہ دن آ جائے جس دن دامن کو بری کرانے کے لیے تمھارے پاس نہ درہم ہوگا نہ دینار ہوگا۔ بالکل تہی دست، خالی ہاتھ جاؤ گے، اس وقت کوئی صورت نہیں ہوگی۔ اسی معنی کی ایک حدیث ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «مَنْ شَدَّ غَضَبًا لِّأَخِيهِ فِي خُصُومَةٍ لَّا يَعْلَمُهَا وَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ» جس شخص نے اپنے کسی بھائی کو ناراض کر لیا، کسی ایسے مسئلے کے بارے میں جس کو وہ جانتا ہی نہیں، بس لوگوں سے سنا اور آگے ہانک دیا۔ یہ ہمارے معاشرے میں بڑا بھیانک مرض ہے، سنی سنائی بات، فلاں نے یہ کہا، اس کی تشہیر کر رہا ہے۔ اپنے بھائی کو ناراض کر رہا ہے۔ اور بڑا خوش ہے کہ فلاں کی عزت خوب ہاتھ میں آئی ہوئی ہے۔ خوب روند رہا ہے۔ فلاں کو خوب ذلیل کر رہا ہے اور اسے معلوم نہیں کہ اس پر وبال کیا نازل ہو رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: اس پر اللہ کی، تمام لوگوں کی اور فرشتوں کی لعنتیں برستی رہتی ہیں۔ [1] وہ نمازیں پڑھ رہا ہے، حج کر رہا ہے، نیکیوں پر نیکیاں کر رہا ہے اور ادھر دن رات اللہ کی پھٹکاریں برس رہی ہیں۔ ان تصرفات کو چیک کرو، اپنی زبان کو اور اپنے حقوق العباد کے معاملات کو چیک کرو بالخصوص جو مالی امور ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «مَنْ تَعُدُّونَ الْمُفْلِسَ فِيكُمْ» مفلس کی تعریف کرو۔ صحابہ نے کہا: «مَنْ لَّا دِرْهَمَ لَهُ وَلَا دِينَارًا» جس کے پاس درہم و دینار نہ ہو، وہ مفلس ہے۔ فرمایا کہ نہیں۔ شریعت میں مفلس کا معنی کچھ اور ہے۔ شریعت میں مفلس وہ ہے «مَنْ يَّأْتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِحَسَنَاتٍ»

[1] مجمع الزوائد: 375/9.

جو قیامت کے دن نیکیوں کے ڈھیر لے کر آئے گا، لیکن اس طرح آئے گا کہ اس کے دامن کے ساتھ کچھ لوگ چمٹے ہوئے ہوں گے اور دہائی دیتے آرہے ہوں گے۔ کوئی کہتا ہے: «يَا رَبِّ! قَدْ ضَرَبَنِي» یا اللہ! اس نے مجھے ناحق مارا تھا۔ اس سے پوچھ کیوں مارا تھا؟ اور کوئی کہہ رہا ہے: یا اللہ! «أَخَذَ مَالِي» اس نے میرا مال ہتھیا لیا تھا۔ اس سے پوچھ میرا مال کیوں دبالیا تھا؟

کوئی کہتا ہے: یا اللہ! «شَتَمَنِي» اس نے مجھے گالی دی تھی۔ کوئی کہتا ہے: یا اللہ! اس نے مجھ پر بہتان لگایا ہے۔ اس نے میری غیبت کی، یہ سارے لوگ ساتھ ہیں۔ نیکیاں بھی ساتھ ہیں اور یہ لوگ بھی ساتھ چمٹے ہوئے ہیں۔ اور یہ دن انصاف کا دن ہے۔ وہ اللہ کی عدالت ہے کوئی دنیا کی عدالت نہیں۔ دنیا میں تو وکیل کا طبقہ جھوٹ سچ بول بول کے حق کو چھپا لیتا ہے۔ قیامت کے دن یہ سارے کیس اللہ کے سامنے پیش ہوں گے۔ پھر اے وکیلو! قیامت کے دن اللہ کے دربار میں کس طرح وکالت کرو گے۔ یہ انصاف کی عدالت ہے۔ ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ اب وہ سب کھڑے ہیں، نیکیاں موجود ہیں اور یہ حاجی صاحب بھی کھڑے ہیں۔ اللہ فرمائے گا: یہ انصاف کا دن ہے اور میں نے سب کو راضی کرنا ہے، لہٰذا ان میں اس کی نیکیاں تقسیم کرو۔ نمازیں ایک کو دے دو، روزے دوسرے کو دے دو، باقی نیکیاں تیسرے چوتھے کو تقسیم ہو رہی ہیں اور چونکہ اللہ نے ان کو راضی کرنا ہے، انصاف کا دن ہے، اللہ پوچھے گا: راضی ہوگئے، وہ کہیں گے: نہیں یا اللہ! ابھی اس تکلیف کی چبھن باقی ہے۔ اللہ فرمائے گا: ٹھیک ہے، پھر ان سب کے گناہ لے لو، حاجی صاحب کے سر پر ڈال دو۔ اب ایک ایک کے گناہ اس کے سر پر ڈالے جارہے ہیں، نتیجہ یہ کہ جو نیکیوں کا ڈھیر

لے کر آیا تھا برباد کر کے جہنم میں چلا گیا اور جو نیکیوں سے خالی ہاتھ تھے، نیکیوں سے دامن بھر کے جنت میں داخل ہو رہے ہیں۔[1] ہمارے ایک ساتھی ہیں۔ ان کی ایک بات بڑی پسند آئی۔ کوئی ان سے قرضہ مانگے یا ادھار مال لے تو وہ کہتے ہیں: دیکھو بھئی! اگر یہ واپس کرو گے تو تمھارا فائدہ ہے، واپس نہیں کرو گے تو میرا فائدہ ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اگر میں یہ صدقہ دوں یا زکاۃ دوں، مجھے معلوم نہیں اللہ قبول کرے گا یا نہیں کرے گا لیکن اگر تم لے کر دبا کر بیٹھ جاؤ گے تو وہ تو یقیناً اللہ کے دربار میں لکھ دیا گیا۔ وہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ضرور مجھے تم سے لے کر دے گا۔ یہ بڑی مہلک صورت ہے، اللہ کے پیغمبر نے فرمایا کہ یہ مفلس ہے۔ حرام معیشت کے حوالے سے یہ کچھ معاشرتی گناہ ہیں۔

حرام کی اقسام

حرام کی دو قسمیں ہیں: ایک تو انفرادی حرام، انفرادی کوتاہی، کسی سے آپ نے معاملہ کیا اور دھوکا دے دیا یا آپ کی معیشت سودی ہے، حرام کی ہے، یہ آپ کا انفرادی عمل ہے، انفرادی مال ہے۔ اب تک جو کچھ میں نے بیان کیا، وہ انفرادی خیانتیں تھیں۔ انفرادی کوتاہیاں تھیں۔ حرام کی دوسری شکل ہے اجتماعی مال میں خیانت۔ اجتماعی مال کیا ہوتا ہے؟ جیسے مدارس کا مال، جہاد کا مال، یعنی وہ مال جو ایک مقام پر جمع کیا جائے۔ زکاتیں ہیں، صدقات ہیں، عطیات ہیں۔

اجتماعی مال میں خیانت کا وبال

انفرادی خیانتوں کا وبال آپ نے سن لیا لیکن میرے دوستو اور بھائیو! جو اجتماعی مال

[1] صحیح مسلم، حدیث:2581، و عون المعبود: 21/9.

میں کوتاہی اور خیانت کے مرتکب ہوں گے، اس کا وبال انفرادی خیانت سے بڑا ہے۔ اجتماعی مال سے اگر کوتاہی کی گئی یا اجتماعی مال کو دبا لیا گیا تو اس کا وبال انفرادی حرام سے بڑا ہے۔

دیکھیں رسول اللہ ﷺ کے دور میں ایک صحابی تھا۔ اس سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث سن لیجیے، فرمایا: «أَدُّوا الْخَيْطَ وَالْمِخْيَطَ وَإِيَّاكُمْ وَالْغُلُولَ فَإِنَّهُ عَارٌ عَلَى أَهْلِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» فرمایا کہ اجتماعی مال کی سوئی اور دھاگہ بھی ادا کر دو، سوئی اور دھاگے کے بھی تم لوگ امین ہو۔ اگر اجتماعی مال سے تم نے وہ لیا ہے تو اس کو واپس لوٹا دو، سوئی اور دھاگے کی امانت کا بھی قیامت کے دن سوال ہو گا۔ اس سے اجتماعی مال کی اہمیت اور قدر و قیمت کا آپ اندازہ کیجیے، اور فرمایا کہ «وَإِيَّاكُمْ وَالْغُلُولَ» غلول سے بچو۔ غلول بھی اجتماعی مال میں خیانت ہے۔ جہادی مال کو چرا لینا یا رکھ لینا، یہ غلول ہے۔ اس سے بچو «فَإِنَّهُ عَارٌ عَلَى أَهْلِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» قیامت کے دن جو سب سے بڑی عار ہوگی، وہ کفر اور شرک کی نہیں ہوگی بلکہ جہادی مال میں سے خیانت کی ہوگی۔[1] سب سے بڑی تہمت اور عار، بڑا نمایاں کر کے اس بات کو اچھالا جائے گا کہ یہ شخص جو آرہا ہے، یہ جہادی مال کا چور آرہا ہے۔ دنیا دیکھے گی یہ اجتماعی خیانت کا مرتکب آرہا ہے۔ ایسے انسان کی نیکیاں مردود، پہاڑ جیسے عمل رائگاں۔ اللہ کے پیغمبر کا ایک خادم، بلکہ خادم خاص کیونکہ وہ جہادی خادم تھا۔ نبی ﷺ کی سواری کی خدمت کرتا ہے اور رسول اکرم ﷺ اس جہاد میں خود موجود ہیں۔ ایک انجانا تیر آتا ہے اور اس کے بدن میں پیوست ہو جاتا ہے۔ اسی تیر سے اس کی موت

[1] مسند أحمد: 318/5.

واقع ہو جاتی ہے۔ صحابہ نے کہا: «هَنِيئًا لَهُ الشَّهَادَةُ، هَنِيئًا لَهُ الشَّهَادَةُ» مبارک، مبارک شہید ہو گیا، شہادت مبارک۔ اللہ کے پیغمبر نے فرمایا کہ نہیں۔ «إِنَّ الشَّمْلَةَ الَّتِي أَصَابَهَا يَوْمَ خَيْبَرَ مِنَ الْمَغَانِمِ لَمْ تُصِبْهَا الْمَقَاسِمُ لَتَشْتَعِلُ عَلَيْهِ نَارًا»[1] خیبر کے مال غنیمت سے ایک چادر جو اس نے چوری کر لی تھی۔ اور اس کی دلیل یہ تھی کہ میں خود مجاہد ہوں، اس جنگ میں شریک تھا، میرا بھی اس میں حصہ ہے۔ پتہ نہیں تقسیم کے وقت یہ چادر مجھے ملے یا نہ ملے، ابھی سے رکھ لیتا ہوں، بعد میں بتا دوں گا۔ کوئی تاویل کر لوں گا۔ لیکن بتانے کا موقع نہیں ملا، اب بتانے کا فائدہ بھی کیا ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس چادر کو جہنم کی آگ نے پکڑ لیا ہے اور وہ چادر اس کے بدن کے اردگرد لپٹی ہوئی ہے۔ وہ چادر جہنم کا شعلہ بن کر اس کے عذاب کا سبب بن چکی ہے۔ اجتماعی مال میں خیانت کا یہ نتیجہ ہے۔ یہ کون ہے؟ صحابی۔ یہ کون ہے؟ اللہ کے پیغمبر کا خادم۔ یہ کون ہے؟ مجاہد۔ یہ اعمال کوئی چھوٹے نہیں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «لَنْ تَمَسَّ النَّارُ مُسْلِمًا»[2] جس نے ایمان کی حالت میں میرا دیدار کر لیا، اس کو جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی۔ لیکن دیکھیں جہنم کا لقمہ بن گیا۔ اللہ نے جہاد جیسے عمل کو ضائع کر دیا، برباد کر دیا۔ میدانِ معرکہ میں اپنی جان پیش کرتا ہے، شہید ہے۔ اس کا اعزاز یہ ہے کہ «يُشَفَّعُ فِي سَبْعِينَ إِنْسَانًا مِّنْ أَقَارِبِهِ»[3] اس کے اقارب میں سے ستر افراد اس کی شفاعت سے بخشے جائیں گے۔ ستر افراد کی سفارش کرے گا اور اللہ قبول کر کے ان سب کو معاف فرما دے گا۔ ستر افراد کو بخشوانے والا خود جہنم کا لقمہ

[1] صحيح البخاري، حديث: 4234. [2] السنة لابن أبي عاصم: 494/1. [3] سنن ابن ماجه، حديث: 2799.

بن گیا۔ کس بنا پر؟ ایک چادر چوری کرنے کی بنا پر۔ یہ اجتماعی مال ہے۔ اللہ کے پیغمبر جب یہ بیان فرما چکے، ایک صحابی روتا ہوا اٹھا، اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کہا: یہ دو تسمے مجھے اسی جگہ سے ملے تھے اور میں نے جمع کروانے کی بجائے اپنی جیب میں رکھے۔ «فَاقْبَلْهُمَا» قبول کر لیجیے۔ مجھ سے غلطی ہو گئی، بھول ہو گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «لَنْ أَقْبَلَهُمَا مِنْكَ» [1] اب قبول نہیں کروں گا، قیامت کے دن لے کر آنا اب وہیں باتیں ہوں گی۔ قیامت کے دن کون کیا دے سکے گا؟ خالی ہاتھ آؤ گے۔ جس طرح تمھاری ماؤں نے تمھیں جنا ہے اسی طرح آؤ گے۔ لباس تک نہیں ہو گا، برہنہ آؤ گے۔ ایک خیانت انفرادی ہوتی ہے اور ایک اجتماعی ہوتی ہے۔ اجتماعی خیانت کا ارتکاب بڑا خطرناک ہے۔

اس لیے فرمایا کہ ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا﴾ [2] اللہ کا حکم ہے کہ امانتیں ان تک پہنچاؤ جو ان کا اصل مقام ہے۔ وہاں تک پہنچاؤ، اپنی مرضی کا تصرف نہ کرو۔ تو اجتماعی مال میں سے خیانت کرنا، یہ معیشتِ حرام کی بھیانک ترین شکل ہے۔ میرے بھائیو! سوال، جہاں سے یہ بات چلی تھی کہ آخر رزقِ حلال ہی کیوں؟ میرا خیال ہے کہ بہت سے پہلو ہمارے سامنے آ گئے۔ یہ رزقِ حرام اجتماعی، معاشرتی، اخلاقی، اعتقادی اور عملی تمام بیماریوں کا منبع ہے۔ ہر مرض یہاں سے پھوٹ رہا ہے۔ توبہ قبول نہیں ہو رہی، نیکیاں قبول نہیں ہو رہیں، دعائیں قبول نہیں ہو رہیں، رزق حرام کی بنا پر۔ معاشرہ غلط، دشمنوں کا غلبہ، سب کی اساس جو ہے رزق حرام ہے۔

مال حلال پر اکتفا

اس لیے آئیے! تقویٰ، پرہیز گاری اور ورع پیدا کریں، زہد اور قلیل پر اکتفا کے ہم خوگر

[1] صحيح البخاري، حديث: 4234، معناً. [2] النسآء 4:58.

بن جائیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «طُوبَىٰ لِمَنْ أَسْلَمَ رُزِقَ كَفَافًا وَقَنَّعَهُ اللَّهُ بِالْقَلِيلِ» خوشخبری ہو اس بندے کے لیے جس کو اللہ اسلام کی ہدایت دے دے، رزق کفاف دے دے اور کم رزق پر اس کو قانع کر دے۔ خوشخبری ہو جنت کی، طوبیٰ جنت کی ایک قسم، جنت کا ایک درخت، سارے معنی موجود ہیں، خوشخبری ہو جس میں تین خوبیاں پیدا ہو جائیں، جس کو اللہ تعالیٰ اسلام کی ہدایت دے دے اور اس کا رزق کفاف ہو، جتنی معیشت ہو اس سے اس کا گزارا ہو جائے۔ اتنی زیادہ نہ ہو کہ قیامت کے دن سوال وجواب کی الجھن میں پھنس جائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مال کے حوالے سے قیامت کے دن دو سوال ہوں گے: «مِنْ أَيْنَ كَسَبْتَهُ وَفِيمَا أَنْفَقْتَهُ» بندے یہ مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ [1] اور جس کا مال کفاف ہو گا، فرمایا کہ بڑا مبارک انسان ہے، خوشخبری ہو اس کے لیے: «وَقَنَّعَهُ اللَّهُ بِالْقَلِيلِ» اللہ تعالیٰ اس کو تھوڑے مال پر قناعت دے دے۔ تھوڑے مال پر صبر وشکر عطا فرما دے۔ فرمایا کہ وہ بشارتوں کا مستحق ہے۔ [2]

کثرتِ مال کے لیے بھیک مانگنا

اس حدیث کو سامنے رکھیے اور کثرتِ مال سے بچنے کی کوشش کریں۔ یہ تکثّر بڑا گھاٹے کا سودا ہے۔ ﴿أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝﴾ [3] یہ کثرت مال اور کثرت اولاد کی دوڑ نے، اس کی طلب نے تمھیں ایسا برباد کیا کہ تم اس دوڑ میں لگے رہے حتی کہ قبر تک پہنچ گئے، تمھیں ہوش ہی نہیں آیا۔ اللہ کے پیغمبر کی حدیث ہے: «مَنْ سَأَلَ النَّاسَ أَمْوَالَهُمْ تَكَثُّرًا» جو لوگوں سے مانگتا پھرے، یہ بات بھی بتاتی

[1] مسند أبي يعلىٰ: 110/5. [2] صحيح مسلم، حديث: 1054، و السلسلة الصحيحة: 128/1.
[3] التكاثر 102: 1، 2.

تھی ، یہ بھی اس معاشرے کا تاریک ترین مرض ہے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا اور بالخصوص میرے وہ بھائی جو اپنے آپ کو علماء کی صف میں شمار کرتے ہیں، یا جن کا علماء کی صف میں شمار کیا جاتا ہے، اس تفضّل سے بچو۔ دنیا داروں کے پاس جانا، چکر لگانا، ان کے طواف کرنا، علماء کا مقام نہیں ہے، اس تکثّر سے بچو۔ بازار، دکانیں یہ دنیا کی بدترین جگہیں ہیں۔ وہاں جاؤ گے غیبتیں سننی پڑیں گی۔ وہاں جاؤ گے کسی کی ریکارڈنگ بج رہی ہے، کانوں میں گانوں کی آوازیں آرہی ہیں۔ نہ کان محفوظ، نہ آنکھیں محفوظ اور پھر کس لیے جارہے ہو، سوال کرنے کے لیے۔ اہل علم کا مقام ہے یہ؟ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: جو تکثّر کی خاطر سوال کرے کہ میرا مال بڑھے، کبھی اس سے مانگتا، کبھی اس سے مانگتا، فرمایا کہ قیامت کے دن آئے گا، اس کے چہرے پر گوشت نہیں ہو گا۔[1] ہڈیوں کا پنجر لے کر آئے گا۔ اس کے چہرے پر گوشت نہیں ہوگا، اور اس کے مقابلے میں اللہ کے پیغمبر نے فرمایا: «مَنْ يَّضْمَنْ لِّي وَاحِدَةً أَضْمَنْ لَّهُ الْجَنَّةَ» کون ہے وہ شخص جو مجھے ایک چیز کی ضمانت دے دے، آج میرے ساتھ ایک وعدہ کرلے تو میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ ثوبان رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! میں تیار ہوں۔ تو اللہ کے پیغمبر نے کیا فرمایا؟ فرمایا کہ «لَا تَسْأَلِ النَّاسَ شَيْئًا» کبھی لوگوں سے نہ مانگنا، اس چیز پر تم قائم رہو، میں محمد تمھیں جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ وعدہ کرتا ہوں، ضمانت دیتا ہوں کہ تم جنت میں ضرور جاؤ گے۔[2] یہ بھی اس معاشرے کا ایک مرض ہے، سوال کرنا، ہاتھ پھیلانا۔ اللہ کے پیغمبر ﷺ نے فرمایا: «اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلٰى» اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔ فرمایا کہ «اَلْيَدُ الْعُلْيَا

[1] صحيح البخاري، حديث:1474، و صحيح مسلم، حديث:1041. [2] مسند أحمد:279/5.

الْمُنْفِقَةُ» اوپر کا ہاتھ خرچ کرنے والا ہے۔ «وَالسُّفْلٰى السَّائِلَةُ» نیچے کا ہاتھ سوال کرنے والا ہے۔[1] اوپر کا ہاتھ بہتر ہے۔ مقتنع (قناعت پسند) ہوجائے تھوڑے مال پر اور فقر وفاقہ بھی اگر آئے تو اسے فقر وفاقہ میں لذت محسوس ہو۔ یہ سب اللہ کی رحمت ہے۔ یہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔ یہ سوچ کر خوش ہو کہ میں حرام سے بچا ہوں۔ حرام کے راستے میرے سامنے موجود ہیں، سوال بھی کرسکتا ہوں، مانگ بھی سکتا ہوں لیکن نہیں، شریعت کی حدود پر قائم ہے، اس کا دل مطمئن ہو، اسے خوشی ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کی معیشت

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو اختیار دیا کہ دو میں سے ایک چیز بن جاؤ۔ یا تو نبی ملک یا نبی فقر، بادشاہ نبی یا فقیر نبی۔ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: «فَاخْتَرْتُ أَنْ أَكُونَ عَبْدًا رَّسُولًا» میں نے پسند کیا کہ بادشاہ نہ بنوں بلکہ فقیر بنوں۔[2] اللہ کے پیغمبر کی زندگی آپ کے سامنے ہے، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی معیشت آپ کے سامنے ہے۔ جنتیں کس طرح وہاں تقسیم ہورہی ہیں؟ «أَبُوبَكْرٍ فِي الْجَنَّةِ، عُمَرُ فِي الْجَنَّةِ، عُثْمَانُ فِي الْجَنَّةِ، عَلِيٌّ فِي الْجَنَّةِ» بہشتیں تقسیم ہورہی ہیں۔ غور تو کریں وہ کیسا معاشرہ تھا۔ اللہ کے پیغمبر ﷺ فوت ہوئے «وَدِرْعُهُ مَرْهُونَةٌ عِنْدَ يَهُودِيٍّ»[3] آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس گروی پڑی ہوئی تھی۔ یہ آپ کی معیشت ہے، آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس تیس صاع اناج کے بدلے گروی پڑی ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بعد میں وہ اناج واپس کرکے اللہ کے پیغمبر کی زرہ کو چھڑوایا۔ یہ آپ کی معیشت ہے۔

[1] صحيح البخاري، حديث:1429، و صحيح مسلم، حديث:1033. [2] مجمع الزوائد:307/9، و مجموع الفتاوى لابن تيميه:22/35. [3] صحيح البخاري، حديث:2916.

تین تین چاند گزر جاتے آپ کے گھر چولھا نہیں جلتا تھا۔ ازواج مطہرات بعض اوقات رات کو چراغ جلانے کے لیے پڑوسیوں سے تیل ادھار لے کر آتیں۔ اللہ کے پیغمبر ﷺ نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو بھیجا، جاؤ! فلاں یہودی کے پاس جاؤ، اس کا کپڑوں کا کاروبار ہے۔ ازواج محمد کے پاس کپڑے نہیں ہیں، میری بیویوں کے پاس، امہات المومنین کے پاس کپڑے نہیں ہیں، اسے جا کر کہہ دو کہ محمد (ﷺ) کچھ کپڑے مانگتا ہے: «إِلَى مَيْسَرَةٍ» جب آسانی ہوگی تمھیں ادا کر دوں گا۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ کچھ دیر کے بعد روتے ہوئے آئے، اللہ کے پیغمبر نے پوچھا: کیا بات ہے؟ کہا کہ یہودی نے جو جواب دیا ہے اس نے رلا دیا۔ یہودی نے کہا: محمد سے جا کر کہہ دو: یہ میرے کپڑے کب دو گے؟ تمھاری کون سی فیکٹریاں چل رہی ہیں۔ اللہ کے پیغمبر نے فرمایا: «كَذَبَ» اس نے جھوٹ بولا۔ «لَقَدْ عَرَفُوا أَنِّي أَتْقَاهُمْ لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ أَوْ قَالَ أَصْدَقُهُمْ حَدِيثاً وَّ آدَاهُمْ لِلْأَمَانَةِ» ورنہ پوری دنیا جانتی ہے اور وہ یہودی بھی جانتا ہے کہ میں سب سے بڑھ کر اللہ سے ڈرنے والا، یا فرمایا ان سب سے بڑھ کر سچی بات کہنے والا اور سب سے بڑھ کر امانت کو ادا کرنے والا ہوں۔[1] یہ آپ کی معیشت ہے۔ رات کا وقت ہے، گھر سے باہر نکلے، ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سامنے آتے ہوئے نظر آئے۔ فرمایا کہ «مَا أَخْرَجَكُمَا» گھر سے کیوں باہر آئے، کیا بات ہے؟ کہا کہ «اَلْجُوعُ» یا رسول اللہ! ہمیں بھوک نے گھر سے باہر نکال دیا، کھانا گھر میں موجود نہیں، کروٹیں بدل رہے تھے اور ٹائم پاس کرنے کے لیے گھر سے باہر آ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «لَأَخْرَجَنِي الَّذِي أَخْرَجَكُمَا» جس چیز نے تمھیں گھر سے نکالا اسی نے مجھے بھی نکالا۔ میں بھی بھوکا ہوں۔ اللہ اکبر! کائنات کے سردار، یہ آپ کی معیشت۔ رزقِ حلال

[1] مسند أحمد: 147/6.

پر قناعت کی مثالیں سنیے آپ! ورنہ کیا کچھ نہیں آ سکتا، یہ آپ کی معیشت ہے۔ فرمایا کہ چلو کہیں چلتے ہیں۔ ایک گھر جا کر دستک دی۔ وہ ایک انصاری کا گھر تھا۔ پوچھا: فلاں کہاں ہے؟ بیوی نے کہا: وہ گئے ہیں، آپ بیٹھیں، ابھی وہ آ جائیں گے۔ انصاری بھی پہنچ گیا اور کہا: آج جیسا بہترین دن میری زندگی میں کبھی نہیں آیا اور آج جیسے پاکیزہ مہمان میرے گھر میں کبھی داخل نہیں ہوئے۔ اللہ کے پیغمبر کے سامنے کھجوریں لے آئے، پانی پیش کیا اور چھری ہاتھ میں پکڑ لی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر جانور ذبح کرنا ہے تو «إِيَّاكَ وَالْحَلُوبَ» دودھ والا جانور ذبح نہ کرنا۔ جانور ایسا ذبح کرنا جو دودھ نہ دیتا ہو، چنانچہ گوشت پیش کیا، اللہ کے پیغمبر نے کھایا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے اور فرمایا: «هٰذَا وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ مِنَ النَّعِيمِ الَّتِي تُسْأَلُونَ عَنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» قیامت کے دن ان نعمتوں کے بارے میں سوال ہوگا۔[1] یہ آپ کی معیشت ہے۔

ایک مہمان آیا، مسجد میں ساتھ لے آئے اور کہا کہ اسے کون لے کر جائے گا؟ اس مہمان کو ایک صحابی لے گیا، اب اس صحابی کا واقعہ سنیں! اپنے گھر لے تو گیا، گھر میں بیوی سے پوچھا: کچھ ہے ان کے لیے؟ کہا: کچھ نہیں، «مَا عِنْدَنَا إِلَّا قُوتُ صِبْيَانِي» بچوں کے لیے تھوڑا سا کھانا پڑا ہوا ہے۔ رات ہے کروٹیں بدلیں گے اور بھوک کے مارے سو ہی جائیں گے، صبح کو کھانا کام آ جائے گا۔ رات تو سوتے سوتے گزر ہی جائے گی، صبح کھلانے کے لیے رکھا ہوا ہے۔ فرمایا کہ کھانا تیار کرو۔ کھانا اتنا کم کہ مہمان کے لیے بھی کافی نہیں۔ اب آدابِ مہمانی میں یہ بات داخل ہے کہ میزبان بھی ساتھ بیٹھے اور کھائے۔ بچے بھوک سے رو رو کر سو گئے اور مہمان کے سامنے کھانا رکھ کر

[1] صحیح مسلم، حدیث: 2038، و جامع الترمذی، حدیث: 2369.

خود بھی ساتھ بیٹھ گئے۔ اب مسئلہ یہ کہ خود کھائیں تو مہمان بھوکا رہ جائے گا۔ چراغ ٹھیک کرنے کے بہانے بجھا دیا۔ کمرے میں تاریکی ہوئی، اب منہ چلا رہے ہیں، ہاتھ چلا رہے ہیں اور یہ باور کرا رہے ہیں کہ ہم بھی کھانا کھا رہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود نہیں کھا رہے۔ مہمان نے کھانا کھایا۔ میاں بیوی خوش ہو گئے۔ فجر کی اذان ہوئی، حدیث بخاری کے الفاظ ہیں کہ «فَبَاتَا طَاوِيَيْنِ» دونوں میاں بیوی نے کروٹیں بدلتے بدلتے رات گزار دی حتی کہ فجر کی اذان ہوگئی۔ نماز کے لیے مسجد میں گئے۔ مسجد کے دروازے پر اللہ کے پیغمبر کو کھڑا پایا۔ اللہ کے پیغمبر مسکرا رہے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ رات جو تم نے عمل کیا مجھے اللہ نے بتا دیا۔ اور جب تک تم میاں بیوی خالی ہاتھ چلا رہے تھے اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر مسکرا رہا تھا۔ تمھارے بارے میں قرآن آ چکا ہے، اللہ کی وحی آ چکی: ﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ [1] اس دور کی یہ مثالیں، ہر دور میں ایسے بندے موجود ہیں جو رزقِ حلال پر اکتفا کرنے والے تھے۔ پھر کیسا معاشرہ بنا؟ کیسے عقیدے بنے؟ کیسے منہج بنے؟ کیسے عمل بنے؟ ان کے عمل مثالی بن گئے۔

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا واقعہ

آخر آپ کو میں عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا چھوٹا سا ایک واقعہ سنا کر بات ختم کروں۔ یہ خلیفہ ہیں۔ ان کو عمر ثانی کہا جاتا ہے۔ ان کا ایک قول ہے۔ اگر میں صرف فرض نماز پڑھوں اور نفل نہ پڑھوں، رمضان کے روزے رکھوں اور کوئی نفلی روزہ نہ رکھوں، فرض حج کر لوں اور کوئی نفلی حج نہ کروں، زکاۃ دوں اور صدقے کا ایک پیسہ نہ دوں لیکن میری

[1] الحشر 59:9، و صحیح البخاری، حدیث:3798.

روزی حلال کی ہو، جہنم کا مجھے کوئی خوف نہیں۔ میں ضرور جنت میں جاؤں گا۔ یہ ان کا قول ہے۔ ایک دفعہ اپنے گھر میں آئے جبکہ خلیفۃ المسلمین تھے۔ اپنی بیٹیوں سے کوئی بات کرنا چاہی، دیکھا کہ بیٹیاں بات تو کر رہی ہیں لیکن منہ دوپٹے سے اچھی طرح ڈھانپا ہوا ہے۔ پریشان ہوئے کہ میری بیٹیاں اس طرح مجھ سے منہ کیوں چھپا رہی ہیں تو خادمہ رازدان ہوتی ہے۔ خادمہ کو بلایا اور کہا کہ یہ پہلی بار دیکھ رہا ہوں، میری بیٹیوں نے منہ ڈھانپ کر مجھ سے بات کی، کیوں؟ کہا کہ آپ کی بیٹیوں کو آج کھانا نہیں ملا۔ انھوں نے کھانے کی جگہ کچا پیاز کھایا ہے۔ تو آپ کو پیاز کی بُو آ سکتی تھی اور آپ سمجھ سکتے تھے کہ میری بیٹیوں نے آج کچا پیاز کھا کر گزارا کیا۔ تو ان کی کیفیت آپ پر منکشف ہو جاتی۔ آپ کو بھی افسوس ہوتا۔ اپنے باپ کو اس کا احساس نہیں ہونے دیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے، واپس اپنی بیٹیوں کے پاس گئے اور کہا کہ تمھارا بابا اگر چاہے تو دنیا کی لذیذ ترین نعمتیں تمھارے دسترخوان پر چن دے۔ دنیا کے حاکمو! غور کرو! عوام الناس کے پیسوں پر پلنے والے حرام خورو! غور کرو! خلیفہ اور حکام کیسے ہوتے ہیں۔ تمھارا باپ اگر چاہے تو دنیا کے قیمتی کھانے، قیمتی نعمتیں دسترخوان پر چن دے لیکن میری بیٹیو! اس کے بدلے تمھارے باپ کو اللہ تعالیٰ جہنم میں ڈال دے گا۔ اس لیے اس کفاف پر اکتفا کرو، کفاف پر قناعت کرو اور بلند درجات کا انتظار کرو جو اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن مومنوں کے لیے تیار کیے ہوئے ہیں، اللہ مجھے اور آپ کو توفیق عطا فرمائے۔

وَأَقُولُ قَوْلِي هٰذَا وَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِي وَلَكُمْ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.